الرسالہ

Al-Risala

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

چھوٹی چیز کو بڑا سمجھنا، بڑی چیز کو چھوٹا سمجھ لینا۔
یہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ فرد کی زندگی میں بھی
اور وسیع تر قومی زندگی میں بھی

[illegible] ۱۹۹۳، شمارہ ۲۰۶

Rs. 6

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

جنوری ۱۹۹۴، شمارہ ۲۰۶

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi - 110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

صبر کے ساتھ اللہ نے جہاد کا بھی حکم فرمایا ہے۔ دیکھو
وحید الدین صاحب جہاد کے بارے میں نہیں لکھتے۔

صبر کب تک

ایک تعلیم یافتہ مسلمان نے کہا کہ آپ الرسالہ میں اکثر صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ آخر یہ صبر کب تک۔ میں نے کہا کہ آپ کے سوال کا جواب دینے سے پہلے میں خود آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ آپ پہلے میرے سوال کا جواب دیں۔ اس کے بعد میں اس بات کی وضاحت کروں گا جو آپ نے دریافت فرمائی ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام میں پانچ وقت کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر ایک شخص آپ سے پوچھے کہ آخر یہ پانچ وقت کی نماز کب تک پڑھی جاتی رہے گی، تو آپ ایسے شخص کو کیا جواب دیں گے۔ انھوں نے کہا کہ نماز تو اللہ کی عبادت ہے۔ اس کی کوئی آخری حد نہیں۔ نماز ہر آدمی کو ساری عمر ادا کرنا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت کا وقت آجائے۔

میں نے کہا کہ یہی آپ کے سوال کا جواب بھی ہے۔ صبر بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ آدمی کو اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک صبر کی روش اختیار کرنا ہے۔ موت سے پہلے کسی سے یہ حکم رفع نہیں ہوتا۔ ایک مسلمان کو جس طرح نماز پڑھنا ہے اسی طرح اس کو صبر بھی کرنا ہے۔

آپ دیکھیے۔ قرآن میں نماز کا حکم جن لفظوں میں دیا گیا ہے، ٹھیک انھیں لفظوں میں صبر کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ نماز کے بارہ میں قرآن میں ہے کہ: فصل لربك (الکوثر) اسی طرح صبر کے بارہ میں قرآن میں فرمایا کہ ولربك فاصبر (المدثر) اس سے معلوم ہوا کہ نماز بھی اللہ کے لیے ہے اور صبر بھی اللہ کے لیے۔ دونوں ہی مومن کی پوری زندگی کا کورس ہیں۔ دونوں ہی کی حد اس وقت آتی ہے جب کہ خود مومن کی زندگی کی حد آجائے۔

صبر با مقصد انسان کا اخلاق ہے۔ مومن سب سے بڑا با مقصد انسان ہوتا ہے۔ اس لیے مومن سب سے زیادہ صبر والا ہوتا ہے۔ ایمان آدمی کے دل کو نرم کرتا ہے۔ وہ آدمی کو دوسروں کا خیر خواہ بناتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر تواضع اور اعتراف کی صفت پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر یہ جذبہ ابھارتا ہے کہ وہ دوسروں کے لیے نفع بخش بنے۔ ان صفتوں کے ساتھ جو اخلاقی روش مناسبت رکھتی ہے وہ صبر ہی ہے۔ صبر کے بغیر کوئی شخص کبھی ان اعلیٰ صفات پر قائم نہیں رہ سکتا۔

کامیابی کا موقع

کامیابی کا موقع صرف ایک بار کسی شخص کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے ـــــــ اس دنیا میں کامیابی کا موقع روزانہ آتا ہے۔ مگر وہ روزانہ چلا بھی جاتا ہے۔ اور جو موقع ایک بار چلا جائے وہ دوبارہ کسی کے لئے واپس نہیں آتا۔

کامیابی کا بہت گہرا تعلق مواقع سے ہے۔ جب کوئی بڑا موقع سامنے آتا ہے تو وہ بس تھوڑی دیر ٹھہرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ موقع آنے کے وقت آدمی فوراً اس کو پہچانے۔ جو شخص کسی موقع کو شروع ہی میں پہچان لے، وہ اس سے سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرے گا۔ اور جو شخص اس کو پہچاننے میں دیر لگا دے، وہ اس سے بڑا فائدہ حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

جب ایک موقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائے تو آپ اپنی اس محرومی کو اس طرح یافت میں بدل سکتے ہیں کہ پورے معاملہ پر بے لاگ انداز میں سوچیں۔ اس طرح آپ کے اندر یہ سمجھ پیدا ہوگی کہ دوسری بار جب ایک موقع آئے تو آپ فوراً اس کو پہچان لیں، اور پہلے ہی لمحہ میں اس کو استعمال کرکے آگے بڑھ جائیں۔

زندگی میں کچھ لمحات فیصلہ کے لمحات ہوتے ہیں۔ ان لمحات میں چوک جانا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی بعد کو ممکن نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ان مخصوص لمحات کو پہچان نہیں پاتا۔ وہ غفلت میں ان لمحات کو ضائع کر دیتا ہے۔ بعد کو وہ جاگتا ہے، مگر اب اس کے لئے افسوس کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ہر بار جب آپ کے دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز آئے تو فوراً اس پر دھیان دیجئے۔ کیا معلوم کسی بڑی کامیابی کا موقع آپ کے دروازہ پر آپ کا انتظار کر رہا ہو۔ آنے والے موقع کا استعمال کیجئے، کیوں کہ جو موقع ایک بار آکر واپس چلا جائے وہ دوبارہ آپ کے پاس لوٹ کر آنے والا نہیں۔

اکثر لوگوں کی محرومی مواقع کو کھونے کا نام ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ مواقع کو وقت پہ استعمال نہ کر سکے۔

ہار کو ماننا

اپنی ہار کو ماننا اس عزم کا اظہار ہے کہ آدمی پھر سے محنت کر کے اپنی کھوئی ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنا چاہتا ہے ــــــ ہارنے کے بعد ہار کو مان لینا دوبارہ جیت کی طرف سفر کرنے کا پہلا قدم ہے۔

اگر آپ ہارنے کے بعد اپنی ہار کو نہ مانیں تو آپ ہار کے بعد جہاں کھڑے ہوئے تھے، آپ بدستور وہیں کھڑے رہیں گے۔ آپ نئے سفر کا آغاز کرنے کے قابل نہیں بنیں گے۔ مگر جب آپ ہارنے کے بعد اپنی ہار مان لیں تو آپ کا سفر فوراً دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہار کو مان لینا اس بات کا اعتراف ہے کہ میں مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ اس کے برعکس ہار کو نہ ماننا گویا یہ کہنا ہے کہ میں مقابلہ کی دوڑ میں آگے ہوں۔ اب جو شخص واقعہ کے اعتبار سے پیچھے ہو وہ فرضی طور پر اپنے آپ کو آگے سمجھے تو وہ جھوٹے بھرم میں مبتلا رہے گا۔ اور جو لوگ جھوٹے بھرم میں مبتلا ہوں وہ اسباب کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

ہارنے کے بعد ہار کو مان لینا بہادری ہے۔ اور ہارنے کے بعد ہار کو نہ ماننا بزدلی۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بہادر ثابت کرے۔ وہ اپنے آپ کو بزدلی کی سطح پر جانے نہ دے۔

اس دنیا میں کبھی ہار ہوتی ہے اور کبھی جیت۔ بلند انسان وہ ہے جو ہار جیت سے اوپر اٹھ کر سوچے، جو ہار جیت سے اثر لئے بغیر اپنی رائے قائم کرے۔ جو لوگ اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت دیں، وہی اس دنیا میں اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ جو لوگ اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ زندگی کے طوفان میں گھر کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

جو شخص ہار کو مان لے اس نے گویا ہار میں بھی جیت کا راز دریافت کر لیا۔ کیوں کہ وہ باہر کی دنیا میں وقتی طور پر ہار اگر وہ اپنے اندر کی ابدی دنیا میں بدستور فاتح رہا۔ اس نے اپنی عملی شکست کو اپنے ذہن کی شکست بننے نہیں دیا۔ جو آدمی ہار کو نہ مانے اس نے گویا اس معاملہ کو اپنے لئے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اور جو آدمی اس طرح کسی معاملہ کو وقار کا مسئلہ بنا لے وہ غلطی پر غلطی کرتا چلا جائے گا۔ وہ مسلسل ہارتا ہی چلا جائے گا، اس کے لئے دوبارہ جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔

وقت کا استعمال

میں نے وقت کو برباد کیا تھا، اب وقت مجھے برباد کر رہا ہے ——— اگر آپ نے اپنے پچھلے دنوں میں وقت کو استعمال نہیں کیا ہے تو آپ اپنے اگلے دنوں میں اپنے وقت کو استعمال کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس طرح آپ کی بربادی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

وقت کسی آدمی کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ وقت اس لئے ہے کہ آدمی اس کو استعمال کر کے اپنے کو کامیابی کا اہل بنا لے۔ جو آدمی وقت کو ضائع کرے اس نے صرف وقت کو ضائع نہیں کیا بلکہ خود اپنے آپ کو بھی ضائع کر دیا۔ کیوں کہ اس قسم کی غفلت کا نقصان اس کی اپنی ذات کے سوا کسی اور کو پہنچنے والا نہیں۔

جو وقت آپ کو ملا ہے اس کو یا تو اپنی تیاری میں استعمال کیجئے یا اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد میں۔ یہی وقت کا صحیح استعمال ہے۔ اگر ایسا ہے کہ آپ نہ تیاری میں لگے ہوئے ہیں اور نہ حصولِ مقصد کی جدوجہد میں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے وقت کو ضائع کر رہے ہیں۔

لمحے وقت کو ضائع کرنا بلاشبہ سب سے بڑا نقصان ہے۔ یہ ایسا نقصان ہے جس کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔ آپ کھوئی ہوئی دولت کو دوبارہ کما سکتے ہیں۔ مگر آپ کھوئے ہوئے وقت کو دوبارہ لوٹا کر اپنی طرف واپس نہیں لا سکتے۔

وقت دولت ہے، بلکہ وقت ہی دولت ہے۔ وقت کے ذریعہ آپ دوسری چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر آپ دوسری چیزوں کے ذریعہ وقت کو خرید نہیں سکتے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ وقت کے معاملہ میں سب سے زیادہ چوکنا رہیں۔

وقت بھاگ رہا ہے، وقت کو پکڑ لیے، کیوں کہ وقت آپ کو نہیں پکڑے گا۔ آپ کو خود وقت کو پکڑنا ہوگا۔

جو آدمی وقت کو کھو دے، اس کے حصہ میں آخر کار صرف یہ آئے گا کہ وہ وقت کو گزرتا ہوا دیکھے مگر وہ اس کو استعمال نہ کر سکے۔

آغاز و انجام

اگر آپ نے اپنے آغاز کو پالیا تو آپ اپنے اختتام کو بھی پا سکتے ہیں۔ کیونکہ صحیح آغاز ہی کا دوسرا نام صحیح اختتام ہے ــــ آدمی اگر صحیح رخ پر چل پڑے تو وہ منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ منزل پر نہ پہنچنا ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی نے اپنے سفر کا آغاز الٹی سمت میں کر دیا ہو۔

کائنات کا پورا انتظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں جب بھی کوئی شخص ایک درست عمل کا آغاز کرے تو پوری کائنات اس کو تکمیل تک پہنچانے میں لگ جائے۔ باغبان ایک بیج زمین میں ڈالتا ہے تو دنیا کا پورا انتظام اس کو پروان چڑھانے میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کے درجہ کو پہنچ کر پورا درخت بن کر کھڑا ہو جائے۔

اسی طرح اس دنیا میں جب کوئی آدمی ایک صحیح عمل کا آغاز کرتا ہے تو دنیا کا پورا نظام اس کی مدد پر آجاتا ہے۔ ہر چیز اس کا ساتھ دینے لگتی ہے تاکہ وہ اپنے عمل کو اس کی تکمیل کے مرحلہ تک پہنچا سکے۔

اگر کوئی شخص دیکھے کہ اس کا شروع کیا ہوا عمل ترقی نہیں کر رہا ہے تو اس کو خود اپنی کارکردگی اور اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کرنا چاہئے۔ یقینی طور پر اس کی اپنی طرف کوئی کوتاہی ہوگی۔ جس نے اس کے شروع کئے ہوئے عمل کو مطلوبہ انجام تک پہنچنے نہیں دیا۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ اقدام کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لے۔ وہ حقیقت پسندانہ جائزہ کے بعد اپنا منصوبہ بنائے۔ اور جب اپنے منصوبہ پر عمل درآمد شروع کرے تو اپنے آپ کو اس میں لگانے میں کوئی کمی نہ کرے۔ آدمی نے اگر ان شرطوں کو پورا کر دیا تو اس کے بعد مستقبل میں جو چیز برآمد ہوگی وہ وہی ہوگی جس کی طلب وہ اپنے سینہ کے اندر لئے ہوئے ہے۔

ڈور کے ابتدائی سرے کو پانا ہی ڈور کے آخری سرے کو پالینا ہے۔ ڈور کے ابتدائی سرے کو مضبوطی سے تھام لیجئے۔ اس کے بعد ڈور کا آخری سرا بھی آپ کے ہاتھ میں آکر رہے گا۔ وہ آپ سے جدا ہونے والا نہیں۔

صحیح اختتام کے سوا صحیح آغاز کی اور کوئی منزل نہیں۔

خاتمہ نہیں

مواقع نکل جاتے ہیں، مگر مواقع ختم نہیں ہوتے ـــــ یہ موجودہ دنیا کا ایک ایسا سبق ہے جو گویا ہر ذرہ اور ہر پتی سے روزانہ نشر کیا جارہا ہے۔

ہماری دنیا کو کسی انسان نے نہیں بنایا ہے بلکہ خدا نے بنایا ہے جس کی طاقتیں لامحدود ہیں۔ دنیا کو بنانے والا اگر انسان ہوتا تو اس کے امکانات محدود ہوتے۔ مگر جب لامحدود خدا نے اس کو بنایا ہے تو اس کے امکانات اور مواقع بھی لامحدود ہیں۔

کتنے ہی مواقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں۔ کتنے ہی زیادہ امکانات کو آپ کھودیں، پھر بھی آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ہمیشہ مزید امکانات اور مواقع آپ کے لئے موجود ہوں گے جن کو استعمال کرکے آپ اپنا مستقبل تعمیر کرسکیں۔

جب مواقع ختم ہونے والے نہ ہوں تو مواقع کے نکل جانے پر افسوس کرنا صرف بے خبر آدمی کا کام ہو سکتا ہے۔ جب ایک سواری چھوٹ کر دوسری سواری ملنے والی ہو تو مسافر اس سواری کا غم نہیں کرتا جو چلی گئی۔ بلکہ اگلی سواری کا انتظار کرتا ہے تاکہ اس میں بیٹھ کر اپنا سفر جاری کرسکے۔

موجودہ دنیا میں اصل اہمیت کی بات یہ نہیں ہے کہ ایک آیا ہوا موقع آپ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ دوسرے مواقع جو ابھی باقی ہیں، ان کو آپ نے پہچانا یا نہیں اور ان کو استعمال کرکے دوبارہ اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا جذبہ آپ کے اندر جاگا یا نہیں۔ اگر یہ دوسری بات حاصل ہوجائے تو پہلی بات کی پروا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

زندگی نام ہے ایک موقع کو کھو کر دوسرے موقع کو استعمال کرنے کا۔ اسی طرح دوسرے کامیاب ہونے والوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اسی طرح آپ بھی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ کامیابی کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ دوسروں کے لئے ہے اور نہ آپ کے لئے۔

یہ قادر مطلق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ایسی دنیا بنائے جہاں مواقع اتنے کم ہوں کہ ایک موقع نکل جانے کے بعد دوسرا موقع آدمی کے لئے باقی نہ رہے۔

مسائل اور مواقع

مسائل کو مستقبل کے خانہ میں ڈالنا اور مواقع کو استعمال کرنا، یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز ہے ـــــــ اس دنیا میں ہمیشہ مسائل بھی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ مواقع بھی۔ اس دنیا میں صرف وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو مسائل کو نظرانداز کریں اور مواقع کو استعمال کرکے آگے بڑھ جائیں۔

مسائل کا حل مسائل سے لڑنا نہیں ہے، بلکہ مواقع کو استعمال کرنا ہے۔ جب بھی آپ کو مسائل کا سامنا پیش آئے تو یہ دیکھئے کہ مسائل کے باوجود وہ کون سے امکانات ہیں جو اب بھی آپ کے لئے پوری طرح موجود ہیں اور جن میں آپ آزادانہ طور پر عمل کر سکتے ہیں۔

ان امکانات کو دریافت کرکے اپنی طاقتوں کو ان میں لگا دیجئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ امکانات کو استعمال کرنے کے بعد مسائل اپنے آپ حل ہوتے جارہے ہیں۔ جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے، اس کو حاصل کرکے آپ اس کو بھی پالیتے ہیں جو پہلے آپ کو ملا ہوا نہیں تھا۔

زندگی میں ساری اہمیت عمل کی ہے، اور عمل صرف ممکن دائرہ میں کیا جا سکتا ہے، ناممکن دائرہ میں عمل کرنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ جب آپ ممکن دائرہ میں اپنا عمل شروع کریں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی عملی قوتوں کو وہاں لگا رہے ہیں جہاں ان قوتوں کو نتیجہ خیز طور پر لگانا ممکن ہے۔ ایسی محنت کبھی نہ کبھی اپنا نتیجہ ظاہر کرکے رہتی ہے۔

اس کے برعکس جب آپ مسائل سے الجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی عملی قوت کو وہاں لگا رہے ہیں جہاں عمل کے باوجود کوئی نتیجہ پانا ممکن نہیں۔ ایسی محنت کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ بے فائدہ طور پر رائیگاں ہو کر رہ جائے۔

مسائل بذات خود کوئی چیز نہیں، اصل توجہ کی چیز مواقع ہیں۔ مواقع میں توجہ اور محنت صرف کرکے آپ مستقبل میں اپنے مسائل پر بھی قابو پالیتے ہیں۔ لیکن اگر مسائل میں الجھے رہیں تو دونوں میں سے کوئی چیز بھی آپ کو ملنے والی نہیں۔

تاخیر نہ کہ ناکامی

شکست تاخیر ہے، مگر شکست ناکامی نہیں ——— شکست کسی کے لئے ایک درمیانی وقفہ ہے، وہ اس کا آخری انجام نہیں۔ ایسی حالت میں شکست سے مایوس ہونے کی کیا ضرورت۔

زندگی کا سفر کبھی ہمواری کے ساتھ طے نہیں ہوتا۔ زندگی میں اتار چڑھاؤ آنا لازمی ہے۔ مختلف اسباب سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نقصان اٹھاتا ہے یا ہار جاتا ہے۔ مگر زندگی میں ہر نقصان یا ہار کی حیثیت وقتی واقعہ کی ہے۔ آپ ایسے واقعہ سے بد دل نہ ہوں۔ اور اپنی کوشش جاری رکھیں۔ آج نہیں تو کل آپ یقینی طور پر کامیاب ہو جائیں گے۔

نقصان صرف نقصان نہیں یا ہارنا صرف ہارنا نہیں۔ ان میں فائدہ کا پہلو بھی ہے۔ نقصان یا ہار کا واقعہ جب پیش آتا ہے تو اس سے آدمی کو بہت سے نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی صلاحیتیں از سر نو جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح نئی چیز کو پانا، کھوئی ہوئی چیز کی تلافی بن جاتا ہے۔

ابتدا میں جب کوئی شکست پیش آتی ہے تو فوری طور پر آدمی جھنجھلا اٹھتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے عمل کو جاری رکھے تو نئی کامیابیاں اس کو جلد ہی اتنی زیادہ خوشی اور اطمینان دے دیں گی کہ پچھلی بات اس کو یاد بھی نہیں رہے گی۔ فتح کی خوشی شکست کے سارے غم کو بہت جلد بھلا دے گی۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ آگے کی طرف دیکھے۔ وہ آج کے بجائے کل پر اپنی نظریں جمائے رہے۔ جو شخص ایسا کرے گا، اس کے لئے وقتی ناخوش گواریوں کو جھیلنا آسان ہو جائے گا۔ آنے والی جیت کی خاطر وہ آج کی ہار کو بھول جائے گا۔ شام اس کے لئے شام نہ ہوگی، بلکہ سادہ طور پر وہ صبح کا انتظار بن جائے گی۔

وقتی شکست کا پیش آنا لازمی طور پر آپ کی کوتاہی نہیں، وہ فطرت کے عمومی قانون کی بنا پر ہے۔ یہ دنیا اسی ڈھنگ پر بنائی گئی ہے کہ یہاں فتح کے ساتھ شکست بھی پیش آئے، یہاں کامیابی کے ساتھ آدمی کو ناکامی کا بھی تجربہ ہو۔ گویا کہ جو ہوا، وہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ ایسی حالت میں دل شکستہ ہونے کی کیا ضرورت۔

نادانی اور دانش مندی

نادان نے کہا کہ میں نے اپنے ماضی اور حال کو برباد کر دیا۔ دانش مند بولا، مگر مستقبل تو برباد نہیں ہوا ——— آدمی کی زندگی صرف ماضی اور حال کے اوپر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کی لمبی زندگی میں مستقبل بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ پھر کوئی شخص ماضی اور حال کے کھونے کا غم کیوں کرے، جب کہ مستقبل اب بھی آپ کے پاس پوری طرح موجود ہے۔

کوئی شخص اپنے گزرے ہوئے دنوں کو گنوا سکتا ہے۔ مگر اس کے آنے والے دن تو اب بھی اس کے پاس باقی ہیں۔ اگر آدمی اپنے احساس کی شدت کو پچھلے دنوں کی تلخ یاد میں نہ لگائے بلکہ اس شدت کو آنے والے دنوں کو استعمال کرنے میں لگا دے تو ہو سکتا ہے کہ پہلے اس نے جو کچھ کھویا ہے، اس کو وہ آئندہ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کر لے۔

ماضی آپ کے ہاتھ سے نکل چکا، حال بھی آپ کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ اب جو چیز آپ کے پاس باقی ہے وہ صرف آپ کا مستقبل ہے۔ آپ بیتے ہوئے دن یا جانے والے لمحات کا غم کیوں کریں۔ آنے والے دن جو اب بھی پوری طرح آپ کے قبضہ میں ہیں، ان پر اپنی ساری توجہ لگا دیجئے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی عقل کا تقاضا بھی۔

نادان کی نظر ہمیشہ پیچھے کی طرف ہوتی ہے اور دانش مند کی نظر ہمیشہ آگے کی طرف۔ نادان آدمی صرف اس کو جانتا ہے جو ہو چکا۔ دانش مند اس کو بھی جانتا ہے جو ہو سکتا ہے۔ آپ نادان نہ بنئے، آپ کوشش کیجئے کہ آپ کا نام دانش مندوں کی فہرست میں لکھا جائے۔

جب آدمی کے لئے دانش مند بننے کا موقع بھی موجود ہو اور اسی کے ساتھ نادان بننے کا موقع بھی، تو وہ نادان کیوں بنے، کیوں نہ وہ دانش مند بننے کی کوشش کرے۔ وہ تاریکیوں میں کیوں بھٹکے، جب کہ روشنی کے دروازے بھی اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

زندگی ایک مسلسل سفر ہے جو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف جاری ہے۔ جو شخص ماضی اور حال میں اٹک کر رہ جائے وہ گویا زندگی کی حقیقت کا انکار کر رہا ہے۔ اور حقیقت کا انکار کرنے والا خود اپنا انکار کرتا ہے، حقیقت کو بدلنا اس کے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔

گر کر اٹھنا

نہ گرنا کمال نہیں۔ کمال یہ ہے کہ تم گرو، اور پھر از سرِ نو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ جو شخص نہیں گرا، اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ کارنامہ انجام دینے والا وہ ہے جو گرے اور پھر اٹھ کر چل پڑے۔

جو آدمی نہیں گرا وہ حقیقۃً چلا ہی نہ تھا۔ کیوں کہ اس دنیا میں ہر چلنے والا گرتا ہے۔ پھر ایسے نہ گرنے کی کیا قیمت۔ انسان کی شان اسی میں ہے کہ وہ چلے۔ انسان چلنے کے لئے بنایا گیا ہے، وہ بیٹھنے کے لئے نہیں بنایا گیا۔ اور جب وہ چلے گا تو ضرور ہے کہ اس کے ساتھ گرنے کا واقعہ بھی پیش آئے۔

نہ گرنا ٹھہراؤ کی علامت ہے اور گرنا حرکت اور عمل کی علامت۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے گرنے پر شرمندہ نہ ہو بلکہ اس کو اپنی اعلیٰ انسانیت کا ثبوت سمجھے کہ اس کے ساتھ گرنے کا واقعہ پیش آیا۔ جب وہ اس طرح سوچے گا تو وہ گرنے کے بعد فوراً اٹھ کر دوبارہ کھڑا ہو جائے گا۔

نہ گرنا کمال نہیں، کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ نہ چلنا کمال نہیں۔ از سرِ نو اٹھنا کمال ہے، کا مطلب یہ ہے کہ چلتے رہنا کمال ہے۔ کیوں کہ جو شخص ٹھہرا رہے، وہی گرنے سے بچے گا۔ چلنے والوں کا معاملہ اس دنیا میں یہی ہے کہ وہ بار بار گرتے ہیں اور پھر بار بار اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آدمی جب گرتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھ کر چلنے لگتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ گرنا اس کے لئے نئے حوصلہ کا ذریعہ بن گیا۔ گر کر اس نے دوبارہ اپنے لئے ایک نئی طاقت حاصل کر لی۔

بیٹھنے کے بجائے چلئے، اور چلنے کے بعد جب گریں تو اٹھ کر کھڑے ہو جائیے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔ آپ اپنے لئے نئی دنیا نہیں بنا سکتے۔ اس لئے آپ گرنے سے بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ کیوں کہ دنیا کو بنانے والے نے اس دنیا کو اسی طرح بنایا ہے۔

انتقام نہیں

انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا ـــــــ یہ زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے، اور جو شخص موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس حقیقت کا پورا لحاظ کرے۔

ایک شخص سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ آپ کے دل میں اس کے خلاف انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ آپ چاہنے لگے کہ اس سے بدلہ لے کر اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کریں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے تکلیف دینے سے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ پھر وہی تکلیف جب آپ دوسرے آدمی کو دیں گے تو کیا اس کے اندر دوبارہ وہی انتقامی جذبہ نہیں پیدا ہو جائے گا۔

یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ آپ کے انتقام کے بعد وہ بھی انتقام لے گا۔ اس طرح برائی کا ایک چکر چل پڑے گا۔ آپ کو ایک تکلیف کے بعد دوسری تکلیف سہنی پڑے گی۔ اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ نظر انداز کرنے کا طریقہ اپنا کر بات کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔

جب آپ کسی سے انتقام لیں تو یہ کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ انتقام لینے کے لئے آپ کو اپنی طاقت خرچ کرنی پڑتی ہے۔ وقت اور پیسہ کی کافی مقدار خرچ کئے بغیر کوئی شخص کسی دوسرے آدمی سے انتقام نہیں لے سکتا۔

اب اگر انتقام لینے والا اپنے انتقام کے منصوبہ میں کامیاب ہو جائے تب بھی یہ اپنا کچھ اور اثاثہ کھونے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ انتقام لے کر آدمی آخر میں جو چیز پاتا ہے، وہ صرف ایک نفسیاتی تسکین ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

لیکن اسی وقت اور اسی رقم کو اگر کسی مثبت کام (مثلاً کاروبار) میں لگایا جائے تو وہ شکل بدل کر محفوظ رہتا ہے، یہاں تک کہ مزید نفع کے ساتھ آدمی کی طرف لوٹتا ہے۔ انتقام لینے میں طاقت لگانا طاقت کو کھونا ہے۔ مثبت کام میں طاقت لگانا طاقت کو اضافہ کے ساتھ دوبارہ پا لینا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو اپنا اثاثہ پانے کی مد میں خرچ کرنا چاہئے نہ کہ کھونے کی مد میں۔

اسلام میں عدل اجتماعی

رانچی (بہار) کے لا کالج میں ۱۴ دسمبر ۱۹۹۱ کو مسٹر جسٹس ستیشور رائے کی زیر صدارت تعلیم یافتہ افراد کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں میں نے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا: اجتماعی عدل اسلام میں (Social justice in Islam) ذیل میں اس کو کسی قدر اضافہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

سوشل جسٹس کا مطلب سادہ طور پر سب کے لیے انصاف (justice to all) ہے۔ اسلام سے پہلے انسانی سماج میں اس قسم کا مساویانہ انصاف نظری اور عملی دونوں اعتبار سے تقریباً معدوم تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار مساویانہ انصاف کو قائم کیا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا اعتراف خود غیر مسلم مفکرین نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر سوامی ویویکانند (۱۸۶۳-۱۹۰۲) نے اپنے خطوط (Letters) میں کہا ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب انسانی برابری تک قابل لحاظ درجہ میں پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے:

> If ever any religion approached to this equality in any appreciable manner, it is Islam and Islam alone. (p.379)

اس معاملہ میں اسلام کا جو حصہ (contribution) ہے، وہ ایک نہایت تفصیلی کتاب کا طالب ہے۔ تاہم اصولی طور پر اس کو تین باب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسانی برابری اور مساوی انصاف کے حق میں ایک مکمل نظریہ (ideology) پیش کرنا۔ اس قسم کا ایک نظریہ انتہائی ضروری ہے۔ نیز اس نظریہ کو لازمی طور پر حقیقی بھی ہونا چاہیے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں یہ دونوں صفتیں پوری طرح پائی جاتی ہیں۔

۲۔ اس نظریہ کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کے لیے ایک طاقتور محرک (incentive) دینا۔ یہ محرک اتنا گہرا ہونا چاہیے کہ وہ مساوات برتنے اور سماجی انصاف کرنے کو ہر آدمی کا ذاتی مسئلہ بنا دے۔ اس کے بعد ہر آدمی خود اپنی فلاح کے لیے اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

۳۔ ہر شعبۂ حیات میں برابری اور مساوی انصاف کا ایک حقیقی نمونہ (example) قائم کرنا۔ اگر ایسا نمونہ واقعہ میں موجود نہ ہو تو لوگ برابری کے سلوک کی بات کو صرف ایک خیالی چیز سمجھیں گے،

وہ اس کو قابل عمل بھنے پر بھی آمادہ نہ ہوں گے۔

مساوی انصاف کا نظریہ

قدیم ترین زمانہ سے اونچ نیچ کے نظریات ہر جگہ پائے جاتے رہے ہیں۔ اور اس بنا پر ہر دور میں سماجی ناانصافی کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ قدیم زمانہ کا کوئی بھی دور اس سے خالی نظر نہیں آتا۔ یہ ایسا کلیہ ہے جس میں معلوم تاریخ کے مطابق، کوئی استثنا نہیں۔

قدیم یونان مفکرین اور مصلحین کی پیدائش کے لیے مشہور ہے۔ مگر قدیم یونان کے مشہور فلسفی ارسطو کا خیال تھا کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر غلام (natural slaves) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ بعض مفکرین نے اس سے اختلاف کیا۔ تاہم ان کا اختلاف بے اثر ثابت ہوا۔ اور غلامی عملی طور پر یونان اور روم میں وسیع پیمانہ پر مسلسل جاری رہی :

Aristotle regarded some humans as natural slaves a point on which later Roman philosophers especially the stoics and jurists, disagreed with him. Although slavery was as widespread in Rome as in Greece. (5/93)

یہی حال قدیم زمانہ میں ساری دنیا کا رہا ہے۔ انڈیا میں ہزاروں برس سے یہ نظام قائم تھا کہ کچھ لوگ اونچی ذات والے ہیں اور کچھ لوگ نیچی ذات والے۔ اونچی ذات والوں کو حق تھا کہ وہ نیچی ذات والوں کے ساتھ ہر قسم کا غیر مساوی سلوک کریں۔ بھارتی فکر میں یہ غیر مساوی تصور اتنا راسخ ہے کہ موجودہ زمانہ میں نئے قوانین بنائے جانے کے باوجود یہ تفریق نہ عملی طور پر ختم ہو سکی اور نہ فکری طور پر۔

یورپ کے لوگوں نے دیکھا کہ وہ سفید فام ہیں اور افریقہ کے لوگ سیاہ فام۔ انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ سفید لوگ پیدائشی طور پر اونچے لوگ ہیں اور سیاہ فام لوگ پیدائشی طور پر نیچے لوگ۔ سفید فام کو جائز طور پر یہ حق ہے کہ وہ سیاہ فام کو غلام بنائے اور ان سے اپنی خدمت لے۔

افریقہ کو سیاہ براعظم (dark continent) قرار دیا گیا۔ جغرافی ذرائع اور انسانی صلاحیت کے اعتبار سے افریقہ یکساں طور پر ایک قیمتی زمینی خطہ تھا۔ مگر یہاں کے لوگوں کی جلد کا رنگ چونکہ سیاہ تھا، وہ پیدائشی طور پر کمتر مان لیے گئے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ

نیگرو پیدائشی غلام ہیں۔ یہ ابتدائی دور کے لوگ ہیں اور تہذیب کو اختیار کرنے کے لیے نااہل ہیں :

The negro is a natural slave. The Europeans regarded the African as primitive without culture and incapable of civilisation. Slave Trade in Africa, 1985, p.7

نسلی بادشاہت کے نظام میں شاہی خاندان والوں نے اپنے آپ کو آقا سمجھ لیا اور دوسروں کو رعایا۔ ان کا خیال یہ ہو گیا کہ انھیں دوسروں کے اوپر پیدائشی فضیلت حاصل ہے۔ اور ان کو مطلق طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کے اوپر حکومت کریں اور دوسروں پر لازم ہے کہ وہ ان کے آگے جھک جائیں۔ تمام قدیم زمانوں میں بادشاہ یا تو خدا سمجھے جاتے تھے یا خدا کے نمائندہ (God's representative) عوام کی یہ لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر حال میں بادشاہ کے مطیع اور فرماں بردار بنے رہیں (V/816)

اسی طرح دولت مند لوگوں نے اپنے آپ کو حقوق یافتہ طبقہ (privileged class) سمجھ لیا اور غریب لوگوں کو محروم طبقہ (deprived class) قرار دیا۔ جس آدمی کے پاس دولت آجائے وہ گویا ایک علامت تھی کہ وہ خدا کی عنایت و رحمت سے فیض یاب ہوا ہے۔ اور جس آدمی کو دولت نہ ملے وہ گویا ایک ایسا شخص ہے جس کو خدا نے اپنی عنایتوں سے دور کر دیا۔

سماجی ناانصافی کے یہ تمام نظریات اس لیے پیدا ہوئے کہ لوگوں نے انسان اور انسان کے درمیان فرق دیکھا۔ یہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان، ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان ظاہری اعتبار سے مختلف قسم کے فرق پائے جاتے ہیں۔ مثلاً رنگ کا فرق، جسمانی بناوٹ کا فرق، دولت اور طاقت کا فرق، وغیرہ۔ اسی فرق کی غلط توجیہ نے مذکورہ تمام امتیازات اور بے انصافیوں کو پیدا کیا ہے۔

سماجی نابرابری کا تصور تاریخ میں مسلسل پایا گیا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فروق (differences) کو پیدائشی (inborn) سمجھ لیا گیا۔ مختلف قسم کے نظریے اور فلسفے وجود میں آئے جو انسانوں کے درمیان فرق کا کوئی نہ کوئی ایسا سبب بتاتے تھے جس کا تعلق پیدائش سے ہوتا تھا۔ فرق کی یہی مبنی بر پیدائش توجیہات (birth-based explanations) وہ نظریاتی سبب ہیں جنھوں نے "پائے ہوئے" لوگوں کو یہ جواز دیا کہ وہ "کھوئے ہوئے" لوگوں کو برابری کا درجہ اور

برابری کا انصاف دینے سے انکار کر سکیں۔

مثلاً ہندستان میں اس فرق کو دیکھ کر ورن کا عقیدہ پیدا ہوا۔ ورن کے لفظی معنی رنگ کے ہوتے ہیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے رنگ میں فرق ہے، اس سے انھوں نے یہ اخذ کیا کہ ایک قسم کے رنگ والے خدا کے سر سے پیدا ہوئے ہیں اور دوسرے قسم کے رنگ والے خدا کے پاؤں سے :

Indian society is made up of four different varnas. The Rigveda (10.90) has declared that the Brahmin, the Ksatriya, the Vaisya, and the Sudra issued forth at creation from the mouth, arms, thighs and feet of Purusa. (X/361)

یورپ میں نسلی امتیاز کا نظریہ (racism) پچھلی صدیوں میں شدت کے ساتھ پھیلا۔ اور اب تک وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ابتداءً یہ ذہن اس لیے پیدا ہوا کہ اہل یورپ نے اپنے اور دوسروں کے درمیان رنگ اور کلچر میں فرق پایا۔ اس سے انھوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ وہ دوسروں سے برتر (superior) ہیں اور دوسرے لوگ ان سے کمتر (inferior)

موجودہ زمانہ میں نظریۂ ارتقاء کے ظہور نے اس کو مزید پختہ کر دیا۔ کیوں کہ سماجی ڈارونیت (Social Darwinism) کے تحت یہ سمجھ لیا گیا کہ انسانیت مختلف ارتقائی مرحلوں سے گزری ہے اور مغربی تہذیب اس کا درجۂ کمال ہے :

Mankind was regarded as having achieved various levels of evolution, culminating in the white-European civilization. (15/363)

اس کے مطابق، یورپ کے سفید فام لوگ ارتقاء یافتہ نسل قرار پائے اور دوسرے غیر سفید فام طبقے عمل ارتقاء میں پیچھے رہ جانے والے لوگ۔

قدیم زمانہ میں نسلی فرق کے بارہ میں توہماتی نظریات کی بنا پر امتیاز کا ماحول پیدا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء نے بظاہر اس امتیاز کے حق میں ایک علمی بنیاد فراہم کر دی۔ کیوں کہ اس نے بتایا کہ بہت سے انسانی گروہ ارتقائی عمل میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ گروہ عمل ارتقاء میں اعلیٰ (superior) ہو گئے اور کچھ دوسرے گروہ پچھڑ کر ارتقاء کے ابتدائی مرحلہ

(primitive stage) میں پڑے رہے۔

اس ارتقائی نظریہ کی بنا پر یورپی قوموں نے دوسری قوموں کو اپنے سے کمتر سمجھ لیا۔ اس کے نتیجہ میں سفید فام کی ذمہ داری (whiteman's burden) کا نظریہ پیدا ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سفید فام اقوام کو یہ حق ہے کہ وہ دنیا پر قبضہ کریں اور ان کے اوپر تہذیب کی معلم بنیں۔ موجودہ دور کے نو آبادیاتی نظام (colonialism) کے پیچھے یہی ارتقائی منطق کام کرتی رہی ہے۔

یہ تصورات کسی نہ کسی طور پر آج تک قائم ہیں۔ آج کی دنیا کو وسیع تقسیم میں دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ رواجی دنیا اور سائنٹفک دنیا۔ بظاہر ایک غیر ترقی یافتہ ہے اور دوسری ترقی یافتہ۔ مگر سماجی بے انصافی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں ہی ایسے عقائد پر مبنی ہیں جو سماجی انصاف کے راستہ میں مستقل رکاوٹ ہیں۔

رواجی دنیا بڑی حد تک "کرم" کا عقیدہ ماننے والوں کی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر آدمی جو پیدا ہوا ہے وہ پچھلے کرموں کا بوجھ لیے ہوئے ہے۔ یہ نیچر کا قانون ہے اور آدمی کو بہر حال اسے بھگتنا ہے۔ اس عقیدہ کی روشنی میں سماجی انصاف کا محرک بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق، جس چیز کو ہم "ناانصافی" کہتے ہیں وہ ناانصافی نہیں رہتی بلکہ وہ آدمی کے اوپر نیچر کا نافذ کردہ لازمی فیصلہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس کو اس کی ناپسندیدہ حالت سے نکال سکیں۔ پھر انصاف کے قیام کا جذبہ آخر کیوں کر پیدا ہوگا۔

سائنٹفک دنیا اسی عقیدہ میں ایک اور سبب سے مبتلا ہے۔ یہ ارتقاء (evolution) کا نظریہ ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ زندگی کی مختلف انواع (species) کی توجیہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو "فرق" کی توجیہ بھی کرنی پڑی۔ چنانچہ علماء ارتقاء نے یہ نظریہ بنایا کہ ارتقاء کے عمل میں کچھ انسانی گروہ آگے بڑھ گئے اور کچھ لوگ پیچھے رہ گئے۔ مثال کے طور پر، عورت کے بارہ میں ڈارون کا کہنا ہے کہ وہ ارتقاء کے عمل کے دوران ابتدائی درجہ پر باقی رہ گئی، مرد آخر کار عورت کے اوپر فائق ہو گیا:

Man has ultimately become superior to woman.

افریقہ کے سیاہ فام یا بعض علاقوں کے پستہ قد لوگ وہ انسانی نسلیں ہیں جو ارتقائی عمل میں دوسروں سے پیچھے رہ گئیں۔ اس طرح سائنٹفک دنیا بھی، اپنے اس عقیدہ کے مطابق، مفروضہ پچھڑی

ہوئی نسلوں کے بارہ میں جو عقیدہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کا عقیدہ اس کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے وہ وہی ہے۔

اس قسم کے مفروضات کی بنیاد پر وہ نظریہ نکلا جس کو ان کی اپنی غلطی (Their own fault) کہا جاتا ہے۔ یعنی جو لوگ کسی دوسرے کی طرف سے نابرابری کے سلوک کا تجربہ کر رہے ہیں وہ خود ان کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ ظلم مظلوم کی اپنی تقدیر ہے۔ اس کے لیے ظالم قصور وار نہیں (15/363)

اسلام آیا تو اس نے مکمل طور پر اس قسم کے تمام نظریات کو منہدم کر دیا۔ اسلام نے مسلسل مختلف طریقوں سے یہ تصور پیش کیا کہ ظاہری فروق کے باوجود تمام انسان برابر ہیں۔ سب کو یکساں عزت اور انصاف کا حق حاصل ہے۔ کوئی انسان نہ کسی سے برتر ہے اور نہ کوئی انسان کسی سے کمتر۔ یہاں اس سلسلہ میں دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں۔ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے :

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ ان اللہ علیم خبیر (الحجرات ۱۳)

اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، انسانوں میں رنگ اور نسل کا جو فرق ہے وہ تعارف کے لیے ہے نہ کہ امتیاز کے لیے۔ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی بنیاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف کیرکٹر ہے۔ قابل عزت وہ ہے جو خدا پرست ہے۔ جو خدا اور بندوں کے حقوق کو پہچانتا ہے اور ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا۔ آپ ایام تشریق میں اپنے اونٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک بات یہ تھی :

یا ایھا الناس ألا إن ربکم واحد وإن اباکم واحد۔ ألا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی

اے لوگو سن لو، بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ سن لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی

ولا لاسود على احمر ولا لاحمر على اسود الا بالتقوى - الا هل بلغت - قالوا نعم - قال فليبلغ الشاهد الغائب (الجامع لاحكام القرآن ۱۶/ ۳۴۲)

فضیلت نہیں۔ اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ جو کچھ فضیلت ہے تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ کیا میں نے تم کو پہنچا دیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ جو حاضر ہے وہ غیر حاضر کو یہ بات پہنچا دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان اپنی عمر کے آخری سال کیا تھا۔ اس وقت پورا عرب فتح ہو چکا تھا۔ اس لیے آپ کا یہ اعلان محض ایک مصلح کا اعلان نہ تھا، بلکہ حاکمِ وقت کا اعلان تھا۔ یہ اعلان نہ صرف ایک اصولِ مساوات کے طور پر سنا گیا بلکہ عین اسی وقت وہ بالفعل قائم اور نافذ بھی ہو گیا۔

اس اعلان کے مطابق، آپ نے تمام لوگوں کو بتایا کہ اس دنیا کا جس طرح خالق ایک ہے۔ اسی طرح تمام انسان ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا ہوئے ہیں۔ تمام انسان ایک ہیں۔ تمام انسان آپس میں بھائی اور بہن ہیں۔ ان میں ظاہری اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے مگر عزت اور احترام اور قانونی انصاف کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

جہاں تک انسانوں میں ظاہری درجات کا تعلق ہے، اسلام نے بتلایا کہ یہ درجات آزمائش کے لیے ہیں نہ کہ امتیاز کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تمام انسانوں کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ کسی انسان کو جو سامان یا جو حیثیت ملتی ہے وہ اس کے لیے سامانِ آزمائش ہے، وہ گویا اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہے۔ اس دنیا میں کمی بھی ایک امتحانی حالت ہے اور زیادتی بھی ایک امتحانی حالت۔ ایک حیثیت بھی امتحان کے لیے ہے اور دوسری حیثیت بھی امتحان کے لیے۔ اس لیے آدمی کو ساری نظر اس پر رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے امتحان میں پورا اتر رہا ہے یا نہیں۔ نہ کہ اپنی حالت کو دیکھ کر وہ احساسِ کمتری یا احساسِ برتری میں مبتلا ہو جائے (الفجر)

سائنسی تصدیق

موجودہ زمانہ میں انسانی نسلوں کے بارہ میں جو نئی نفسیاتی اور حیاتیاتی تحقیقات ہوئی ہیں انھوں نے اسلام کی واضح تصدیق کی ہے اور دوسرے نظریات کو خالص علمی اعتبار سے رد کر دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مالے کیولر بیالوجی (Molecular biology) نے تحقیق کا نیا میدان

کھول دیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں جینٹکس کے ماہرین کی ایک ٹیم نے باقاعدہ ریسرچ کے ذریعہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ انسانیت کے مشترک جد اعلیٰ (common ancester) کو دریافت کریں۔

اس ٹیم نے جینی شہادت (Genetic evidence) کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تمام انسانوں کے جد اعلیٰ ایک تھے۔ رنگ وغیرہ کا فرق جو بظاہر دکھائی دیتا ہے وہ محض اضافی ہے۔ اس کا نسلی علاحدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے مطابق تمام انسان ایک عظیم خاندان (Great family) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام لوگ ایک ہی حیاتیاتی اخوت (biological brotherhood) کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں (نیوز ویک ۱۱ جنوری ۱۹۸۸)

اس موضوع پر موجودہ زمانہ میں کثرت سے کتابیں اور تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں۔ یونیسکو کے زیر اہتمام ایک کتاب چھپی ہے جو کہ حسب ذیل ہے :

J Comas, The Race Question in Modern Sciencc, 1956.

اس کتاب کا باب نسلی توہمات (Racial Myths) اس ضمن میں خاص طور پر قابل لاحظہ ہے۔

محرک کا مسئلہ

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ان علمی تحقیقات کے باوجود ایسا کیوں ہے کہ دنیا کی عملی صورت حال میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا۔ جن قوموں نے اپنے کو اعلیٰ سمجھ لیا تھا، وہ آج بھی اپنے کو اعلیٰ سمجھے ہوئے ہیں۔ اور ان قوموں کے ساتھ نئی نئی صورتوں میں ناانصافی کی جارہی ہے جن کو قدیم تصور کے تحت کمتر سمجھ لیا گیا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سماجی انصاف کے معاملہ میں صرف ایک نظریہ کا پایا جانا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک طاقت ور محرک کا ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ اور طاقت ور محرک اسلام کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔ اسلام نے جس طرح ایک کامل نظریہ دیا ہے، اسی طرح وہ اس معاملہ میں ایک انتہائی طاقت ور محرک بھی انسان کو دیتا ہے۔

✓ قرآن میں ایک طرف عدل کا حکم دیا گیا ہے (النحل ۹۰) اور دوسری طرف مکافات عمل کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ خبر دی گئی ہے کہ انسان کے تمام اعمال کی مکمل ریکارڈنگ کی جارہی ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اللہ کی عدالت میں کھڑا کیا جائے گا۔ وہاں ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ کوئی

بھی شخص، اگر وہ ظلم کرتا ہے تو وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔ وہ وقت بہر حال آتا ہے جب کہ ہر آدمی اپنے کیے کا انجام بھگتے، خواہ اس نے ایک ذرہ کے برابر ظلم کیوں نہ کیا ہو (الزلزال)

یہ مسئولیت (accountability) کا نظریہ آدمی کو آخری حد تک چوکنا کر دیتا ہے۔ یہ فکر جس کے سینہ میں داخل ہو جائے وہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں سخت محتاط ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنے بچاؤ کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ ہر ایک ساتھ انصاف کرے۔ وہ لوگوں کے ساتھ زیادتی کرنے سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائے۔

عام حالات میں سماجی انصاف محض دوسروں کی ضرورت رہتا ہے۔ مگر مسئولیت کا عقیدہ سماجی انصاف کو خود اپنی ضرورت بنا دیتا ہے۔ اور کون ہے جو خود اپنی ضرورت کے بارہ میں غافل ہو جائے۔

مسئولیت کا عقیدہ اتنا شدید چیک ہے کہ ظلم تو درکنار، ظلم کے شائبہ سے بھی آدمی بچنے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنی اہلیہ ام سلمہؓ کے حجرے میں تھے۔ آپ نے کسی کام کے لیے خادمہ کو بھیجا۔ وہ باہر گئی تو وہاں کھیل کود دیکھنے لگی اور واپسی میں دیر کر دی۔ کافی دیر کے بعد وہ واپس آئی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپ کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ تاہم آپ نے خادمہ سے صرف یہ کہا کہ اگر مجھے قیامت میں بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا (لولا خشية القود لاوجعتك بهذا السواك)

قدیم زمانہ میں خادم کو مارنا مالک کا فطری حق سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسلام نے جو ذہن بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلطی کے باوجود مسلمان اپنے خادم کو مارنے سے احتراز کرتے تھے۔ کیونکہ یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ان کا یہ فعل انہیں خود اپنی بازپرس کا سبب نہ بن جائے۔

ایک صحابی ابومسعود انصاری ایک بار کسی غلطی پر اپنے غلام کو مارنے لگے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابومسعود، جان لو کہ جتنی قدرت تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ قدرت تمہارے اوپر خدا کو ہے (اعلم ابامسعود، للّٰه اقدر عليك منك على هذا الغلام) یہ سنتے ہی ابومسعود کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا۔ انھوں نے غلام سے کہا کہ جاؤ تم آزاد ہو۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ظاہری فرق کو مٹا کر ہر آدمی کو عین اسی مقام پر کھڑا

کر دیتا ہے جہاں وہ دوسرے کو کھڑا ہوا پاتا ہے۔ ابو مسعود اپنے اور غلام کے درمیان فرق دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بڑا اور طاقت ور سمجھ رہے تھے اور غلام کو چھوٹا اور کمزور۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حقیقت کی یاد دہانی کرائی تو ان کو معلوم ہوا کہ جہاں میں نے غلام کو کھڑا کر رکھا ہے وہیں میں خود بھی کھڑا ہوا ہوں۔ کیونکہ اصل مقابلہ انسان اور انسان کا نہیں ہے بلکہ انسان اور خدا کا ہے۔ اور خدا کے مقابلہ میں میں بھی اتنا ہی چھوٹا ہوں جتنا چھوٹا کہ میں اپنے غلام کو سمجھ رہا ہوں۔

ایک اور دوسرے میں فرق کا احساس سماجی ناانصافی پیدا کرتا ہے۔ جب ایک اور دوسرے کا فرق مٹ جائے تو اس کے بعد سماجی ناانصافی کا بھی لازمی طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ظلم اور سماجی بے انصافی کے تمام واقعات انسانوں کے اندر نابرابری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسانوں میں بظاہر کوئی طاقت ور ہوتا ہے اور کوئی کمزور، کوئی دولت مند ہوتا ہے اور کوئی غریب۔ اب طاقت ور اور دولت مند اپنے آپ کو کمزور اور غریب سے اونچا سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے اوپر جو دست درازی چاہوں کروں، وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میری برتر حیثیت اس کے مقابلہ میں ہر دفاع کے لیے کافی ہے۔

مگر اسلام بتاتا ہے کہ ہر انسان کا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ ہر قضیہ آخر کار خدا کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ خدا تمام طاقت وروں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ کامل انصاف کے ساتھ ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ نافذ کرے گا اور پھر کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ خدا کے فیصلہ کی زد میں آنے سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

اس طرح ہر معاملہ انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ نہ ہو کر خدا اور انسان کے درمیان کا معاملہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف تمام انسان۔ اور جب تقسیم خدا اور انسان کی ہو جائے تو کوئی بھی طاقت ور نہیں رہتا۔ ہر آدمی اپنے آپ کو اسی عجز کی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں اس سے پہلے وہ دوسرے کو فرض کیے ہوئے تھا۔

یہ بلاشبہ سماجی انصاف کا سب سے زیادہ طاقت ور محرک ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ احساس بیدار ہو جائے وہ کسی حال میں دوسرے کے اوپر ناانصافی کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں خدا کو نہ مانا جاتا ہو وہاں اس قسم کا چیک ممکن نہیں۔ خدا کو نہ ماننے کی

صورت میں مسئلہ انسان اور انسان کے درمیان رہتا ہے۔ اور جب مسئلہ انسان اور انسان کے درمیان ہو تو کسی بھی طرح انسان کو اس پر مطمئن نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اور دوسرے کے درمیان فرق نہیں ہے۔ کیونکہ فرق تو واقعۃً بھی موجود ہے اور پوری طرح موجود ہے۔

انسانوں کے درمیان فرق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ فرق کے اثر کو ختم کیا جا سکتا ہے، اور وہ اس طرح کہ معاملہ کو انسان اور انسان کا معاملہ بنانے کے بجائے اس کو انسان اور خدا کا معاملہ بنا دیا جائے۔ ہر انسان یہ سمجھنے لگے کہ تمام انسانوں کے اوپر ایک خدا ہے اور تمام معاملات کو آخرکار اسی کے یہاں جانا ہے۔ اس کے فیصلہ کو رد کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اسلام کے سوا دوسرے جن مذاہب میں خدا کا تصور ہے، وہ تحریف کی بنا پر عملاً اس مقصد کے لیے غیر موثر ہو گیا ہے۔ مثلاً مسیحیت میں خدا کا بیٹا سولی پر چڑھ کر تمام انسانوں کے گناہ کا کفارہ بن چکا ہے۔ یہودیت میں نجات ایک گروہ کا حق ہے جس کی بخشش پیشگی طور پر ہو چکی ہے۔ ہندوازم میں خدا کا عقیدہ وحدت الوجود (monism) کی صورت میں ہے۔ جو کہ عملاً بے فائدہ ہے۔

اسلامی توحید میں خدا علحدہ ہستی ہے اور تمام انسان اس کے بندے اور مخلوق ہیں۔ اس عقیدہ سے آدمی کے اندر عجز کا تصور ابھرتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوازم میں خدا ہی واحد حقیقت ہے۔ انسان کوئی علحدہ وجود نہیں۔ انسان خود بھی خدا کے وسیع تر وجود کا ایک جزء ہے۔ یہ عقیدہ برعکس طور پر برتری کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسلامی توحید "میں بندہ ہوں" کا احساس جگاتی ہے، جب کہ ہندو عقیدہ "میں خدا ہوں" کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ اول الذکر سے عجز کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور ثانی الذکر سے گھمنڈ کی نفسیات۔ اور جس سماج کے افراد اپنے اندر گھمنڈ کی نفسیات لیے ہوئے ہوں وہاں سماجی انصاف کا ماحول پیدا کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔

جدید تدبیروں کی ناکامی

۳۰ سال پہلے ایمنسٹی (Amnesty International) کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر لندن میں تھا۔ اس کو انسانی حقوق کا چوکیدار (Human rights watchdog) سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس مدت میں وہ اخباری رپورٹوں کے سوا اور کوئی بھی حقیقی خدمت انجام نہ دے سکا۔ دسمبر ۱۹۹۱ میں اس کی عمر کے ۳۰ سال پورے ہو گئے مگر ادارہ کی طرف سے اس کی کوئی تقریب نہیں منائی گئی۔ ادارہ کی

خاتون نمائندہ فرینکا سیٹو (Ms Franca Sisto) سے پوچھا گیا کہ آپ کا ادارہ ۴۰ سال پورے ہونے پر کیا کوئی تقریب منائے گا۔ انھوں نے کہا حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی چیز تقریب منانے کے لیے نہیں :

There isn't really anything to celebrate.

ہر سال ۱۰ دسمبر کو اقوام متحدہ کی طرف سے "یوم حقوق انسانی" منایا جاتا ہے۔ اس سال اس موقع پر اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل جیویر پریز ڈی کوئیار (Javier Peres de Cuellar) نے جو بیان جاری کیا، اس میں انھوں نے دنیا بھر میں طاقت کے اندھا دھند استعمال اور انسانوں کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ۴۳ سال پہلے اقوام متحدہ کے تحت منظور شدہ اعلان حقوق انسانی (یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس) کے باوجود اب بھی بڑے پیمانہ پر اس کی خلاف ورزی کی جارہی ہے (نیشنل ہیرالڈ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۱)

امن اور انصاف کے قیام میں ان اداروں کی ناکامی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں امن اور انصاف اپیلوں یا اخباری بیانوں سے قائم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس کے موافق ایک صحیح آئیڈیالوجی ہو، اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر لوگوں کے اندر فکری انقلاب لایا جائے۔ پھر یہ اصلاح یافتہ لوگ سماجی اداروں کو درست کریں اور اگر حکومت ان کے قبضہ میں آجائے تو حکومت کے ذریعہ سماج کے اندر امن وانصاف قائم کریں۔

ان شرطوں کو تاریخ میں ایک ہی بار کامل طور پر پورا کیا گیا۔ یہ پورا کرنے والے پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امن وانصاف پر مبنی ایک حقیقی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس قسم کی کامیابی نہ اس سے پہلے کسی کو ملی اور نہ اس کے بعد۔

مساویانہ انصاف کا نمونہ

سوشل جسٹس کے معاملہ میں اسلام کا تیسرا عظیم کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس نے مساویانہ انصاف کا ایک کامل تاریخی نمونہ قائم کر دیا ہے۔ عام خاندانی اور سماجی زندگی سے لے کر حکومت اور اقتدار تک ہر مرحلہ میں اس اصول کو عملاً برت کر دکھا دیا گیا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ ہر انسان یکساں عزت کا مستحق ہے۔ اور ہر انسان سے یکساں گرفت کی جائے گی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

اسلام کی تاریخ اس عمل نمونہ کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ اسلامی تاریخ کی کسی بھی کتاب میں ان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں چند واقعات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ زینب بنت جحش (وفات ۲۰ھ) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ قدیم زمانہ میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی کا نکاح کسی غلام کے ساتھ ناقابل تصور تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو توڑنے کے لیے یہ فیصلہ فرمایا کہ زینب کا نکاح ایک غلام کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ ایک حبشی غلام زید بن حارثہ کے ساتھ آپ نے سیدہ زینب کا نکاح کر دیا۔ قدیم زمانہ میں یہ انتہائی انوکھا واقعہ تھا۔ کیوں کہ غلام کا نکاح آزاد سے کرنا قدیم زمانہ میں بالکل ناقابل تصور تھا۔ [illegible]

۲۔ کعبہ ایک مقدس عبادت خانہ تھا۔ اس کی چھت پر صرف شریف قبیلہ کے افراد ہی چڑھ سکتے تھے۔ پست طبقہ کے کسی فرد کا کعبہ کی چھت پر چڑھنا قدیم زمانہ کے لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔ مکہ فتح ہوا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو اس طرح توڑا کہ حبشی غلام بلال بن رباح کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھیں اور اس کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دیں۔

یہ عرب کی تاریخ میں (اور ساری قدیم دنیا کی تاریخ میں) انوکھا واقعہ تھا۔ اگر اسلام غالب نہ آچکا ہوتا تو اس "گستاخی" پر یقیناً لوگ بلال کو مار ڈالتے۔ تاہم ان کے سخت تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے انھیں کتنا سخت جھٹکا لگا تھا۔ مکہ کے عتاب بن اسید نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ مر گیا اور آج وہ اس منظر کو دیکھنے کے لیے موجود نہیں (الحمد للہ الذی قبض ابی حتی لا یری ھذا الیوم) الحارث بن ہشام نے کہا کہ کیا محمد کو اس کالے کوّے کے سوا کوئی اور موذن نہیں ملتا تھا (ما وجد محمد غیر ھذا الغراب الاسود موذنا) (الجامع لاحکام القرآن ۱۶/۳۴۱)

۳۔ خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کی ایک زرہ گم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ کوفہ کے ایک نصرانی کے یہاں برآمد ہوئی۔ یہ معاملہ وقت کے قاضی شریح بن الحارث کی عدالت میں پیش ہوا۔ علی بن ابی طالب عام شہری کی طرح ان کی عدالت میں گئے۔ حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے کو گواہی میں پیش کیا تو قاضی نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں۔

خلیفہ وقت عدالت سے اپنا مقدمہ ہار گئے۔ تاہم نصرانی اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ اسلام

کی عدالت میں خلیفہ اور عام شہری کے درمیان اس قدر برابری کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس نے خود سے اقرار کر لیا کہ مدعی طالب سچے ہیں اور یہ زرہ واقعۃً انھیں کی ہے۔ یہ میری نہیں (عظمت صحابہ ۲۳-۲۴)

۴۔ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ مصر کے حاکم عمرو بن العاص کے لڑکے محمد بن عمرو ایک قبطی پر غصہ ہو گئے اور اس کو کوڑے سے مارا۔ یہ قبطی مصر سے چل کر مدینہ آیا اور عمر فاروق سے فریاد کی۔ عمر فاروق نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ محمد بن عمرو نے اس کو ناحق مارا ہے۔ انھوں نے فوراً اپنا آدمی مصر بھیج کر حاکم مصر اور ان کے لڑکے کو بلایا۔ جب وہ آ گئے تو قبطی سے کہا کہ ان کو مارو۔

قبطی نے حاکم مصر کی موجودگی میں ان کے لڑکے کو مارنا شروع کیا اور ان کو لہولہان کر دیا۔ جب وہ پوری طرح مار چکا تو عمر فاروق نے عمرو بن العاص اور محمد بن عمرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا (عظمت صحابہ ۴۰-۴۱)

۵۔ فلسطین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں فتح ہوا۔ مفتوحہ قوم سے معاہدہ طے کرنے کے لیے مقرر ہوا کہ خلیفہ خود فلسطین آئیں۔ عمر فاروق مدینہ سے روانہ ہوئے۔ وہ اس طرح چلے کہ ان کے جسم پر معمولی کپڑا تھا اور ایک خادم اور ایک اونٹ۔ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ اگر میں تنہا اونٹ پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اگر تم اونٹ پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کرو گے۔ اور اگر ہم دونوں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ جائیں تو ہم اونٹ کے اوپر ظلم کریں گے۔ بہتر ہے کہ ہم تینوں باری مقرر کر لیں۔

چنانچہ تین باری مقرر ہوئی ایک بار عمر فاروق بیٹھتے اور خادم پیدل چلتا۔ پھر خادم بیٹھتا اور عمر فاروق پیدل چلتے۔ اس کے بعد اونٹ خالی رہتا اور دونوں پیدل چلتے۔ خلیفہ دوم اس طرح سفر کرتے ہوئے مدینہ سے فلسطین پہنچے۔ (تعمیر کی طرف ۵۶-۵۷)

اسلام نے اس طرح اپنے فکری انقلاب اور اپنے عملی نمونوں کے ذریعہ ایک ایسی تاریخ پیدا کی جس نے زمین کے تقریباً تمام آباد حصہ کو متاثر کیا۔ یہ انقلاب اتنا طاقت ور تھا کہ اس کے اثرات ہزار سال بعد تک بھی ختم نہ ہو سکے۔

اسلامی انقلاب کی ہمہ گیری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ اور تابعین کا زمانہ اسلام میں زرّیں زمانہ ہے۔ اس زمانہ

میں اسلام کی اقدار بھی اسی طرح سماج کے اوپر چھائی رہیں۔ بعد کی نسلوں میں جب اس انقلاب کے اثرات کم ہوئے اس وقت بھی ماحول میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آسکی۔ حتی کہ مسلم بادشاہوں کو بھی اسی عصری ماحول کی بنا پر بغاوت کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

اسلام کے ذریعہ توحید کا جو انقلاب آیا اس نے خدا کا رب ہونا اور انسان کا صرف عبد ہونا اتنے طاقت ور انداز میں لوگوں کے ذہنوں پر رائج کر دیا کہ کسی کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ دولت یا اقتدار پاکر اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ و ارفع سمجھنے لگے، جیسا کہ پچھلی تاریخ میں ہوا کرتا تھا۔

نصر بن احمد بن اسد بن سامان (م ۲۷۹ھ) دولت السامانیہ (Samanids) کا بانی ہے۔ یہ حکومت ایران یا ماوراء النہر (Transoxania) میں ۸۱۹ء سے ۹۹۹ء تک قائم رہی۔

سلطان نصر نے جب نیشاپور کو فتح کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو وہاں اس نے ایک شاندار دربار منعقد کیا۔ تخت نشینی کی رسم کے افتتاح کے لیے ایک حافظ سے تلاوت کرائی گئی۔ وہ تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے : یوم هم بارزون لا یخفی علی اللہ منهم شیء۔ لمن الملک الیوم۔ للہ الواحد القهار (المومن ۱۶) حافظ قرآن نے جب یہ آیت پڑھی تو اس کو سن کر سلطان نصر کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی۔ شدتِ احساس کے تحت وہ تخت سے نیچے آگیا۔ اس نے تاج کو اپنے سر سے اتارا اور زمین پر سجدہ میں گر گیا۔ اس نے کہا : اے میرے رب، بلاشبہہ بادشاہی تیری ہے نہ کہ میری۔

قدیم زمانہ شاہی مطلق العنانی کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے غالب فکر میں بادشاہ کی برتری اور بقیہ انسانوں کی کمتری ایک مسلّمہ کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ اس کا اثر عملی واقعات پر پڑتا تھا۔ اسلامی انقلاب نے شخصی بڑائی کے دور کو ختم کیا۔ اس نے انسانی برابری کے تصور کو ایک مسلّمہ کی حیثیت سے تاریخ میں رواج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی اعمال اس فکر کے زیرِ اثر انجام پانے لگے۔

پوری اسلامی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں موضوع کی نسبت سے میں دورِ آخر کے ایک واقعہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ مغل بادشاہ جہانگیر کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو مورخ اسلام مولانا شبلی نعمانی نے "عدل جہانگیری" کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ یہ پوری نظم اگلے صفحہ پر نقل کی جارہی ہے :

مطابق عوام کے لیے ایک قانون تھا اور بادشاہوں اور اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے لیے دوسرا قانون۔ بادشاہ کی زبان قانون ہوتی تھی۔ وہ ہر قانون سے بالاتر تھا۔ یہ اسلام ہے جس نے معلوم تاریخ میں پہلی بار قانون کی اس تقسیم کو توڑا اور تمام لوگوں کے لیے یکساں قانون جاری کیا۔ اب شاہی قانون (rule of king) ختم ہو گیا اور ہر آدمی بشمول بادشاہ قانون کی حکمرانی (rule of law) کے تحت آگیا۔

تاریخ پر اثرات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری سال حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر آپ نے وہ خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے جو تاریخی اعلانات فرمائے ان میں سے ایک اعلان یہ تھا :

الا کل شیئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع۔ — سن لو، جاہلیت کے معاملہ کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے پامال کر دی گئی۔

ان الفاظ میں آپ نے ایک نئے دور کا اعلان فرمایا جو اللہ کی مدد سے آپ کے ذریعہ تاریخ انسانی میں ظاہر ہوا۔ آپ کے ذریعہ تاریخ میں وہ اسباب پیدا کیے گئے جس کے بعد یہ ناممکن ہو گیا کہ کوئی جاہلی طریقہ انسانی زندگی میں اپنی جڑ قائم کر سکے۔

اسلام عرب سے نکل کر مختلف ملکوں میں پھیلا۔ دنیا کا بہت بڑا حصہ اہل اسلام کے زیر اقتدار آگیا۔ مگر کہیں بھی وہ نسلی تفریق ظہور میں نہ آسکی جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے عروج کے زمانہ میں پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں افریقہ کے بیشتر باشندوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہ سب سیاہ فام تھے اور اسلام سے پہلے انھیں پیدائشی غلام سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔ اسلام میں داخل ہو کر وہ یکساں طور پر اسلامی برادری کا حصہ بن گئے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے افریقہ اور دوسرے علاقوں میں اسلام کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ مسلم ملکوں میں سے کسی ملک میں بھی نسل کی بنیاد پر ذات کا نظام کبھی قائم نہ ہو سکا :

Nonc of the Muslim countries ever developed a racial caste system. (15/361)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا ظہور دنیا میں ایک سماجی انقلاب کا ظہور تھا۔ یہ تاریخی تبدیلی اولاً عرب اور اطراف عرب میں آئی۔ اس کے بعد اس کے اثرات تمام دنیا میں پھیل گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انسانی سماج سے آزاد اور غلام کی تقسیم ہمیشہ کے لیے نابود ہو گئی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے دنیا میں قانون کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ سماجی نابرابری یا سماجی ناانصافی کو جائز ٹھہرانے والے تمام فلسفے دنیا سے ختم ہو گئے۔

یہ تاریخی تبدیلی اس حد تک موثر ہوئی ہے کہ اب اگر کوئی سرپھرا شخص دوبارہ انسانیت کے بارہ میں اس قسم کا تفریقی نظریہ لے کر اٹھتا ہے تو وہ اپنے آپ مٹ کر رہ جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال ہٹلر (۱۸۸۹-۱۹۴۵) ہے۔ ہٹلر کے نزدیک جرمن نسل سب سے عظیم (greatest) نسل تھی۔ اس نے کہا کہ جرمن نسل کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ تمام دوسری قوموں کے اوپر حکومت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ نسلوں اور افراد کے درمیان نابرابری ایک ناقابل تغیر فطری نظام ہے۔ اس نے آرین نسل کو انسانیت کا واحد تخلیقی عنصر قرار دیا:

He regarded inequality between races and individuals as part of unchangeable natural order and exalted the Aryan Race as the sole creative element of mankind. (8/967)

مگر ہٹلر کا انجام کیا ہوا۔ وہ وقتی طور پر یورپ میں ابھرا۔ مگر آخر کار وہ خود اپنے ملک میں تنہا رہ گیا اور مایوسی کے عالم میں برلن کے ایک بنکر میں خودکشی کر لی۔ اس کے بعد وہ بھی مٹ گیا اور اس کی اٹھائی ہوئی نازی تحریک بھی ختم ہو گئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سماجی انقلاب برپا کیا، اس کے اثرات براہ راست طور پر مسلم قوموں میں سفر کر رہے ہیں اور بالواسطہ طور پر سارے عالم انسانی میں۔

فرق کا سبب

سوشل جسٹس یا مساوی انصاف (equal justice) کے بارہ میں محققین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مقصد اگر حقیقی طور پر کسی نظام میں حاصل ہوا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بیان سوامی ویویکانند کا ہے جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ اس انسانی مقصد کو حاصل

کرنے میں صرف اسلام ہی کیوں کامیاب ہو سکا۔ دوسرے نظام یا مذہب اس مقصد کے حصول میں ناکام کیوں ہو گئے۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ دونوں کو واضح کرنے کے لیے یہاں ہم ہندوازم اور مسیحیت کی مثال دیں گے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام میں انسانی برابری کے حق میں ایک مکمل آئیڈیالوجی پائی جاتی ہے۔ جب کہ دوسرے کسی نظام میں ایسی آئیڈیالوجی موجود نہیں۔ مثال کے طور پر ہندوازم، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، عین اپنے عقیدہ کی رو سے انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کی عین فلاسفی کا یہ تقاضا ہے کہ انسانوں میں ایک گروہ کو اونچا درجہ ملے، اور دوسرے کو نیچے درجہ کی مخلوق سمجھا جائے۔ اس عقیدہ کی موجودگی میں دونوں گروہوں سے برابر کا معاملہ کیا جانا ممکن نہیں۔ جو لوگ اس اعتقادی نظام سے متاثر ہوں وہ کبھی ان لوگوں کو اپنا مساوی نہیں سمجھ سکتے جن کو وہ بظاہر اپنے سے کمتر دیکھ رہے ہوں۔

یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ ۱۹۵۳ میں پریسیڈنٹ آف انڈیا نے بیک ورڈ کلاسز کمیشن (Backward Classes Commission) مقرر کیا تھا۔ اس کے چیرمین کاکا صاحب کالیلکر تھے۔ اس کمیشن نے مفصل جائزہ کے بعد ۱۹۵۵ میں اپنی ۲۶۲ صفحہ کی رپورٹ پیش کی جو گورنمنٹ پریس سے ۱۹۵۶ میں شائع ہوئی۔ یہ مطبوعہ رپورٹ دہلی پبلک لائبریری میں موجود ہے اور میں نے وہیں سے لے کر اس کو پڑھا ہے۔

اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بھارت میں ذات پات کا جو نظام پایا جاتا ہے وہ بقیہ دنیا سے بالکل الگ نوعیت کا ہے۔ یہ صرف معاشی اسباب سے نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے اسباب زیادہ گہرے ہیں۔ اس کی جڑیں بھارت کے اقتصادی نظام میں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ صرف انڈیا کی خصوصیت ہے کہ اس نے سماجی نابرابری کو انسانی فطرت میں شامل قرار دیا۔ اس نے مذہبی اور روحانی پس منظر میں اس کو ایک پُراسرار ادارہ کی حیثیت دیدی :

It is the peculiarity of India that it recognised the social differences inherent in human nature and gave them an institutional and mystic form with a religious and spiritual background. (p.14)

کمیشن نے جو بات کہی وہ عین مطابق واقعہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیا میں اونچ نیچ کو پیدائشی فرق کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق یہ ایک حق اور ناگزیر فطری حقیقت ہے۔ اور جہاں ایسا عقیدہ پایا جائے وہاں فرق کو مٹانے یا سب کو یکساں انصاف دینے کا ذہن ہی سرے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں دوسری رکاوٹ کی مثال مسیحیت کے نظام میں نظر آتی ہے۔ یہاں میں ایک رپورٹ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ریویو (۲۲ دسمبر ۱۹۹۱) میں چھپی ہے۔ یہ رپورٹ پانچ کرسچین جرنلسٹوں کی ایک ٹیم نے تیار کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق، انڈیا میں مسیحی فرقہ کی جو تعداد ہے اس میں ۵۰ فی صد سے زیادہ نچلے طبقہ کے لوگ ہیں جن کو دلت کرسچین (Dalit Christians) کہا جاتا ہے۔ وہ اب تک چرچ کی طرف سے امتیازی سلوک کا شکار ہو رہے ہیں:

Those who came over from the backward Hindu strata still find themselves bogged down in discrimination from the church.

دلت کرسچین کا مُردہ شخص "اپر کاسٹ کرسچین" کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا۔ اس کا نکاح اونچے طبقہ کے مسیحیوں میں نہیں ہو سکتا۔ چرچ میں ان کے لیے علٰحدہ نشست ہوتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ چرچ کے اعلیٰ عہدے ان کو نہیں دیے جاتے۔ کیرلا میں مسیحیت دو ہزار سال سے ہے مگر اب تک وہاں یہ تفریق پائی جاتی ہے۔ برابری کا درجہ (equal status) نہ ملنے کی وجہ سے دلت کرسچین میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب تک چھ ہزار مسیحی اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں چلے گئے۔

مدراس کے کیتھولک آرک بشپ (Dr Casmur Guanadickman) سے اس سلسلہ میں سوال کیا گیا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ چرچ کے نظام میں طاقتور کاسٹ سسٹم (strong caste system) موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ یہ الٹی طرف قدم ہے۔ مگر بعض اوقات عقیدہ کی طاقت حقیقت کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوتی:

I agree, it was a retrograde step. But sometimes the power of faith cannot break reality.

مسیحیت کا عقیدہ نابرابری یا سماجی بے انصافی کی تعلیم نہیں دیتا۔ مگر مسیحیت کی کمی یہ ہے کہ اس کے یہاں اس عقیدہ کی پشت پر مساوات کا کوئی طاقت ور تاریخی نمونہ موجود نہیں۔ حضرت مسیح کا مشن دعوت کے مرحلہ ہی میں ختم ہو گیا۔ وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچا۔ اس لیے مسیحیت کے دور اول میں مساوات کا طاقت ور عملی نمونہ بھی قائم نہ ہو سکا۔ ایسی حالت میں صرف عقیدہ عملی تبدیلی لانے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کا معاملہ مذکورہ دونوں نظاموں کے برعکس یہ ہے کہ اس کے یہاں مساوات اور برابری کے سلوک کے حق میں ایک مکمل آئیڈیالوجی موجود ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام میں ایک انتہائی کامل اور معیاری عملی نمونہ موجود ہے۔ اسلام کے دور اول کی تاریخ میں ان دونوں چیزوں کی موجودگی نے ہمیشہ کے لیے اسلام کی تاریخ کا رخ متعین کر دیا ہے۔ اب اسلامی تاریخ کو اسی رخ پر سفر کرنا ہے۔ کوئی اور رخ اتنا طاقت ور نہیں ہو سکتا کہ وہ اسلام کی تاریخ کے سفر کو اس کی طرف موڑ دے۔

اسلام کی یہ خصوصیت تمام انسانوں کے لیے رحمت ہے۔ وہ ساری قوموں کے لیے امید کی روشنی ہے۔ اس معاملہ میں اگر تعصب کو دخل نہ دیا جائے اور اسی طرح کھلے ذہن کا ثبوت دیا جائے جو مذہب کے علاوہ تمام سیکولر باتوں کے لیے ہمیشہ اختیار کیا جاتا ہے تو اچانک لوگوں کو معلوم ہو کہ اسلام کی صورت میں یہاں خداوند عالم کی ایک عظیم رحمت خدا کے تمام بندوں کے لیے موجود ہے۔

اسلام کسی گروہ کی قومی روایت نہیں۔ حتی کہ وہ دوسرے مذاہب سے الگ کوئی انوکھا مذہب بھی نہیں۔ وہ پچھلے مذاہب ہی کا محفوظ اور مستند اڈیشن ہے۔ وہ ہر ایک کی فطرت کی آواز ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو اسلام ہر آدمی کو خود اپنا اثاثہ معلوم ہو گا۔ اسلام کو پانا اس کے لیے ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی شخص خود اپنی ایک کھوئی چیز کو از سر نو پا جائے۔

طلاق اسلام میں

یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر ایک ساتھ زندگی گزاریں۔ اسلامی شریعت میں اس کے لیے نکاح کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کے مطابق، نکاح ایک معاشرتی عہد (civil contract) ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کی باہمی رضامندی (mutual consent) سے وقوع میں آتا ہے۔

نکاح کا یہ عمل ایک اعتبار سے خاندانی زندگی کی تعمیر ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے وہ پورے انسانی سماج کی تربیت ہے۔ عورت اور مرد اگر اپنی شادی شدہ زندگی میں اچھی بیوی اور اچھے شوہر ثابت ہوں تو یقینی طور پر وہ وسیع تر سماج کے لیے بھی اچھے شہری ثابت ہوں گے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے (خیرکم خیرکم لاھلہ) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح

شادی شدہ زندگی کی یہی خاص اہمیت ہے جس کی بنا پر اسلام میں اس رشتہ کو نہایت مقدس قرار دیا گیا ہے، اور اس کی پائداری اور خوش گواری کے لیے تفصیلی احکام مقرر کیے گئے ہیں۔ تاہم زیادہ قانونی بندش بغاوت کا ذہن پیدا کرتی ہے۔ اس لیے اسلام میں فطری حد تک ضروری قانونی بندش مقرر کرنے کے بعد یہ کوشش کی گئی ہے کہ انسانی ارادہ کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو صحیح مطلوبہ حد کے اندر قائم رکھے۔

خاندان دراصل تربیتِ انسانی کا ابتدائی یونٹ ہے۔ خاندان کے ادارہ کا ٹوٹنا تربیتِ انسانی کے ادارہ کا ٹوٹنا ہے۔ اگر خاندان کا ادارہ بار بار ٹوٹنے لگے تو اس کا یہ عظیم نقصان ہوگا کہ تربیتِ افراد کا وہ کام ہونے سے رہ جائے گا جس کے اوپر انسانیت کی تعمیر کا انحصار ہے۔

اسلامی شریعت میں اس سلسلہ میں طلاق کے لیے جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ بنیادی طور پر طلاق کو روکنے کے لیے ہیں نہ کہ طلاق کو وقوع میں لانے کے لیے۔ شریعت کی ساری کوشش یہ ہے کہ طلاق کے عمل کو روکا جائے۔ عورت اور مرد جب ایک بار رشتۂ

نکاح میں منسلک ہو کر ایک خاندان بنائیں تو وہ آخر وقت تک اس کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے رشتۂ نکاح کو قرآن میں میثاق غلیظ (النساء، ۲۱) کہا گیا ہے، یعنی پختہ عہد۔

نکاح زندگی کا ایک عمومی قانون ہے اور طلاق صرف ایک استثناء ہے۔ اسی لیے اسلام میں نکاح کو انتہائی پسندیدہ چیز قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

النکاحُ من سنتی فمن لم یعمل بسنتی فلیس منی (سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح)

نکاح میرا طریقہ ہے۔ پس جو شخص میرے طریقہ پر عمل نہ کرے وہ مجھ سے نہیں۔

طلاق کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، اسلام میں اگرچہ طلاق کی اجازت ہے مگر اس کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ اس کو صرف انتہائی ناگزیر حالت میں استعمال کیا جائے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلاق اگرچہ حلال ہے مگر وہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض حلال ہے (ابغضُ الحلالِ إلی اللهِ تعالیٰ الطلاقُ) سنن ابی داؤد، ابواب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق

۱۔ جب ایک مرد اور ایک عورت شوہر اور بیوی کی حیثیت سے مل کر ساتھ رہتے ہیں تو، فطرت کے عام قانون کے تحت، دونوں کے درمیان اختلافات بھی ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک حیاتیاتی اور نفسیاتی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر مرد اور پیدا ہونے والی ہر عورت ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے اس دنیا میں اتحاد کی ایک ہی ممکن صورت ہے ——— اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا۔

شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے مل کر رہنے کا یہ مقصد کس طرح حاصل ہوگا، اس کا راز، ایک لفظ میں صبر ہے۔ صبر کا مزاج ہی واحد چیز ہے جو دو شخصوں کے درمیان مشترک اور متحد زندگی کو ممکن بناتا ہے۔ جب انسانی فطرت کے تحت شکایت کے اسباب کا پیش آنا لازمی ہو، اور اسی کے ساتھ عورت اور مرد کی مشترک زندگی بھی ایک لازمی انسانی ضرورت ہو تو عملی طور پر اشتراک اور اتحاد کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دونوں صبر د

اعراض کو زندگی کے ایک مستقل اصول کے طور پر اختیار کریں۔

کسی بھی سماج میں طلاق کے جو واقعات ہوتے ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۹۰ فی صد طلاق کے واقعات کا سبب "زبان درازی" ہے۔ کسی بات پر عورت یا مرد کو غصہ آگیا یا کوئی بات اس کو ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کے بعد اس کی زبان سے سخت الفاظ نکل گئے۔ دوسرا فریق اس کو نظر انداز نہ کر سکا، اس نے بھی جواب میں سخت جملہ کہہ دیا۔ اب تلخ تکرار کی نوبت آگئی۔ اس تلخی کے زیر اثر مرد نے کہہ دیا کہ تم کو طلاق۔ یا عورت نے کہہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ طلاق یا علٰحدگی کا سبب زیادہ تر اسی قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مومن مرد اور مومن عورت کی صفات بتاتے ہوئے ایک صفت والصابرین والصابرات (الاحزاب ۳۵) کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کے مطابق، مرد کو بھی صبر کی روش اختیار کرنا ہے اور عورت کو بھی صبر کے طریقہ پر قائم رہنا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کرنا ہے۔ اگر وہ صبر و برداشت کی روش اختیار نہ کریں تو ان کا باہمی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور باہمی رشتہ ٹوٹنے کے بعد دونوں کو اس سے زیادہ بڑی بات برداشت کرنی پڑے گی جو رشتہ کو باقی رکھنے کی صورت میں انھیں برداشت کرنے کی ضرورت تھی۔

زوجین کو صبر و برداشت کی عام تلقین کے علاوہ اس سلسلہ میں بعض خصوصی ہدایتیں بھی احادیث میں دی گئی ہیں جو نکاح کے بندھن میں پائداری کے لیے ضروری ہیں۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا يَفرَكْ مؤمنٌ مؤمنةً إن كَرِهَ منها خُلُقاً رَضِيَ منها آخَرَ۔
(صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء)

کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی عادت اس کو بری لگے تو اس میں دوسری عادت ہوگی جو اس کو خوش کر دے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر آدمی کے اندر کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں اور اسی کے ساتھ کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو اس کی کمزوری کہا جاسکتا ہے۔ یہی معاملہ شوہر اور بیوی کا بھی ہے۔ ایسی

حالت میں دونوں کے درمیان نباہ کا فطری اصول یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی شخصیت کے اچھے پہلو کو یاد رکھیں، اور دونوں ایک دوسرے کے کمزور پہلو کو نظر انداز کرتے رہیں۔ اگر عورت اور مرد اس معاملہ میں باشعور ہو جائیں اور اس کو ایک اصول کے طور پر اپنی زندگی میں اختیار کرلیں تو یقیناً وہ ان کے لیے پائدار ازدواجی زندگی کی ضمانت بن جائے گا۔

۲۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مذکورہ تدبیر کافی نہیں ہوتی۔ شوہر اور بیوی کے درمیان ایسی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو بظاہر اس سے زیادہ سخت ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس قسم کی صورت پیش آنے کے بعد بھی یہ صحیح نہیں ہے کہ جہاں ایسا ہو فوراً طلاق دے کر علاحدگی اختیار کر لی جائے۔ اس کے بجائے تحمل سے کام لیتے ہوئے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہم کو حسب ذیل آیت میں رہنمائی دی گئی ہے:

والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن فان اطعنکم فلا تبغوا علیهن سبیلا (النساء ۳۴)	اور جن عورتوں سے تم کو نافرمانی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام کی راہ تلاش نہ کرو۔

کسی مرد کو اگر اپنی بیوی سے شکایت پیدا ہو تو اس کے لیے پہلا کام طلاق دینا نہیں ہے، بلکہ عورت کو نصیحت کرنا ہے۔ یعنی نرمی، سنجیدگی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کو سمجھایا جائے۔ نفرت کے جواب میں نفرت نہ کی جائے بلکہ نفرت کے جواب میں محبت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اگر نصیحت بے اثر رہ جائے تو اس کے بعد شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ ترک کلام یا ترک صحبت کا تجربہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس میں بھی انتقام کا جذبہ ہرگز شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو مکمل طور پر اصلاح اور تربیت کے ذہن کے تحت انجام دینا چاہیے۔

اگر بالفرض کوئی عورت ایسی ہے جس کے لیے نصیحت اور ترک تعلق کی تدبیریں غیر موثر ثابت ہوئی ہیں تو اس کے بعد اجازت ہے کہ مرد اس کو ہلکی سزا دے سکتا ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ضرب (مارنے) کی اجازت صرف اختلاف یا شکایت پہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ نشوز پر ہے۔ نشوز کی تشریح حدیث میں معروف میں نافرمانی سے کی گئی ہے (اضربوھن اذا عصینکم فی المعروف) نیز یہ کہ اس ضرب کو بے تکلیف کی مار (ضربا غیر مبرح) ہونا چاہیے۔ بے تکلیف کی مار کیا ہے، اس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ مسواک (ٹوتھ برش) یا اس جیسی کسی چیز سے مارنا (بالسواک ونحوہ)

جامع البیان للطبری ۵/ ۶۷ — ۶۹

۴۔ زوجین میں اختلاف ظاہر ہو تو کوشش یہ ہونا چاہیے کہ دونوں آپس ہی میں صلح کرلیں۔ کیونکہ صلح کا طریقہ اللہ کے نزدیک ہر حال میں بہتر ہے (والصلح خیر، النساء ۱۲۸) اور اگر گھریلو سطح پر معاملہ ختم نہ ہو تب بھی طلاق کی بات نہیں کرنا ہے بلکہ ثالثی کے طریقہ پر اس کو حل کرنے کی کوشش کرنا ہے:

وان خفتم شقاق بینھما فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما۔ ان اللہ کان علیما خبیرا۔

(النساء ۳۵)

اور اگر تم کو دونوں کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک ثالث عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کردے گا۔ بے شک اللہ جاننے والا، باخبر ہے۔

دو شخصوں کی نزاع کو ثالث (arbiter) کے ذریعہ طے کرنے کا یہ اصول نہایت فطری اصول ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان جب اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں ایک دوسرے کے بارہ میں متاثر ذہن کے تحت سوچنے لگتے ہیں۔ وہ حقائق کی بنیاد پر بے لاگ رائے نہیں قائم کرپاتے ایسی حالت میں جھگڑے کو ختم کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرے فریق کو درمیان میں لایا جائے۔ یہ تیسرا فریق معاملہ سے ذاتی طور پر وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے گا اور ایسے منصفانہ فیصلہ تک پہنچ جائے گا جو دونوں کے لیے

قابل قبول ہو۔

جب معاملہ کو ثالث کے سپرد کر دیا جائے تو اس وقت عورت اور مرد کو کس ذہن کے تحت اس کا استقبال کرنا چاہیے، اس کا اندازہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

خلیفۂ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی جھگڑا ہوا۔ دونوں حضرت علی کے پاس آئے۔ آپ نے مذکورہ قرآنی آیت کے مطابق یہ حکم دیا کہ دونوں کے خاندان سے ایک ایک شخص کو لے کر ثالثی بورڈ بنایا جائے۔ یہ ثالثی بورڈ دونوں کے حالات معلوم کرنے کے بعد جو فیصلہ دے اس کو دونوں لازمۂ مان لیں۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فقالتِ المرأةُ رضيتُ بكتابِ اللهِ لِي وعليَّ۔ فقال الرجلُ (ما الفرقةُ) فلا۔ فقال عليٌّ كذبتَ، واللهِ لاتبرحُ حتّٰى ترضىٰ بمثلِ ما رضيتْ به

(جامع البیان للطبری، ۵/۱)

عورت نے کہا کہ میں راضی ہوں اللہ کی کتاب پر، خواہ فیصلہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مرد نے کہا کہ مگر تفریق کا فیصلہ مجھے منظور نہیں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ خدا کی قسم تم یہاں سے اٹھ نہیں سکتے جب تک تم اس طرح راضی نہ ہو جاؤ جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سچے مومن کے اندر یہ آمادگی ہونا چاہیے کہ وہ قرآنی حکم کے مطابق، ثالث کو مانے اور یہ بھی آمادگی ہونا چاہیے کہ ثالث جو فیصلہ دے اس کو وہ مزید بحث کے بغیر قبول کرلے۔

۴۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی کا نظام ہمیشہ مقرر انداز پر نہیں چلتا۔ چنانچہ سارے تحفظات کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ کچھ شادی شدہ جوڑے شادی کے بعد علاحدگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر نکاح کے بعد طلاق کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں شریعت ان کی رہنمائی اس طرح کرتی ہے کہ ان کے لیے طلاق کا ایک متعین ضابطہ مقرر کرتی

ہے۔ یہ ضابطہ قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسریح باحسان (البقرہ ۲۲۹)

طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اسلوبی کیساتھ رخصت کر دینا۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص (دو مہینہ میں) دو بار طلاق دیدے تو وہ تیسری بار طلاق دینے میں اللہ سے ڈرے۔ یا تو وہ اس کے حق میں کوئی کسی ظلم کیے بغیر اس کو چھوڑ دے، یا اس کو حسن معاشرت کے ساتھ روک لے (ای من طلّق اثنتین فلیتق اللہ فی الثالثۃ فاما ترکھا غیر مظلومۃ شیئا من حقھا واما امسکھا محسنا عشرتھا) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳/۱۲۶

اس آیت اور دوسری آیات و احادیث کی روشنی میں علماء شریعت نے طلاق کا تفصیلی قانون مرتب کیا ہے، اس سلسلہ میں فقہی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے بنیادی شرعی پوزیشن یہ ہے کہ اپنے مراحل کے اعتبار سے طلاق کی تین صورتیں ہیں ——— طلاق رجعی، طلاق بائن، طلاق مغلظ۔

جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کہ اچانک اس کو مطلقہ قرار دے کر اسے اپنے سے جدا کر دے۔ بلکہ اس کو یہ کرنا چاہیے کہ پہلے مہینہ میں حیض سے پاک ہونے کے بعد وہ اپنی عورت سے کہے کہ میں نے تم کو ایک طلاق دیا۔ اس کے بعد دونوں ایک مہینہ تک سوچتے رہیں۔ اس درمیان میں اگر رائے بدل گئی تو مرد اپنے قولِ طلاق کو واپس لے کر دوبارہ اپنی بیوی سے تعلقات قائم کر سکتا ہے۔

ایسا نہ کرنے کی صورت میں اگلے مہینہ میں دوبارہ طہر کی حالت میں وہ اپنی بیوی سے کہے گا کہ میں نے تم کو دوسری بار طلاق دیا۔ اس اثناء میں دوبارہ مرد کے لیے یہ موقع ہے کہ اگر اس کی رائے بدل جائے تو وہ طلاق کو واپس لے کر اپنی بیوی سے دوبارہ تعلقات قائم کر سکتا ہے۔
اصطلاح میں ان دونوں کو طلاق رجعی کہا جاتا ہے، کیوں کہ مرد کو ان سے مراجعت کا حق حاصل ہے۔

ابتدائی دو مہینوں میں مرد اگر اپنے قول سے رجوع نہ کرے اور تیسرا حیض آکر تیسرا مہینہ شروع ہو جائے تو اب عملی طور پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس کو طلاق بائن کہا جاتا ہے۔

طلاق بائن پڑ جانے کے بعد مراجعت کے لیے تنہا مرد کا قول کافی نہیں۔ اب صرف عورت اور مرد کی باہمی رضامندی سے نکاح ثانی ہو سکتا ہے۔ اگر دونوں نے نکاح ثانی کر لیا تو دوبارہ وہ شوہر اور بیوی کی طرح ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی تیسرے مہینہ میں یا اس کے بعد یہ کہہ دے کہ میں نے تم کو تیسری بار طلاق دیا۔ ایسا کہنے کے بعد آخری طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس کو طلاق مغلظ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لیے حرام ہو جائیں گے۔ البتہ اگر حلالہ کی صورت پیدا ہو جائے تو دوبارہ ان کے درمیان نکاح ہو سکتا ہے۔

شوہر اگر دوسری بار طلاق دینے کے بعد اپنی بیوی سے مراجعت کا ارادہ نہ رکھتا ہو تب بھی اسے چاہیے کہ عورت کو اس کے حقوق دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ اسے رخصت کر دے۔ جہاں تک تیسری بار طلاق کا تعلق ہے تو شریعت نے اس کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ کیونکہ دو بار طلاق دے کر علحدہ ہو جانے کے بعد بھی یہ امکان باقی رہتا ہے کہ شوہر تجدید نکاح کے ذریعہ پھر اپنی سابقہ بیوی سے تعلق قائم کر لے۔ مگر تیسری بار طلاق دینے کے بعد مذکورہ استثنائی صورت (حلالہ) کے علاوہ اس مرد اور اس عورت کے درمیان نکاح مستقل طور پر حرام ہو جاتا ہے۔

مذکورہ مقرر طریقہ نے طلاق کو ایک جذباتی اقدام کے بجائے ایک سوچا سمجھا منصوبہ بند عمل بنا دیا۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ طلاق اکثر حالات میں غصہ کا نتیجہ ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ طریقہ طلاق کے خلاف ایک زبردست روک (check) ہے۔ کیونکہ غصہ کوئی مستقل باقی رہنے والی چیز نہیں۔ ایک مدت گزرنے کے بعد لازماً وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ تقریباً یقینی ہے کہ جو لوگ غصہ کی بنا پر اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کریں گے، وقت گزرنے کے بعد وہ خود ہی اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔ اور رجوع کر لیں گے۔ کیوں کہ طلاق کوئی سادہ بات نہیں۔ اکثر حالات میں وہ گھر کو اجاڑنے اور بچوں کے مستقبل کو تباہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی آدمی کو طلاق کا برا انجام دکھائی دے گا اور وہ رجوع کر کے اس سے باز رہے گا۔

آدمی جب ایک عورت سے نکاح کرتا ہے تو اس کے لیے صرف ایک بار یہ کہنا کافی ہوتا ہے کہ میں نے تم کو اپنی زوجیت میں قبول کیا۔ مگر طلاق کے لیے شریعت میں یہ حکم دیا گیا کہ تین مہینے کے دوران مرحلہ وار طریقہ پر بتدریج اس کو مکمل کرو۔

گویا نکاح کے لیے تو ایک قول کافی ہے مگر طلاق کے عمل کی تکمیل کے لیے کئی قول کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ نکاح کے برعکس، طلاق کے ایک قول اور دوسرے قول کے درمیان شریعت نے لمبا وقفہ (gap) دینا پسند کیا ہے۔ اس وقفہ کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ اس دوران شوہر اپنے فیصلہ پر اچھی طرح غور کر لے۔ وہ اپنے قریبی لوگوں سے اس کے بارہ میں بخوبی مشورہ کرے۔ حتی کہ اس کے متعلقین کو یہ موقع بھی مل جائے کہ جب انھیں طلاق کے معاملہ کی خبر ملے تو اس میں دخل دے کر وہ طرفین کو سمجھائیں اور طلاق کو رکنے کی کوشش کریں۔ یہ مقصد وقفہ کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے طلاق کو ایک باوقفہ عمل بنا دیا گیا۔

ان ساری پیش بندیوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ جذباتی ابال کو ٹھنڈا کیا جائے اور اس طرح طلاق کے معاملہ کو اس کے آخری انجام تک پہنچنے سے روکا جائے۔ کیوں کہ طلاق کسی بھی شخص کے لیے مسئلہ سے نجات کے ہم معنی نہیں ہے۔ طلاق اپنے انجام کے اعتبار سے صرف یہ ہے کہ آدمی ایک مسئلہ سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے آپ کو دوسرے شدید تر مسئلہ میں مبتلا کر لے۔

۵۔ ان ساری پیش بندیوں کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات جہالت یا شدید غصہ کی وجہ سے معتدل انداز میں سوچ نہیں پاتا۔ وہ جوش میں آکر ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم کو تین طلاق یا طلاق، طلاق، طلاق۔ ایسے واقعات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے۔ اور اب بھی پیش آتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص ایسا کرے اس کے بارہ میں کیا فیصلہ کیا جائے۔ یعنی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دے کر مذکورہ باوقفہ عمل جاری کرنے کی تلقین کی جائے۔ یا تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر میاں بیوی کے درمیان علاحدگی کرا دی جائے۔ اس سلسلہ کی ایک رہنما حدیث یہاں درج کی جاتی ہے جس کو امام ابوداؤد اور دوسرے کئی محدثین نے نقل کیا ہے:

عن عبد الله بن عباس قال، طلق ركانة بن عبد يزيد امرأته ثلاثا في مجلس واحد۔ فحزن عليها حزنا شديدا۔ فسأله النبي صلى الله عليه وسلم۔ كيف طلقتها۔ قال ثلاثا في مجلس واحد۔ فقال النبي صلى الله عليه وسلم۔ انما تلك واحدة فارتجعها إن شئت (فتح الباری ۹/۲۷۵)

رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دے دی۔ پھر وہ اس پر بہت غمگین ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم نے کس طرح طلاق دی۔ انھوں نے کہا کہ ایک مجلس میں تین بار۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سب ایک ہی ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنی بیوی سے مراجعت کر لو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہو کر ایک ہی مجلس میں تینوں طلاق دینے کا اعلان کر دیتا ہے تو اگرچہ یہ شریعت کے مقرر طریقہ سے انحراف ہے اور اس اعتبار سے وہ آدمی گنہ گار ہے، تاہم انسانی کمزوری کی رعایت کرتے ہوئے اس کے اس فعل کو ایک لغو فعل قرار دیا جائے گا۔ اس کو تاکیدِ بیان یا شدتِ اظہار پر محمول کرتے ہوئے تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا جائے گا۔ ایسے آدمی سے کہا جائے گا کہ ایک شرعی مسئلہ میں تم نے جو زیادتی کی ہے اس کے لیے اللہ سے توبہ کرو اور تین کو ایک شمار کرتے ہوئے حسب منشا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ کرو۔

۶۔ تاہم اس مسئلہ میں دور اول میں ایک مختلف مثال ملتی ہے۔ یہ مثال خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ مثال امام مسلم کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

عن ابن عباس، قالَ كانَ الطلاقُ على عهدِ رسول الله صلى الله عليه وسلم وأبي بكرٍ وسنتينِ من خلافةِ عمرَ طلاقُ الثلاثِ واحدةً۔ فقال عُمر بن الخطاب انّ الناسَ قد استعجلوا في أمرٍ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں اور عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہی طلاق ہوتی تھی۔ پھر عمر بن خطابؓ نے کہا کہ لوگ اُس معاملہ میں جلدبازی کر رہے ہیں جس میں ان کے لیے مہلت تھی۔

قد كانت لهم فيه أناة فلو أمضيناه عليهم فأمضاه عليهم (صحيح مسلم بشرح النووی ١٠/٧٠)

پس کیوں نہ اس کو ہم ان کے اوپر نافذ کردیں۔ چنانچہ انھوں نے ان کے اوپر اسے نافذ کردیا۔

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کا یہ عمل بظاہر قرآن و سنت کے طریقہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ شریعت کے عموم میں ایک وقتی استثناء کی مثال ہے نہ کہ شریعت کے عموم میں ترمیم کی مثال۔ خلیفہ دوم کے اس عمل سے شریعت کا مذکورہ مسئلہ نہیں بدلتا۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی میں حالات کی مکمل رعایت رکھی گئی ہے۔ شریعت کا ہر قانون ایک دائمی قانون ہے۔ مگر مسلمانوں کے حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی فرد کے کیس کی مخصوص نوعیت کی بنا پر اس کے حق میں ایک استثنائی فیصلہ کرے۔ تاہم حاکم کا یہ فیصلہ صرف ایک وقتی حکم ہوگا نہ کہ ابدی قانون۔

اس سلسلہ کی مختلف روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ دوم نے اپنے زمانہ کے جن چند افراد کیساتھ ایسا کیا وہ بطور شرعی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک قسم کے انتظامی حکم (executive order) کی تھی۔ انھوں نے حاکم کی حیثیت سے بعض متعین افراد کے لیے بطور سزا یہ حکم جاری کیا تھا۔

چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق رضؓ کے پاس ایسا کوئی آدمی لایا جاتا جس نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں بیک وقت تین طلاق دی تھی تو اس کو وہ اس کی سرکشی قرار دیتے اور اس کی پیٹھ پر کوڑا مارتے (عن انس ، ان عمر کان اذا اُتی برجل طلق امرأتہ ثلاثا اوجع ظہرہ) فتح الباری ۹/۲۷۵

،۔ یہاں ایک اور پہلو کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اس اضافہ کے بغیر یہ بات بالکل ادھوری رہے گی۔ وہ یہ کہ حضرت عمر نے جب تین طلاق کو تین طلاق قرار دینے کا مذکورہ استثنائی فیصلہ دیا تو ان کی حیثیت موجودہ زمانہ کے ایک بے اختیار عالم جیسی نہ تھی۔ بلکہ وہ مکمل طور پر ایک بااختیار حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ مسلّم طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ جو مرد اس قسم کا غیر قرآنی طریقہ اختیار کرے اس کو وہ سزا دیں، اس کو اور کوئی زیادتی کرنے سے روک سکیں۔

دوسری طرف وہ اِس بااختیار حیثیت میں تھے کہ اس حکم کے نفاذ کے نتیجہ میں جو عورت نئے مسائل حیات سے دوچار ہوئی ہے، اس کی بھی کامل تلافی کر سکیں۔ مثلاً سماج کے اندر اس کے لیے باعزت زندگی کی ضمانت، طلاق کے بعد اگر وہ معاشی اعتبار سے ضرورت مند ہوگئی ہے تو سرکاری بیت المال سے اس کے لیے مستقل گزارہ جاری کرنا، وغیرہ۔

آج اگر کوئی شخص تین طلاق کو نافذ کرنے کے لیے حضرت عمر فاروق کی نظیر پیش کرے تو اس سے پہلے اس کو خلیفہ جیسی بااختیار حیثیت کا مالک بننا چاہیے، اس کے بعد ہی اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ خلیفہ دوم کے اس مسلک کا حوالہ دے یا اس پر عمل کرے۔ کیوں کہ حضرت عمر کا مذکورہ فیصلہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حاکم وقت کا ایک فیصلہ تھا نہ کہ سادہ طور پر صرف عالم یا مفتی کا ایک فیصلہ۔

۸۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب اپنا مذکورہ فیصلہ دیا تو بعض روایت کے مطابق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے اختلاف کیا۔ بقیہ صحابہ جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے یا جن کے علم میں یہ بات آئی، انھوں نے اس سے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے کچھ علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے۔ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

واستدلوا باجماع الصحابة حين قضى به عمر بن الخطاب رضي الله عنه فاقروه عليه ولم ينكر احد من الصحابة وقوع الثلاث بلفظ واحد على عمر بن الخطاب فدل ذلك على الاجماع	اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ کیوں کہ جب حضرت عمر نے یہ فیصلہ دیا تو صحابہ نے اس سے اتفاق کیا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا کہ ایک بار میں تین طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس پر اجماع ہے۔
(روائع البیان ۱/۳۲۴)	

یہاں یہ سوال ہے کہ صحابہ نے کس چیز پر اتفاق کیا تھا۔ صحابہ نے اس پر اتفاق نہیں کیا تھا کہ تین طلاق کو تین طلاق قرار دینا اصولاً درست ہے۔ بلکہ ان کا اتفاق اس پر تھا کہ ایسا کرنا انتظاماً درست ہے۔

صحابہ کسی ایسی بات پر اتفاق نہیں کر سکتے تھے جو قرآن کے مقرر طریقہ کو بدلنے کے ہم معنی ہو۔ انھوں نے دراصل اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ بوقت ضرورت وہ استثنائی طور پر کسی فرد خاص کے بارہ میں اس طرح کا ایک فیصلہ دے جو فیصلہ خلیفہ دوم نے اپنے زمانہ میں دیا۔

صحابہ کا یہ اجماع ترمیم شریعت پر نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ اجماع صرف اس بات پر تھا کہ مسلمانوں کے حاکم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق کسی شخص خاص کے لیے ایک ایسے تعزیری حکم کا نفاذ کرے جو شریعت کے عمومی قانون میں ایک وقتی استثنار کی حیثیت رکھتا ہو۔ حاکم وقت کا یہ حق شریعت میں مسلّم ہے، اور نکاح وطلاق کے علاوہ دوسرے امور میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے قحط کے زمانہ میں چوری پر چور کا ہاتھ نہ کاٹنا۔

۹۔ آخری بات یہ کہ شریعت میں جس طرح مرد کو تفریق کا حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کو بھی تفریق کا حق حاصل ہے۔ البتہ عورت چونکہ پیدائشی طور پر جذباتی (emotional) واقع ہوئی ہے اس لیے دونوں کے طریق کار میں کسی قدر فرق رکھا گیا ہے۔ اس کی صورت مختصر طور پر یہ ہے کہ مرد کو تفریق کا جو اختیار طلاق کی صورت میں حاصل ہے، عورت کو وہی اختیار خلع اور تفویض طلاق کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرد اگر خلع کے لیے راضی نہ ہو تو عورت اپنے معاملہ کو قاضی کے پاس لے جائے گی اور قاضی پوری روداد سننے کے بعد حسب حالات دونوں کے درمیان تفریق کرا دے گا۔

اس کے علاوہ عورت کے لیے ایک اور صورت ہے جس کو نکاح تفویض کہا جاتا ہے۔ یعنی عورت نکاح کے وقت خود یا اپنے وکیل کے ذریعہ اپنے ہونے والے شوہر سے یہ باضابطہ عہد لے لے کہ شوہر اگر اس کے واجبی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہ ثابت ہو تو عورت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ خود اپنے فیصلہ سے اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج کو توڑ دے اور اس سے علاحدہ ہو جائے۔ اس کی مزید تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

خلاصۂ کلام

اوپر کی بحث سے معلوم ہوا کہ طلاق کے لیے شریعت کا مقرر طریقہ یہ ہے کہ طلاق الگ الگ

بتدریج دی جائے، اور دو لمبے وقفوں کے بعد مکمل ہو۔ یہی طلاق کا صحیح شرعی طریقہ ہے۔ تاہم ہر قانون کا غلط استعمال (misuse) ہوتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ طلاق کے قانون کا بھی غلط استعمال کرتے ہیں اور ایک ہی مجلس میں بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیتے ہیں۔

قانون کے اس طرح غلط استعمال کی صورت میں طلاق دینے والے کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، اس میں حسب حالات دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے تین طلاق کو لفظی تاکید پر محمول کرتے ہوئے اسے ایک ہی طلاق مانا جائے۔ اور اس کو رجعت کے حق سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی جائے۔

تاہم کسی شخص کو اس کے کیس کی مخصوص نوعیت کی بنا پر اس رخصت سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی سرکشی پر حاکم اسے تعزیری سزا دے سکتا ہے۔ یا اس کے تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی بھی کرا سکتا ہے، تاکہ وہ اپنے گھر کی بربادی کی صورت میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کی سزا بھگتے۔ نیز اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ایسے افراد کے انحراف کے برے انجام کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ وہ اس قسم کے فعل کو دہرانے سے باز رہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں حضرت عمر فاروق کا انتظامی حکم اس لیے نہیں تھا کہ اس کو عمومی شرعی مسئلہ کی مانند مستقل طور پر رائج کر دیا جائے۔ وہ صرف اس لیے تھا کہ معاشرہ میں شرعی طریقہ سے انحراف کی حوصلہ شکنی ہو اور مشروع طریقہ پر طلاق دینے کا رواج از سر نو لوگوں کے درمیان قائم ہو جائے۔ خلیفہ دوم کا حکم ایک وقتی استثناء تھا نہ کہ کوئی مستقل شرعی مسئلہ۔ یہ وقتی استثناء بشرطِ ضرورت آئندہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے جس طرح وہ ماضی میں اختیار کیا گیا۔

تاہم اس کا حق صرف با اختیار حاکم کو ہے۔ یہ دراصل ایک انتظامی حکم تھا، اور انتظامی حکم کا حق صرف منتظم کو ہوتا ہے، عام آدمی کو ہرگز اس کا حق حاصل نہیں۔ کیوں کہ عام آدمی ان نتائج سے نپٹنے پر قادر نہیں جو اس قسم کے کسی حکم کے نفاذ کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مسلمانوں کے جذبات کو مسلنے والا ماہنامہ

فروری ۱۹۹۴، شمارہ ۲۰۶

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi -110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)

رمضان کا روزہ

دہلی کے ایک مسلمان تاجر جناب محمد عثمان صاحب سے ۲۹ نومبر ۱۹۹۲ کو ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ روزہ ہر قسم کی ایمرجنسی کا سامنا کرنے کی تربیت ہے۔ روزہ کی اس تشریح کی تصدیق ایک حدیث سے ہوتی ہے جس میں روزہ کو صبر کا مہینہ (شہر الصبر) کہا گیا ہے۔ صبر کے اصل معنی ہیں رک جانا۔ صبر کا لفظ جزع کا نقیض ہے۔ الجوہری نے کہا کہ صبر کا مطلب ہے جزع کے وقت اپنے آپ کو تھامنا (الصبر حبس النفس عند الجزع)

زندگی میں ہمیشہ خلاف مزاج باتیں پیش آتی ہیں۔ زندگی نام ہے ناموافق باتوں کا سامنا کرتے ہوئے سفر حیات طے کرنے کا۔ جو آدمی جتنا زیادہ بامقصد اور جتنا زیادہ با اصول ہو اتنا ہی زیادہ اس کو اپنی پسند کے خلاف چیزوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس صفت کی ضرورت دنیوی معاملات میں بھی پیش آتی ہے اور دینی معاملات میں بھی۔ روزہ اسی قسم کی صابرانہ زندگی کی تربیت ہے۔ روزہ میں آدمی کے معمولات ٹوٹتے ہیں۔ وقت پر کھانا اور وقت پر سونا اس کو میسر نہیں آتا۔ مسلسل ایک مہینہ تک اس کو بھوک، پیاس، بے خوابی جیسے تجربات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ طبیعت کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے اس کے اندر جھنجلاہٹ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مگر اس پر بھی اس کو صبر کرلینا پڑتا ہے۔

برداشت کی اس زندگی کو خود اپنے ارادہ سے اختیار کرنے کا نام روزہ ہے۔ لوگ مجبورانہ صبر کرتے ہیں، روزہ دار اختیارانہ صبر کرتا ہے۔ جن چیزوں کو لوگ دباؤ کے تحت چھوڑتے ہیں، روزہ دار ان چیزوں کو اصول کی خاطر چھوڑ دیتا ہے۔ جس صابرانہ روش کو لوگ ذاتی مفاد کے لیے اختیار کرتے ہیں، اس صابرانہ روش کو روزہ دار خدا کی مرضی کے لیے اختیار کرتا ہے۔ دوسروں کا صبر اگر اپنی ذات کے لیے ہے تو مومن کا صبر خداوند ذوالجلال کے لیے۔ روزہ ایک بے روح رسم نہیں، وہ ایک زندہ تربیت ہے جس کا تعلق پوری انسانی زندگی سے جڑا ہوا ہے۔

رمضان کے مہینہ میں جو آدمی اس کورس کو صحیح طور پر مکمل کرے وہ اس کے بعد پورے سال کے لیے ایک ایسا انسان بن جائے گا جو ہنگامی حالات میں بھی معتدل زندگی گزارے، جو بے صبری کے مواقع پر بھی صابر انسان بنا رہے۔

مسئلہ یہاں ہے

اسپین کے جنوب مشرقی کنارے پر جہاں اٹلانٹک سمندر اور میڈیٹرینین سمندر ملتے ہیں، ایک پہاڑ ہے جو جبرالٹر کے نام سے مشہور ہے ۔ یہ اسلامی فوج کے مشہور سردار طارق بن زیاد کے نام پر ہے ۔ اس کے بارہ میں تاریخ میں یہ الفاظ لکھے گئے کہ جبرالٹر کا نام عربی لفظ جبل الطارق سے لیا گیا ہے ۔ یہ طارق بن زیاد کے اعزاز میں تھا جس نے ۷۱۱ء میں اس کو مسخر کیا تھا :

Its name is derived from the Arabic Jabal Tariq (Mt. Tarik) honouring Tariq ibn Ziyad, who captured the peninsula in AD 711. (8/156)

اب ایک اور پہاڑ کا قصہ دیکھئے جو اس کے تقریباً ساڑھے گیارہ سو سال بعد پیش آیا ۔ یہ اس پہاڑ کی بات ہے جو ماؤنٹ ایورسٹ کے نام سے مشہور ہے ۔ انڈیا کی سرحد پر واقع اس پہاڑی چوٹی کے بارہ میں قدیم انسان کو کچھ زیادہ معلوم نہ تھا ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۸۵۲ء میں پہلی بار ایک انگریز افسر نے حساب لگا کر بتایا کہ یہ کرہ ارض کی سب سے اونچی چوٹی ہے ۔ چنانچہ اس دریافت کے تیرہ سال بعد مذکورہ انگریز سر جارج ایورسٹ کے نام پر اس پہاڑ کا نام رکھا گیا ۔ وہ ۱۸۳۰ سے ۱۸۴۳ تک انڈیا کا سرویر جنرل تھا :

It wasn't until 1852 that British surveyors identified it as the highest point on the planet. As a result, thirteen years later. the mountain was named after Sir George Everest, who was Surveyor General of India from 1830 to 1843.

جبل الطارق اور ماؤنٹ ایورسٹ محض دو پہاڑوں کے نام نہیں ہیں ، یہ دو علامتی واقعات ہیں جو بتاتے ہیں کہ آٹھویں صدی میں مسلمان اعلیٰ اخلاقی اوصاف سے متصف تھے ، اس لیے پہاڑ کی چوٹیوں پر ان کا نام لکھا جاتا تھا ۔ انیسویں صدی میں مسلمان تنزل کا شکار ہو گئے اور اعلیٰ اخلاقیات کی یہ صفت یورپی قوموں میں چلی گئی ۔ چنانچہ اب پہاڑ کی چوٹیوں پر یورپی لوگوں کا نام لکھا جانے لگا ۔

اس دنیا میں بڑائی کسی قوم کا نسلی حق نہیں ۔ اس دنیا میں بڑائی اس کو ملتی ہے جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف کا ثبوت دے ۔ ماضی اور حال کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے ۔

دنیا منتظر ہے

واشنگٹن پوسٹ کے مطابق، اس وقت امریکہ میں دس کتابیں بہت زیادہ بکنے والی (bestseller) بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب یہ ہے :

The Politics of Rich and Poor, by Kevin Phillips

اس کتاب میں مصنف بتاتے ہیں کہ اس وقت امریکہ میں غیر مساویانہ آمدنی (income disparity) کا مسئلہ بہت شدت اختیار کر چکا ہے جس کو وہ دو ساحلی معاشیات (bicoastal economy) کہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا ہے کہ ایک طرف امریکہ میں ایک فی صد سپر مال دار (super rich) طبقہ ہے۔ اس کی آمدنی (\$5,50,000) ڈالر سالانہ ہے۔ دوسری طرف بقیہ لوگ ہیں جو یا تو بہت کم آمدنی پر زندگی گزارتے ہیں یا مذکورہ طبقہ کے مقروض ہیں۔ مصنف کہتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آخر میں اب ہمیں ایک نئی سیاسیات (new politics) کی ضرورت ہے جو نئے امریکہ کی تعمیر کر سکے۔

یہ امریکہ کا حال ہے جو آزاد معیشت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف سوویت روس کی مثال ہے جہاں مارکسی نظریہ کے مطابق پابند معیشت یا ریاستی معیشت کا تجربہ کیا گیا تھا۔ تمام ذرائع پیداوار افراد کے قبضہ سے نکال کر حکومت کے قبضہ میں دے دیے گئے۔ مگر اس تجربہ کے ستر سال بعد معلوم ہوا کہ اس نے تاریخ کی سب سے زیادہ برباد معیشت کے سوا انسانیت کو اور کہیں نہیں پہنچایا ہے۔ حتیٰ کہ آج روسی حکومت امریکہ اور دوسرے آزاد ملکوں سے ۲۰ بلین ڈالر قرض مانگ رہی ہے تاکہ وہ اپنی برباد معیشت کی دوبارہ تعمیر کر سکے۔

اس مسئلہ کا واحد حل ایک ایسا نظام ہے جو سود کے خاتمہ اور زکوٰۃ کی اقامت پر مبنی ہو۔ سود کا خاتمہ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت ایک محدود طبقہ میں جمع نہ ہونے پائے۔ اور زکوٰۃ اس بات کی ضمانت ہے کہ دولت کی گردش کسی سماج کے دونوں معاشی ساحلوں پر جاری رہے۔ مگر مسلمانوں کی نادانیوں نے لوگوں کی نظر میں اسلام کو ایک تخریبی نظریہ کی حیثیت دے رکھی ہے۔ آج کی دنیا یہ سوچ نہیں سکتی کہ اسلام کے پاس کوئی ایسا تعمیری نظریہ بھی ہو سکتا ہے جو وہ آج کی دنیا کو دے سکے۔

فطرت انسانی

لاہور کے اردو روزنامہ نوائے وقت کے شمارہ ۲۰ ستمبر ۱۹۹۲ میں ایک خبر چار سطری سرخیوں کے ساتھ چھپی ہے۔ اس میں بہت سبق ہے۔ وہ خبر نوائے وقت کے الفاظ میں یہ ہے:

سابق سوویت یونین کے تین جنگی قیدیوں نے رہائی کے بعد افغانستان سے اپنے وطن واپس جانے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ افغانستان میں ہی قیام کرنا چاہتے ہیں۔ ان جنگی قیدیوں کو افغانستان کے وزیر اعظم گلبدین حکمت یار اور روسی وزیر خارجہ کے درمیان ہونے والی بات چیت کے بعد پہلے مرحلے میں رہائی ملی۔ بی بی سی کے مطابق ان تین قیدیوں میں سے ایک کا تعلق یوکرائن اور دو کا تعلق روس سے ہے۔ رہائی پانے والے ان مذکورہ افراد کا کہنا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے بے حد متاثر ہوئے ہیں اور اسلام کی محبت سے معمور ہو کر اپنی باقی زندگی افغانستان میں ہی گزارنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اس فیصلہ سے افغانستان میں روس کے ناظم الامور کو آگاہ کر دیا ہے۔ جنھوں نے گزشتہ روز شمالی افغانستان میں ان سے ملاقات کی۔ روسی ناظم الامور اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود انھیں وطن واپس جانے پر قائل نہ کر سکے۔ اس مرحلہ پر روس کے ناظم الامور نے افغان وزیر اعظم حکمتیار سے بھی وائرلیس پر بات کی لیکن افغان وزیر اعظم نے انھیں جواب دیا کہ رہائی پانے والے قیدی اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں گے۔ رہائی پانے والے روسی قیدیوں کا کہنا ہے کہ قید کے دوران ان سے قیدیوں والا نہیں بلکہ مجاہدین گروپوں کے ارکان جیسا سلوک کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ حکمتیار گروپ کی قید میں رہے۔ افغانستان میں سابق سوویت یونین کے مزید ۸۰ جنگی قیدی موجود ہیں۔

اس خبر پر غور کیجئے۔ جب تک روسی فوج اور افغانی فوج میں جنگ ہو رہی تھی، دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ مگر جب دونوں کے درمیان لڑائی بند ہو گئی اور امن کے حالات میں دونوں کو ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع ملا تو دونوں ایک دوسرے کے دوست ہو گئے۔ حتی کہ روسی فوجی نے اسلام قبول کر لیا۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر آدمی اسی دین فطرت پر پیدا ہوا ہے۔ کوئی آدمی صرف غیر معتدل حالات میں ہی اپنی فطرت سے بیگانہ ہو سکتا ہے۔ حالات میں اعتدال آتے ہی ہر آدمی اپنی فطرت کو پہچان لے گا اور فطری دین کو اپنا دین بنا لے گا۔

ابدی امکان

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جو امور کائنات کا نظم کر رہا ہے، اور وہ اللہ ہی ہے جو اپنے پیغمبروں کے اوپر اپنی آیتیں نازل کرتا ہے (یدبر الامر یفصل الآیات) الرعد ۲

اس سے معلوم ہوا کہ کائناتی واقعات، مثلاً زمین کی گردش یا بارش کا برسنا، خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بھی خدا کے حکم کے تحت ہیں۔ دونوں ہی خدائی مقدرات ہیں۔ کوئی شخص اس پر قادر نہیں کہ وہ زمین و آسمان کے نظام میں تبدیلی پیدا کر دے۔ اسی طرح کوئی اس پر بھی قادر نہیں کہ وہ حیات انسانی کے بارہ میں خدا کے مقرر کیے ہوئے قوانین کو بدل دے۔

حیات انسانی کے بارہ میں قرآن میں جو قوانین بتائے گئے ہیں ان میں سے ایک قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہاں مسائل ہی مسائل ہوں، اور مواقع کا بالکل خاتمہ ہو گیا ہو۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوگا کہ جہاں کچھ مشکل ہوگی وہیں آسانیاں بھی اسی کے ساتھ ضرور موجود رہیں گی (فان مع العسر یسرا۔ ان مع العسر یسرا) الانشراح

کوئی شخص، خواہ وہ کتنا ہی طاقتور ہو، اس پر قادر نہیں کہ وہ آپ کے اوپر صبح کے آنے کو روک دے۔ رات کے بعد ضرور صبح آئے گی اور آپ کے گھر کے اوپر اس کی روشنی پھیل کر رہے گی۔ اسی طرح کسی کے بس میں یہ بھی نہیں کہ وہ آپ کو ایسی مشکل میں ڈال دے کہ اس کے بعد آسانی کی کوئی صورت آپ کے لیے باقی ہی نہ رہے۔ یہ خدائی مقدرات میں سے ہے کہ مشکلات راہ کے ساتھ عین اسی وقت مواقع کار بھی آپ کے لیے موجود رہیں۔ یہ خدا کا مقرر کیا ہوا ایک محکم قانون ہے، اور اس کو بدل دینا کسی بھی شخص یا گروہ کے لیے کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مایوسی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ جو آدمی خدا پر یقین رکھتا ہے۔ اس کو اس نظام خداوندی پر بھی محکم یقین رکھنا ہے کہ اس دنیا میں اس کے لیے راہیں کبھی بند نہیں ہوں گی۔ اس کے لیے اس دنیا میں امید کا پہلو ہمیشہ باقی رہے گا۔ اور جب خدا نے امید کے پہلو کو اتنا زیادہ یقینی بنا دیا ہو تو اس کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے مایوسی کو حرام قرار دے دے۔

دعوتی تدبیر

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال اننی من المسلمین۔ ولا تستوی الحسنۃ ولا السیئۃ ادفع بالتی ھی احسن فاذا الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ وما یلقاھا الا الذین صبروا وما یلقاھا الا ذو حظ عظیم۔ واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ ھو السمیع العلیم

(۴۱: ۳۳ - ۳۶)

اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں۔ تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔ اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبہ والا ہے۔ اور اگر شیطان تمہارے دل میں کچھ وسوسہ ڈالے تو اللہ کی پناہ مانگو بیشک وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔

عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت میں الحسنۃ سے قول توحید مراد لیا ہے۔ انھوں نے کہا: الحسنۃ لا الہ الا اللہ والسیئۃ الشرک (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۱۵/۳۶۱)

اس تفسیر کی روشنی میں آیت کی تشریح کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سب سے بہتر تحریک وہ ہے جو دعوت الی اللہ کی بنیاد پر اٹھے۔ اگر کوئی شخص اپنے باطل مفروضات کی بنا پر تم سے دشمنی کرنے لگے تو اس کو تم اپنا دشمن نہ سمجھ لو۔ تمہارے اور اس کے درمیان پھر بھی ایک قرابت ہے، اور وہ یکساں فطرت کی قرابت ہے۔ اس کی باطل روش کو نظر انداز کرتے ہوئے تم اس کے سامنے اپنی دعوت حق پیش کرتے رہو۔ اس کے بعد عین ممکن ہے کہ اس کا ظاہری پردہ ہٹ جائے اور وہ تمہارے عقیدہ کو اپنا کر تمہارا قریبی دوست بن جائے۔

مگر یاد رکھو، دشمن کو دوست بنانے کی اس تدبیر کو زیر عمل لانے کی ایک لازمی شرط ہے، اور وہ صبر ہے۔ فریق ثانی کی اشتعال انگیزی سے تمہارے اندر مخالفانہ جذبات پیدا ہوں تو ان کو شیطان کی کارفرمائی سمجھو اور قول احسن کے رویہ پر ہر حال میں قائم رہو۔ یہ بلاشبہ اعلیٰ حوصلہ کی بات ہے مگر اس دنیا میں بڑا حوصلہ رکھنے والے لوگ ہی بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

صلح بہتر ہے

اسلام کا عام مزاج یہ ہے کہ اختلافی معاملات میں ٹکراؤ کے بجائے موافقت کا طریقہ اختیار جائے۔ اس کو مختصر اور جامع لفظ میں الصلح خیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ مزاج عام انسانی تعلقات سے لے کر شوہر اور بیوی تک کے تعلقات میں مطلوب ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

إن امرأة خافت من بعلها نشوزا او اعراضا فلا جناح عليهما ن يصلحا بينهما صلحا والصلح ير واحضرت الانفس الشح إن تحسنوا وتتقوا فان الله كان ا تعملون خبيرا (النساء ۱۲۸)

اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے بدسلوکی یا بے رخی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں صلح کرلیں اور صلح بہتر ہے۔ اور حرص انسان کی طبیعت میں بسی ہوئی ہے۔ اور اگر تم اچھا سلوک کرو اور خدا ترسی سے کام لو تو جو کچھ تم کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔

مرد و عورت یا دو آدمیوں کے درمیان تعلقات بگڑنے کا سبب اکثر حالات میں تنگدلی ہوتا ہے۔ ب عورت یا مرد کو جتنا سلوک کسی سے مل رہا ہے اس پر وہ قانع نہیں ہوتا بلکہ اس سے زیادہ کی طلب رنے لگتا ہے۔ اس سے دونوں کے درمیان بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ جو بڑھتے بڑھتے قطع تعلق ک پہنچ جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہدایت کی گئی کہ دونوں ایک دوسرے کی رعایت کرنا سیکھیں، اور ب آپس میں کوئی اختلاف یا شکایت پیدا ہو تو اس کو بڑھانے کے بجائے اس کو گھٹائیں، وہ ایک وسرے کے حریف نہ بنیں بلکہ آپس میں صلح کرکے معاملہ کو ختم کردیں۔ معاملات میں صلح کرلینا ہر حال ں بہتر ہے، خواہ وہ کسی بھی قیمت پر حاصل ہو۔

الصلح خیر کا یہ اصول صرف شوہر اور بیوی کے اختلافی معاملات کے لیے نہیں ہے بلکہ تمام اختلافی معاملات کے لیے ہے۔ جب بھی دو شخصوں یا دو گروہوں کے درمیان جھگڑے کی کوئی صورت پیدا تو ہر جگہ اسی بنیادی اصول کو رہنما بنانا ہے۔ صلح ہمیشہ کسر و انکسار یا لو اور دو کے طریقہ پر ہوتی ہے س لیے صلح کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اکڑنے کا طریقہ چھوڑ دو اور نرمی ور جھکاؤ والا انداز اختیار کرو۔

عقل سے کام نہ لینا

ولا تکونوا کالذین قالوا سمعنا وھم لا یسمعون ۔ ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (الانفال ۲۱-۲۲)

(اے ایمان والو) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔ یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ بہرے، گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے ۔

قرآن کی اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں جو نماز نہیں پڑھتے، جو داڑھی نہیں رکھتے، جو ملی تشخص کو اختیار نہیں کرتے۔ بلکہ یہ فرمایا کہ سب سے زیادہ برے جانور وہ لوگ ہیں جو حق کو سننے کے لیے بہرے بنے ہوئے ہیں، جن کے سامنے حق کی بات آتی ہے مگر اس کو وہ اپنے دماغ میں جگہ نہیں دیتے۔ وہ اس کو اس طرح سنتے ہیں جیسے کہ انھوں نے اس کو نہ سنا اور نہ سمجھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اندھاپن یا بے عقلی ایک ایسا جرم ہے جو نماز اور داڑھی اور ملی تشخص کو چھوڑنے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ فہم و تدبر انسان کی سب سے اعلیٰ صفت ہے۔ اسی بنیاد پر اس کو دوسری مخلوقات پر نوعی امتیاز حاصل ہوا ہے۔ جو آدمی فہم و تدبر کھو دے اس نے گویا اپنی خصوصیت بشری کو کھو دیا۔ اور جو مخلوق اپنی نوعی خصوصیت کو کھو دے اس کے بعد عین فطری ہے کہ وہ اللہ کے یہاں بے قیمت ہو کر رہ جائے۔

"لا یعقلون" سے کیا مراد ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی کے سامنے سچائی لائی جائے مگر وہ اس کو اہمیت نہ دے سکے۔ وہ اس کو الٹے مفہوم میں لے کر اسے نظر انداز کر دے۔ وہ اس کو کمتر قرار دے کر اس کا مذاق اڑائے۔ وہ عقل کو استعمال کر کے اس کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے بلکہ فوری تاثر کے تحت اس پر غیر متعلق رائے زنی کرنے لگے۔ اس کا ردعمل بے عقلی کا ردعمل ہو نہ کہ عقل کا ردعمل۔

ایسے لوگ اعتراف کی لذت سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی روح صرف کثیف چیزوں کا ادراک کرتی ہے۔ لطیف چیزوں کو اپنی خوراک بنانے کی صلاحیت ان کے اندر باقی نہیں رہتی۔

تاریخ کا سبق

۷۵۰ء میں عباسیوں نے بنو امیہ سے خلافت چھین لی اور عباسی خلافت کی بنیاد ڈالی۔ عباسی لیڈر یہ کام صرف اپنی طاقت سے نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایرانیوں کی مدد لی۔ ایرانیوں کی مدد سے بنو امیہ کی سلطنت ختم ہوئی اور بنو عباس کی سلطنت قائم ہوئی۔ انھوں نے دمشق کو چھوڑ کر بغداد کو اپنا سیاسی مرکز بنایا۔

ایرانیوں سے مدد لینا صرف ایک وقتی معاملہ یا سادہ واقعہ نہیں تھا۔ اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر یہ ہوا کہ مسلم سماج اور مسلم سیاست دونوں میں ایرانیوں کا نفوذ بہت بڑھ گیا۔ بنو امیہ کے زمانہ میں حکومت کی پالیسی تعریب (Arabicization) کے اصول پر چل رہی تھی، اس کے جلو میں اسلامائزیشن کا عمل جاری تھا۔ مگر عباسی اقتدار میں ایرانیوں کے زیر اثر تفریس (Persianization) کا عمل جاری ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار مسائل پیدا ہو گئے جس کے گہرے اثرات آج تک باقی ہیں

ایک مورخ کے الفاظ میں، عباسیوں کے ماتحت اسلامی خلافت ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔ بنو امیہ کے زمانہ میں توجہ کا مرکز مغرب، شمالی افریقہ، میڈیٹرینین اور جنوبی یورپ تھا مگر اب اسلامی خلافت نے اپنی توجہ مشرق کی طرف موڑ دی :

Under the Abbasids the caliphate entered a new phase. Instead of focussing, as the Umayyads had done, on the West - on North Africa, the Mediterranean, and relations with southern Europe - the caliphate now turned eastward. (I/7)

اس معاملہ کی سنگینی اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب یہ سوچا جائے کہ عباسی خلفاء اگر بنو امیہ کے خلاف اپنی مہم میں پوری طرح کامیاب ہو جاتے تو اسلامی تاریخ میں اس شاندار باب کا سرے سے وجود ہی نہ ہوتا جس کو "مسلم اسپین" کہا جاتا ہے۔

عباسی خلفاء نے نہ صرف یہ کیا کہ مغربی ممالک کی طرف اپنی توجہ کم کر دی۔ بلکہ وہ ان امویوں کے جانی دشمن بن گئے جو ان سے پہلے یہ کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اموی خاندان یا اموی سلطنت سے تعلق رکھنے والے ایک ایک شخص کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اموی دور میں اگر اسپین کی

طرف پیش قدمی شروع نہ ہو چکی ہوتی اور اموی شہزادہ عبد الرحمٰن الداخل اگر جان بچا کر اسپین پہنچنے میں کامیاب نہ ہوا ہوتا تو اسلامی تاریخ میں مسلم اسپین اور یورپ میں اسلام کے داخلہ کا باب شاید سرے سے حذف ہو جاتا۔

یہی معاملہ ایک اور صورت میں ہندستان میں پیش آیا۔ مغل بادشاہ ہمایوں کو شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ ۱۵۴۰ سے لے کر ۱۵۵۵ تک وہ دہلی کے تخت سے محروم رہا۔ اس دوران وہ بھاگ کر ایران پہنچا اور وہاں شاہ تہماسپ سے مدد مانگی۔ ایرانی بادشاہ نے ایک بڑی فوج اور ضروری سامان اس کے حوالے کیا۔ اس طرح ایرانیوں کی مدد سے ہمایوں نے از سر نو دہلی کے تخت پر قبضہ کیا۔ ۱۵ سال کے وقفہ کے بعد مغل سلطنت دوبارہ دہلی میں قائم ہوئی۔

مگر دوبارہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل سلطنت کے نظام میں ایران کے سیاسی اور تہذیبی اثرات داخل ہو گئے۔ ایرانی اس وقت آرٹ اور فنون لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ ایران سے آرٹسٹ، پینٹر، نقاش اور شاعر قسم کے لوگ بڑی تعداد میں ہندستان آنے لگے۔ ہندستان کا مسلم سماج گہرے طور پر اس سے متاثر ہوا، اور ایرانی تہذیب کے رنگ میں رنگ گیا (17/132)

تاریخ کے اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ وہ سبق یہ کہ جب آپ کسی سے مدد لے کر کامیابی حاصل کریں تو وہ کامیابی صرف آپ کی کامیابی نہیں ہوگی بلکہ اس میں اس شخص یا گروہ کا بھی دخل ہو جائے گا جس کی مدد سے آپ نے یہ کامیابی حاصل کی ہے۔ آپ ہزار کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس انجام سے نہیں بچا سکتے۔

ایسی حالت میں کام کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جو کام کیا جائے خود اپنی بنیاد پر کیا جائے۔ زیادہ بڑے کام کا شوق نہ کیا جائے بلکہ چھوٹی سطح پہ کام شروع کر کے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کی کوشش کی جائے۔ یہی کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔

حقیقی کامیابی حاصل کرنے کا واحد طریقہ بتدریج ہے، چھلانگ نہیں۔

انسان کی طاقت

بمبئی کے ایک ۱۸ سالہ مسیحی نوجوان نے خودکشی کر لی۔ اس کا نام گرین ویل گومس (Greenwell Gomes) تھا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، اس سال اس نے ایچ ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا، اب وہ بی کام میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کو بتایا گیا کہ پندرہ ہزار روپیہ "عطیہ" دیے بغیر اس کا داخلہ نہیں ہو سکتا۔ گومس کے ذہن کو اس سے بہت سخت جھٹکا لگا۔ یہاں تک کہ پریشانی کے عالم میں اس نے خودکشی کر لی (روزنامہ ہندستان۔ بمبئی، جولائی ۱۹۹۳)

دوسری طرف اسی ملک میں ایک اور مثال موجود ہے۔ ایک شخص کو اپنے بیٹے کے علاج کے لیے اچھے اسپتال میں داخلہ نہیں ملا۔ صرف اس لیے کہ اچھے اسپتال کی قیمت ادا کرنے کے لیے اس کی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ اس آدمی نے طے کیا کہ میں خود ایک ایسا اسپتال کھولوں گا جو اچھا بھی ہوگا، اور اسی کے ساتھ اس میں داخلہ سے کوئی شخص اس لیے محروم نہیں رہے گا کہ وہ اس کی فیس نہیں ادا کر سکتا تھا۔ وہ اس مہم میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایسا ایک اسپتال قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ اسپتال آج کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ہزاروں لوگ اس سے معالجاتی فائدہ حاصل کر چکے ہیں۔

اس طرح کے فیصلہ کن مواقع ہر شخص کی زندگی میں آتے ہیں۔ اس وقت اس کا ذہن جس طرف مڑ جائے، بس اسی طرف وہ چلنے لگتا ہے۔ ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کو ایسا تعمیری رہنما مل جائے جو اس کو منفی سمت میں مڑنے سے بچا سکے۔ جو اس کو وہاں فکری سہارا دے جہاں اس کا اپنا ذہن سوچنے میں عاجز ثابت ہو رہا ہے۔

مذکورہ نوجوان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے تعلیمی واقعہ کو رکاوٹ کے بجائے چیلنج سمجھے۔ وہ پندرہ ہزار روپیہ کا عطیہ مانگنے والوں سے کہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم میرا راستہ روک سکتے ہو تو تم بہت بڑی بھول میں مبتلا ہو۔ تم انسان کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو۔ ایک انسان کی طاقت اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی اس کی زندگی میں حائل ہو سکے۔ کوئی اس کو آگے بڑھنے سے روک دے۔

اس کے بعد وہ نوجوان یہ طے کرتا کہ میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ کھولوں گا جہاں نوجوان طالب علموں کو عطیہ یا رشوت دیے بغیر داخلہ مل سکتا ہو۔ اگر وہ اس قسم کا فیصلہ کرکے اس کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیتا اور استقلال کے ساتھ اس مہم میں لگ جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ ایک نیا شاندار تعلیمی ادارہ بنانے میں کامیاب ہو جائے جہاں عطیہ کے بغیر صرف میرٹ کی بنیاد پر داخلہ دیا جاتا ہو۔

اس دنیا میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب بے حوصلگی ہے اور کامیابی کا سب سے بڑا راز حوصلہ مندی۔ مذکورہ نوجوان کی خودکشی کا سبب یہ تھا کہ وہ بے ہمت ہوگیا۔ اگر وہ بے ہمت نہ ہوتا۔ اور نئے تعلیمی ادارہ کے قیام کو اپنا مشن بنا لیتا تو وہ دیکھتا کہ اسی دنیا میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کی حمایت کریں، جو اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں۔ پہلے تجربہ میں بظاہر وہ اکیلا ہوگیا تھا، مگر دوسرے تجربہ میں وہ اکیلا نہ رہتا۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے کہ:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

یہ شعر دہلی میں سب سے پہلے مجھے ایک تاجر نے سنایا تھا۔ وہ ایک تاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ مگر بعض اسباب سے اس کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ بالکل اکیلا ہوگیا۔ اس کے پاس دہلی میں نہ گھر رہا اور نہ کاروبار۔

یہ حادثہ اس کے ساتھ نوجوانی کی عمر میں پیش آیا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ معمولی سامان لے کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ صبح سے شام تک وہ محنت کرتا۔ اس کے بعد بمشکل چند روپیہ کماتا، مگر ہر قسم کے ناموافق حالات کے باوجود اس نے اپنی محنت جاری رکھی۔ یہاں تک کہ اس کو مددگار ملنے شروع ہو گئے۔

کسی تاجر نے اس کو ادھار مال دینا شروع کیا۔ کسی نے اس کو ایک دکان دلوادی۔ کسی نے گھر حاصل کرنے میں مدد کی۔ اس طرح وہ ایک کے بعد ایک زندگی کے زینے طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دہلی کا ایک کامیاب تاجر بن گیا۔

آدمی اگر مستقل مزاجی کے ساتھ ایک راستہ کو پکڑ لے۔ اور اس کے ساتھ وہ بااصول اور باکردار بھی ہو تو ایک نہ ایک دن وہ کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے روکنے والی نہیں۔

اچھا کردار

وہ کیا چیز ہے جو کسی سماج کو اچھا سماج بناتی ہے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے افراد کا اچھا کردار۔ جس سماج کے افراد میں اچھا کردار ہو وہ سماج اچھا سماج ہوگا، اور جس سماج کے افراد میں برا کردار ہو وہ سماج برا سماج بن جائے گا۔

اچھا کردار کون سا ہوتا ہے اور برا کردار کون سا۔ اس کی پہچان بہت آسان ہے۔ اچھے کردار والا انسان وہ ہے جو دوسروں کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے جو اس کو خود اپنے لیے پسند ہے۔ اور برے کردار والا انسان وہ ہے جو اپنے لیے کچھ اور پسند کرے اور جب دوسرے کا معاملہ ہو تو وہ کچھ اور پسند کرنے لگے۔

ایک آدمی اپنے گھر سے نکل کر بازار میں گیا۔ وہاں کسی نے اس سے کڑوا بول بول دیا۔ آدمی کو کڑوا بول سن کر غصہ آگیا۔ وہ اس سے لڑنے لگا۔ اس کے بعد جب یہ آدمی اپنے گھر اور محلہ میں آیا تو وہ خود بھی گھر والوں سے اور محلہ والوں سے کڑوا بول بولنے لگا۔ حالانکہ اس کو اس تجربہ کے بعد سوچنا چاہیے تھا کہ کڑوا بول جب مجھ کو اچھا نہیں لگا تو دوسروں کو بھی وہ اچھا نہیں لگے گا۔ اگر میں اپنے بارہ میں چاہتا ہوں کہ لوگ مجھ سے میٹھا بول بولیں تو مجھے خود بھی ایسا بن جانا چاہیے کہ دوسرے لوگوں کو مجھ سے صرف میٹھا بول سننے کو ملے۔

انسان اکیلا نہیں رہ سکتا۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ وہ بہت سے لوگوں کے درمیان مل جل کر زندگی گزارے۔ سب کی کامیابی میں ایک کی کامیابی ہے اور سب کی بربادی میں ایک کی بربادی۔ آدمی جب دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے تو گویا کہ وہ سماج میں ایسا ماحول بنا رہا ہے اور ایسی روایات قائم کر رہا ہے جبکہ دوسرے لوگوں کی طرف سے بھی اس کو اچھے سلوک کا تحفہ دیا جائے۔

ایک آدمی جب جھوٹ بولے تو گویا کہ وہ دوسروں کو بھی جھوٹ بولنے کی ترغیب دیتا ہے۔ ایک آدمی جب دوسرے کی چیز ہڑپ کر لے تو وہ اپنے اس عمل سے سماج میں ناجائز قبضہ کی روایت قائم کر رہا ہے۔ ایک آدمی جب وعدہ کرے اور وقت آنے پر وعدہ کو توڑ دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے سارے سماج کو وعدہ توڑنے پر جری کر دیا۔

سماجی زندگی کا رخ متعین کرنے کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز روایت ہے۔ سماجی زندگی ہمیشہ روایات پر چلتی ہے۔ اچھی روایت قائم کی جائے تو اچھا سماجی ماحول بنے گا۔ اور بری روایت قائم کی جائے تو برا سماجی ماحول پرورش پائے گا۔

اس طرح آدمی کا ہر عمل کسی نہ کسی طور پر خود اس کی اپنی طرف واپس آتا ہے۔ آدمی کے اچھے کردار سے سماج میں اچھی روایتیں قائم ہوں گی جس کا نتیجہ خود اس کو بھی مختلف صورتوں میں ملے گا۔ اسی طرح آدمی کے برے کردار سے سماج میں بری روایتیں قائم ہوں گی۔ اس کے نتیجہ میں دوبارہ ایسا ہوگا کہ اس کے اثرات مختلف صورتوں میں خود اس کی اپنی ذات تک بھی پہنچیں گے۔

اچھے کردار کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کی اپنی روح کو سکون حاصل ہوتا ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ سماج ایک اچھا سماج بن جاتا ہے جس میں اسے رہنا ہے۔ اسی طرح برے کردار کا پہلا نقصان یہ ہے کہ آدمی روحانی سکون سے محروم ہو جاتا ہے اور اس کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ اس کو رہنے کے لیے ایک ایسا سماج ملتا ہے جو جھاڑ جھنکاڑ کا سماج ہو۔ پہلی صورت میں اس کا سماج پھولوں کا سماج بن جاتا ہے اور دوسری صورت میں اس کا سماج کانٹوں کا سماج۔

ایک آدمی نے مجھ سے سوال کیا کہ مختصر طور پر یہ بتائیے کہ دنیا میں آدمی کو کس طرح رہنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آپ بھی اسی طرح رہنے لگیں جس طرح آپ کے گرد و پیش کی ساری دنیا رہ رہی ہے۔ کائناتی اخلاق ہی بہترین انسانی اخلاق بھی ہے۔ کائنات گویا ایک اخلاقی نمونہ ہے اور ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اس نمونہ کو ہم اپنی زندگی میں بھی اپنا لیں۔

آپ سورج کو دیکھئے۔ وہ زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کو روشنی پہنچا رہا ہے۔ اس کے پاس ایک قوم کے لیے بھی روشنی ہے اور دوسری قوم کے لیے بھی روشنی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی آدمی سورج کو گالی دے تب بھی اس کو سورج کی طرف سے روشنی اور حرارت ہی کا تحفہ ملے گا۔

یہی آفتابی اخلاق ہمیں بھی اپنی زندگی میں اپنانا ہے۔ ہمیں ہر ایک کے لیے نفع بخش بننا ہے۔ ہمیں ہر ایک کے لیے دینے والا بننا ہے، خواہ اس کی طرف سے ہمیں کچھ مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو۔ اس معاملہ میں ہمارا اخلاقی معیار اتنا اونچا ہونا چاہیے کہ ہم دشمن کو بھی دوست کی نظر سے دیکھیں اور غیر کے ساتھ بھی اپنوں جیسا سلوک کریں۔

آپ درخت کو دیکھیے۔ درخت کیا کرتا ہے۔ آپ کی سانس سے نکلی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ کو وہ لے لیتا ہے۔ اس کے بدلے وہ آکسیجن نکالتا ہے جو آپ کی تندرستی اور توانائی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ گویا کہ درخت ایک ایسا کارخانہ ہے جس کے اندر مضر چیز داخل ہو کر بھی صحت بخش چیز بن جاتی ہے۔

اب آدمی کو بھی چاہیے کہ وہ اسی اخلاق کو اپنا لے۔ اس کے کان میں کڑوا بول داخل ہو تو اندر پہنچ کر اس میں ایسی تبدیلی ہو جائے کہ وہ منہ سے میٹھے بول کی صورت میں نکلے۔ کوئی اس کو گالی دے تو اس کے بدلے وہ اس کے لیے نیک دعائیں کرے۔ کوئی اس کو نقصان پہنچائے تو وہ اس کو نفع پہنچانے کی کوشش کرے۔ کوئی اس کو ذلیل کرے تو وہ اس کو عزت دینے کی فکر کرنے لگے۔

کائنات میں یہی معاملہ ہر چیز کا ہے۔ یہاں تک کہ زہریلے جانوروں کا بھی۔ گجرات میں ایک ڈاکٹر ہیں۔ وہ کئی قسم کے سانپ پالے ہوئے ہیں۔ وہ ان سانپوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، آپ کو ان زہریلے سانپوں سے ڈر نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ بالکل نہیں۔ کیوں کہ یہ جانور تو قابل پیشین گوئی کردار کے حامل ہیں۔ وہ صرف اس وقت آپ کو کاٹتے ہیں جب کہ آپ انھیں ستائیں۔ اگر آپ جانوروں کو دکھ نہ دیں تو وہ کبھی آپ کو دکھ دینے والے نہیں۔

اسی طرح آدمی کو بھی قابل پیشین گوئی کردار والا ہونا چاہیے۔ لوگوں کو پیشگی طور پر معلوم ہو کہ آپ کسی کو دھوکا دینے والے نہیں ہیں۔ آپ امانت میں خیانت کرنے والے نہیں ہیں۔ آپ کبھی اپنے اختیارات کا غلط استعمال نہیں کریں گے۔ آپ کسی کی کمزوری کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ آپ اپنے بارے میں ہمیشہ اس امید کو پورا کریں گے کہ آپ جب انسان ہیں تو آپ ہمیشہ انسانی کردار پر قائم رہیں گے۔ کسی بھی حال میں آپ انسانی روش سے ہٹنے والے نہیں۔

نوٹ : یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے ۲ ستمبر اور ۹ ستمبر ۱۹۹۲ کو نشر کی گئی۔

بھیڑ یا اتحاد

انسانی نفسیات کے ایک ماہر نے کہا ہے کہ محبت کے مقابلہ میں نفرت کا جذبہ زیادہ طاقتور جذبہ ہے۔ اس کے اندر جوڑنے کی طاقت بھی زیادہ ہے۔ انسانیت سے محبت کرنے والے شاذ و نادر ہی باہم جڑتے ہیں مگر نفرت کرنے والے ہمیشہ آپس میں جڑ جاتے ہیں۔ کسی شخص یا کسی گروہ سے مشترک نفرت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں جو لوگوں کو موثر طور پر باہم جوڑتی ہو :

Hate is in every way a much stronger passion than love. It is also a much stronger binding force. Lovers of humanity rarely bind themselves together, haters invariably do so. Nothing unites a people more effectively than a common hatred for someone or some other community.

ہندستان کی بڑی بڑی تنظیمیں اس قول کی مصداق ہیں، خواہ وہ ہندو تنظیمیں ہوں یا مسلم تنظیمیں۔ یہ تمام تنظیمیں کسی مفروضہ دشمن کے خلاف نفرت کے جذبہ پر بنی ہیں۔ اگر ان سب کا ایک مشترک نام دینا ہو تو ان کا صحیح ترین نام ہوگا ——— دوسروں سے نفرت کرنے والی تنظیمیں :

Organisations of haters of other communities

موجودہ زمانہ میں بار بار مسلمانوں کا "بے نظیر اتحاد" وجود میں آیا ہے۔ مگر یہ تمام اتحاد نفرت کی زمین پر قائم ہوا ہے نہ کہ محبت کی زمین پر۔ جدید دور میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ مسلمانوں کا "ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو گیا۔ مگر ایسا ہر واقعہ کسی مفروضہ دشمن کے خلاف نفرت کے جذبہ کو ابھار کر حاصل کیا گیا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمان غیر اقوام کے لیے محبت و خیر خواہی کی پکار پر بڑی تعداد میں اکٹھا ہو گئے ہوں۔

ہمارا ایک پرجوش لیڈر اٹھتا ہے۔ وہ جذباتی تقریریں کر کے مسلمانوں کو ایک غیر قوم کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ اس طرح وہ بہت جلد مسلم عوام کی بھیڑ اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ اور اس کے فخر کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ "بے نظیر اسلامی اتحاد" ظہور میں آگیا ہے۔ مگر یہ سب سے بڑا دھوکا ہے جس میں موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر مبتلا ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے انبوہ کا زیادہ صحیح نام بے نظیر بھیڑ ہے نہ کہ بے نظیر اتحاد۔

سنجیدگی شرط ہے

لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيرا (الاحزاب ۲۱)

اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور اللہ کو بہت زیادہ یاد کرے۔

قرآن کی اس آیت میں اللہ کے رسولؐ کو لوگوں کے لیے بہترین نمونہ بتایا گیا ہے۔ بظاہر یہ نمونہ قرآن اور حدیث اور سیرت کی کتابوں میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے رسول میں اس شخص کو اپنے لیے نمونہ ملے گا جو قرآن و حدیث اور سیرت کی کتابوں کو پڑھے بلکہ یہ فرمایا کہ یہ نمونہ جو پورے معنوں میں بہترین نمونہ ہے، وہ صرف اس شخص کو ملے گا جو اللہ سے ڈرے، جو آخرت کے لیے فکرمند ہو، جو اللہ کو بہت زیادہ یاد کرتا ہو۔

ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا نمونہ جو کتابوں میں لکھا ہوا ہے وہ کوئی ریاضیاتی نوعیت کی چیز نہیں ہے۔ مثلاً کسی کتاب میں لکھا ہوا ہو کہ دو اور دو مل کر چار ہوتے ہیں، تو جو آدمی بھی اس کو کتاب میں پڑھے گا وہ اس کا ایک ہی مطلب نکالے گا۔ اس کو سمجھنے میں غلطی کرنے یا بھٹکنے کا کوئی امکان نہیں۔ مگر سیرت رسول کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ہے جس میں ہمیشہ مختلف تعبیرات کی گنجائش رہتی ہے۔ اس لیے اس کو صحیح طور پر اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی پوری طرح سنجیدہ ہو۔ ذہن پر اللہ کا تصور چھایا ہوا ہونا اور آخرت کے دن سے ڈرتے رہنا آدمی کے اندر یہی سنجیدگی پیدا کرتا ہے، اس لیے ایسا آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ رسول کے نمونہ کو صحیح طور پر اخذ کر سکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، رسول اللہؐ کا نمونہ قرآن اور حدیث اور سیرت میں لکھا ہوا موجود ہے۔ مگر وہ دو اور دو چار کی طرح کوئی حسابی نوعیت کی چیز نہیں ہے۔ اس کا تعلق زندگی سے ہے۔ اور انسان کی زندگی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیشہ حرکت میں رہتی ہے۔ وہ مختلف احوال سے گزرتی ہے۔ اس میں کبھی ایک قسم کی صورت حال پیش آتی ہے اور کبھی دوسرے قسم کی صورت حال۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں مختلف قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ کبھی آپ

دشمنوں کی مخالفانہ حرکتوں کو برداشت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ان سے مقابلہ کرتے ہیں۔ کبھی آپ کو حکومت پیش کی جاتی ہے مگر آپ اس کو قبول نہیں کرتے اور کبھی خود حکومت قائم کرتے ہیں۔ کبھی آپ صرف ایمان اور اخلاق کی باتیں کرتے ہیں اور کبھی ایسے احکام بیان کرتے ہیں جن کا تعلق سیاست اور اجتماعی قانون سے ہوتا ہے۔ کبھی آپ آخرت کے مسئلہ پر اس طرح زور دیتے ہیں جیسے کہ وہی سب کچھ ہے اور کبھی دنیوی تدبیروں کی اہمیت بتاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس قسم کا فرق و اختلاف آپ کے نمونہ کو تعبیر کی نوعیت ایک چیز بنا دیتا ہے۔ آپ کے نمونہ سے ہدایت لینے کے لیے ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی ایک چیز اور دوسری چیز کا فرق جانے۔ وہ ایک حالت میں اور دوسری حالت میں تمیز کر سکے۔ وہ اس حکمت سے آگاہ ہو کہ کب کون سا اسوہ مطلوب ہے اور کب کون سا اسوہ مطلوب ہے۔

اسی کا نام تعبیر صحیح ہے۔ اور اس تعبیر صحیح کی استعداد آدمی کے اندر صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ خوف خدا اور فکر آخرت نے اس کو انتہائی حد تک سنجیدہ بنا دیا ہو۔ جو آدمی سنجیدہ نہ ہو وہ ایک موقع کی بات کو دوسرے موقع پر چسپاں کر دے گا۔ وہ اس فکری غلطی کا ارتکاب کرے گا جس کو وضع الشیئ فی غیر موضعہ کہا گیا ہے۔ وہ اِس عوامی کہاوت کا مصداق بن جائے گا کہ ——— کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔

جس آدمی کے اندر گہری سنجیدگی اور شدید احتیاط کی مذکورہ صفت موجود نہ ہو وہ تعبیر کی غلطیوں کی وادی میں بھٹکتا رہے گا، وہ اسوۂ رسول سے کبھی اپنے لیے نمونہ حاصل نہ کر سکے گا۔

ایسے شخص کا حال یہ ہوگا کہ جہاں احتساب خویش کے حکم پر عمل کرنے کی ضرورت ہو وہاں وہ انتقام غیر کی آیت کا حوالہ دے گا۔ جہاں صبر کا موقع ہو وہاں وہ جہاد کی باتیں کرے گا۔ جہاں حدیبیہ کی سنت مطلوب ہو وہاں وہ دفاع کی حدیث سنائے گا۔ جہاں غیر قوم کے ساتھ مدعو کا معاملہ کرنا ہو وہاں وہ اس کے خلاف بدر و حنین کا معرکہ گرم کرنے پر تقریر کرے گا۔ جہاں خود اپنے اندر دینی کردار پیدا کرنے کا وقت ہو وہاں وہ پیغمبر کے حاکمانہ اسوہ کو جوش و خروش کے ساتھ پیش کرے گا۔ جہاں یہ ضرورت ہو کہ اہل ایمان دعوت الی اللہ کے لیے اٹھیں وہاں وہ قتال کی آیتوں اور حدیثوں کا دفتر کھول دے گا۔

بے معنی کلام

عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۲ ربیع الاول ۱۴۱۳ھ، ۱۹ اگست ۱۹۹۲ء) میں ایک مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے: الدکتور یوسف القرضاوی یکشف خفایا المؤامرۃ الماسونیۃ (ڈاکٹر قرضاوی ماسونی سازش کے خفیہ رازوں کا انکشاف کرتے ہیں) موجودہ زمانہ میں اس قسم کے مضامین ہزاروں کی تعداد میں چھاپے گئے ہیں۔ مسلمان آج جن مشکلات ومسائل سے دوچار ہیں ان کے بارہ میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ غیر اقوام کی سازش کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ مسلسل دشمنانِ اسلام کی ان سازشوں کے انکشاف میں مصروف ہے۔

مخالفین کی ان سازشوں کے خلاف عالمی سطح پر جدوجہد جاری ہے۔ اس جدوجہد کے بارہ میں میں کہوں گا کہ وہ اپنا نشانہ پورا کر چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود نتیجہ بدستور صفر ہے۔ نشانہ کی تکمیل کے باوجود مسلمانوں کے مسائل ایک فی صد بھی حل نہیں ہوئے۔

سازشوں کے بارہ میں نشانہ کی تکمیل سے میری مراد سازشوں کا انکشاف ہے۔ موجودہ زمانہ میں تمام مسلم پریس، تمام مسلم اجتماعات، تمام مسلم لٹریچر مغربی سازشوں کے انکشاف میں مصروف ہیں۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ سازش اسی وقت تک سازش ہے جب تک وہ مخفی رہے۔ سازش جب بے نقاب ہو جائے تو وہ سازش نہیں رہتی۔ پھر جب مسلم دماغوں نے مغربی سازش کی مخفی حیثیت کو ختم کر کے اسے ایک معلوم حقیقت بنا دیا تو اس کے بعد گویا انھوں نے سازش کے مقابلہ میں کامیابی بھی حاصل کر لی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ سازشوں کے اوپر فکری فتح حاصل کر لینے کے باوجود ہمارے مسائل کا خاتمہ نہ ہو سکا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مغرب کی مفروضہ سازش سادہ طور پر صرف سازش نہیں تھی۔ وہ مغرب کی ترقیاتی حیثیت کا ایک استعمال تھی، وہ مغرب کی صنعتی برتری کے بطن سے پیدا ہوئی۔ ہم سازشوں کے انکشاف کے باوجود مغرب سے اس کی صنعتی برتری کو چھین نہ سکے۔ اس لیے ہم کامیاب بھی نہیں ہوئے۔

جس چیز کو ہم نے مغرب کی سازش کا معاملہ سمجھ رکھا تھا وہ درحقیقت مغرب کی ترقیاتی برتری کا معاملہ تھا۔ اور ترقیاتی برتری کے مسئلہ کو کسی سازش کے اعلان یا انکشاف کے ذریعہ حل نہیں کیا جا سکتا۔

تعلیمی ایمپائر

ایک مجلس میں اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ کسی مشن کو موثر انداز میں کام کرنے کے لیے ہمیشہ ظاہری مرکز کی ضرورت ہوتی ہے۔ برصغیر ہند میں دو تحریکیں خاص طور پر کامیاب رہیں۔ ایک تبلیغی جماعت۔ اور دوسرے وہ جس کو دیوبند تحریک کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ دونوں کے پاس ایک ظاہری مرکز موجود تھا جس سے لوگ بآسانی وابستہ ہو سکتے تھے۔

تبلیغی تحریک ایک مبنی بر مسجد (masjid-based) تحریک کے طور پر اٹھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ہی اس کو ہر جگہ کام کا مرکز حاصل ہو گیا۔ کیوں کہ ہر جگہ مسجد پہلے سے موجود تھی۔ تبلیغی جماعت کو پھیلاؤ ملنے کا خاص سبب یہی ہے کہ اس نے مسجد کو بنیاد بنا کر کام کیا۔ اور اس بنا پر لوگوں کو جوڑنا اس کے لیے نہایت آسان ہو گیا۔

دیوبند تحریک مبنی بر مدرسہ (madrasa-based) تحریک تھی۔ اس کے کارکنوں کے سامنے ایک متعین کام تھا کہ وہ ہر جگہ مدرسہ بنائیں۔ مدرسہ بننے کے بعد مقامی طور پر ہی اس کو ہر قسم کے ضروری افراد مل جاتے تھے اور تحریک کو ایک محسوس مرکز حاصل ہو جاتا تھا۔

الرسالہ مشن میں علم کا پہلو غالب ہے۔ اس لیے ہمیں تعلیم گاہ کو مرکز بنا کر اس کام کو آگے بڑھانا ہے۔ الرسالہ مشن سے وابستہ لوگوں کو یہ کرنا ہے کہ ہر جگہ وہ یا تو کسی قائم شدہ تعلیم گاہ سے جڑ کر کام کریں، یا خود اپنے وسائل کے تحت کوئی تعلیم گاہ بنائیں۔ اس طرح ہر جگہ یہ کام ایک محسوس صورت اختیار کرے گا اور لوگوں کے لیے اس کے ساتھ جڑنا آسان ہو جائے گا۔

الرسالہ مشن ایک مبنی بر ماہنامہ (mahanama-based) تحریک کے طور پر اٹھا۔ مگر یہ کافی نہیں۔ ضرورت ہے کہ وہ مبنی بر تعلیم گاہ تحریک کے طور پر چلنے لگے۔ اور لٹریچر یا ماہنامہ کی حیثیت اس کے معاون آرگن کی ہو جائے۔ اس طرح یہ مشن زیادہ پائداری کے ساتھ جاری رہ سکے گا۔

الرسالہ مشن سے وابستہ افراد جگہ جگہ یہ تعلیمی کام کر رہے ہیں۔ کوئی شخص مدرسہ کی صورت میں اس کو کر رہا ہے اور کوئی اسکول کی صورت میں۔ اور کوئی مخلوط ادارہ کی صورت میں۔ ضرورت ہے کہ یہی صورت ہر جگہ قائم ہو جائے، اور پھر یہ تمام کام مزید اضافہ کے ساتھ منظم ہو جائیں۔ حتی کہ یہ کام پورے ملک کی سطح پر ایک تعلیمی ایمپائر کی صورت اختیار کر لے۔

گلبرگہ کا سفر

گلبرگہ ریاست کرناٹک میں واقع ہے۔ دہلی سے اس کا فاصلہ ۱۸۲۵ کیلو میٹر ہے۔ یہاں ایک ادارہ حزب التوحید کے نام سے قائم ہے۔ کچھ تعلیم یافتہ نوجوان اس کو چلا رہے ہیں۔ اس ادارہ کی دعوت پر گلبرگہ کا سفر ہوا۔ اس سفر کے دوران مزید حیدرآباد اور ظہیرآباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔

۱۴ مئی ۱۹۹۲ کی شام کو جب میں اپنے دفتر سے رخصت ہو رہا تھا، میری زبان سے نکلا "میری مثال ایسی ہے جیسے کسی گائے کو سلاٹر ہاؤس لے جایا جا رہا ہو"۔ یہ تجربہ مجھ کو ہر سفر میں پیش آتا ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا ہر سفر دعوتی سفر ہوتا ہے۔ دعوت کی ذمہ داری سب سے زیادہ سخت ذمہ داری ہے۔ دعوت کا کام احساس عجز کے تحت ہوتا ہے نہ کہ احساس اعتماد کے ساتھ۔

واقعہ یہ ہے کہ داعی کا کام، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، دنیا میں اللہ رب العالمین کی نمائندگی ہے۔ آدمی مجبور ہے کہ وہ اس مشکل کام کے لیے کھڑا ہو۔ اسی کے ساتھ وہ مجبور ہے کہ اس کی نزاکتوں کو سوچ کر تڑپ اٹھے۔ میرا حال یہ ہے کہ جب میں کسی اجتماع میں تقریر کے لیے کھڑا ہوتا ہوں تو اپنی عجز بیانی کا احساس اتنی شدت کے ساتھ طاری ہوتا ہے کہ اکثر میری زبان سے نکل جاتا ہے: خدایا، تو میرے لیے "بیک اسپیکر" بن جا۔

ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا تو فضا گرمی کی وجہ سے تپ رہی تھی۔ سارا بدن پسینہ پسینہ ہوگیا۔ اس کے بعد جب میں دہلی ایرپورٹ کی ایرکنڈیشنڈ عمارت میں داخل ہوا تو وہاں ہر طرف ٹھنڈک تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد پسینہ خشک ہو کر جسم کو سکون حاصل ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے گرمی بھی رکھی ہے اور ٹھنڈک بھی۔ گرمی اس لیے ہے تاکہ اس کو دیکھ کر آدمی جہنم کو یاد کرے۔ اور ٹھنڈک اس لیے ہے تاکہ آدمی جب اس کا تجربہ کرے تو وہ جنت کا مشتاق بنے۔

دہلی سے حیدرآباد کے لیے فلائٹ نمبر ۸۵۹ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک انگریزی اور ایک ہندی اخبار دیکھا۔ انگریزی ہفت روزہ کرنٹ (۱۵ مئی ۱۹۹۲) میں ایک مفصل مضمون افغانستان کے بارہ میں تھا۔ اس کا عنوان تھا: کشتگان فتح (victims of victory)۔ اس مضمون میں

افغان جہاد کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ افغانستان کے قبائل جو باہم معاند اور متخاصم رہتے ہیں، اسلام ان کو متحد کرنے کے لیے کافی نہیں :

Islam is not enough to unite Afghanistan's mutually antagonistic and often warring groups.

دورِ اول میں اسلام نے یہ معجزہ دکھایا کہ اس نے لڑتے ہوئے لوگوں کو آپس میں متحد کر دیا (آل عمران ۱۰۳) اس کے برعکس آج ایک جائزہ نگار کو یہ کہنے کا موقع مل رہا ہے کہ اسلام لڑنے والے لوگوں کو متحد کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دورِ اول کے لوگوں نے اسلام کو اسلام کے طور پر اختیار کیا تھا۔ موجودہ زمانہ میں لوگ اسلام کو قومی نعرہ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ اور جو فائدہ حقیقی اسلام سے ملتا ہو وہ فائدہ کبھی قومی نعرہ والے اسلام سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

دورانِ پرواز ہندی اخبار ساندھیہ ٹائمس (۲۴ مئی ۱۹۹۲) دیکھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا جیسے اُردو زبان دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے۔ اس شمارہ کی چند سرخیاں ملاحظہ ہوں :

کانگرس، بھاجپا اور جنتا دل میدان میں
دلوں کے خزانے لوٹنے نہیں دیے
کالازار میں ہومیوپیتھی کارگر ہے
ہر سال ساڑھے تین لاکھ مکان بنانے ہوں گے
بے قابو سٹلائٹ قابو میں
عمران نے نام واپس کیوں لیا
دلی پولیس کمال کرتی ہے
حاضر جواب نلک
بس کو اسٹاپ پر روکنا شان کے خلاف سمجھتے ہیں

جو لوگ ہندی اخبارات پڑھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہندی اخبارات کی زبان عام طور پر اسی قسم کی ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اردو زبان اس ملک میں مٹ رہی ہے۔ زیادہ صحیح

بات یہ ہے کہ اردو زبان بدستور اس ملک میں زندہ ہے۔

آزادی کے بعد کچھ مسلم لیڈروں نے مطالبہ کیا تھا کہ دستور ہند میں یہ لکھا جائے کہ ملک کی قومی زبان ہندستانی ہوگی جو اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ یہ بات دستور میں تو نہ لکھی جا سکی۔ مگر تاریخی حقائق نے اس کو عملاً قائم کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج ملک کی عمومی زبان ہندستانی (آسان اُردو) ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ زبان مسلمانوں کے یہاں فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور ہندو اس کو دیوناگری رسم الخط میں لکھتے ہیں۔

جارج کاف مین (۱۹۶۱ - ۱۸۸۹) ایک امریکی ادیب اور صحافی تھا۔ اس نے لمبی عمر پائی مگر وہ کبھی ہوائی جہاز پر سوار نہیں ہوا۔ اس کا سبب اس کے الفاظ میں یہ تھا : میں محفوظ زمین (سالڈ گراؤنڈ) کو پسند کرتا ہوں۔ اور کوئی جگہ جتنی محفوظ ہو اتنا ہی وہاں ڈر کم ہوگا :

Goerge Kaufman lived a long life and almost never stepped on to a plane. His reason? "I like terra firma and the more firma, the less terra."

اس جملہ میں صنعت ایہام (pun) کا استعمال کیا گیا ہے۔ ایہام سے مراد ذو معنی لفظ کا مزاحیہ استعمال ہے۔ یعنی ایسے دو لفظوں کا مزاحیہ استعمال جو تلفظ میں مشابہ مگر معنی میں مختلف ہوں۔ مذکورہ فقرہ میں آخری "ٹیرا" صوتی مشابہت کی بنا پر "ٹرر" کے مفہوم میں ہے۔ یعنی میں زمین پر رہتا ہوں، کیوں کہ زمین پر ڈر کم ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ زمین بھی ایک اڑتی ہوئی سواری ہے۔ ہوائی جہاز فضا میں اڑتا ہے اور زمین خلا میں۔ دونوں میں سے کوئی بھی ٹیرا فرما نہیں (وترى الجبال تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب)

اپریل ۱۹۹۲ میں نیویارک کے ایک ادارہ کی طرف سے ہفتہ ہوابازی (Aviation Week) منایا گیا۔ کمپیوٹر کی مدد سے ایک ہفتہ کے دوران دنیا کی ۴۳ ہوائی کمپنیوں کا جائزہ لیا گیا۔ اس کا مقصد یہ دیکھنا تھا کہ معیار، بھروسہ، پابندی اور گرمجوشی (quality, reliability, punctuality, cordiality) کے اعتبار سے ان کا کیا حال ہے۔ اس عالمی جائزہ میں انڈین ایرلائنز کو نمبر ۴۳ پر جگہ ملی۔ اس کے بعد آخری نمبر عراق ایر کا تھا (ہندستان ٹائمس ۲۵ مئی ۱۹۹۲)

ہندستان کے لیڈروں کی تقریریں سنیے تو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ہندستان ساری دنیا کا قائد ہے۔ مگر صورت حال اس کے برعکس ہے۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے دعوے کے اعتبار سے سب سے آگے اور حقیقت کے اعتبار سے سب سے پیچھے ہوں۔

۱۴ مئی کو جب ہمارا جہاز حیدرآباد ایرپورٹ پر اترا تو رات ہو چکی تھی۔ ساتھیوں کے ہمراہ یہاں سے شہر کی طرف روانہ ہوا۔ حبیب بھائی کا مکان ایرپورٹ سے بہت قریب ہے۔ دو منٹ میں ہمارا قافلہ ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ رات اسی جگہ گزاری۔ یہ علاقہ کافی پرسکون ہے اور نئے حیدرآباد میں واقع ہے۔

پچھلے دن ایک صاحب نے بڑے زور شور کے ساتھ اپنی اس تجویز پر بحث کی تھی کہ فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ بنائیں اور ہر شہر میں پاکٹ کی صورت میں آباد ہوں۔ مگر جن لوگوں کو اس قسم کے پاکٹ کا عملاً تجربہ ہو رہا ہے وہ کبھی اس تجویز کی تائید نہیں کریں گے۔ مثلاً پرانے حیدرآباد میں عملاً مسلمانوں کا پاکٹ موجود ہے۔ جب کہ نئے حیدرآباد میں زیادہ آبادی غیر مسلموں کی ہے۔ لیکن فسادات وغیرہ کے مسائل صرف پرانے حیدرآباد میں پیش آتے ہیں۔ نیا حیدرآباد ہمیشہ اس قسم کی چیزوں سے محفوظ رہتا ہے۔

۱۵ مئی کو صبح ۴ بجے حیدرآباد سے گلبرگہ کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر بذریعہ روڈ طے ہوا۔ اس سفر میں جناب جلال الدین محمد لاہوری اور محمد فصیح الدین قاضی ساتھ تھے۔ فجر کی نماز راستہ میں پڑھی گئی۔ سداسیو پیٹ میں سڑک کے کنارے ایک شاندار مسجد زیر تعمیر نظر آئی۔ اتر کر اس کو دیکھا۔ لوگوں نے بتایا کہ پہلے یہ مسجد معمولی ٹین کے شیڈ کی صورت میں تھی۔ اب اس کے رقبہ میں دگنا اضافہ کر کے کئی منزلہ پختہ مسجد بنانے کا منصوبہ ہے۔ مسجد بالکل نئے طرز کی اور خوب صورت تھی۔

ہندستان میں ایسی مسجدیں اور مدرسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج ان کی تعداد اور ان کی وسعت میں سیکڑوں گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ مگر کوئی بھی "مسجد والا" یا "مدرسہ والا" دنیا کو اس ترقی کی خبر نہیں سناتا۔ اگر اتفاق سے کسی مدرسہ کی دیوار پر ہولی کا رنگ پڑ جائے یا کسی مسجد کے سامنے سے غیر مسلموں کا جلوس باجا بجاتا ہوا گزر جائے تو اس کی خبر سنانے کے لیے ہر آدمی زبان و قلم کا شہنشاہ بن جاتا ہے۔ ان میں کوئی ایک بھی نہیں جس نے

مذکورہ ترقیاتی واقعہ سے دنیا کو باخبر کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس قسم کی خبر رسانی ناقص خبر رسانی ہے۔ اور جو لوگ ناقص خبر رسانی کی کمزوری میں مبتلا ہوں ان کا انتخاب کبھی داعیٔ حق کے مقدس منصب کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔

آگے بڑھے تو ایک مقام پر سڑک کے دونوں طرف سامان سے لدے ہوئے دو ٹرک اوندھے گرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ دونوں ٹرک آمنے سامنے سے آرہے تھے۔ مگر دونوں میں سے کوئی دوسرے کو راستہ دینے کے لیے تیار نہ ہوا۔ دونوں صرف ہارن بجا بجا کر دوسرے سے کہتے رہے کہ تم اپنے ٹرک کو کنارے لے جاؤ۔ کیوں کہ میں اپنے ٹرک کو ہٹانے والا نہیں۔ دو طرفہ ضد میں دونوں ٹکرا گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہی برباد ہوگئے۔

گرے ہوئے ٹرک کو میں نے غور سے دیکھا تو ایک ٹرک پیچھے ایک تختی لگی ہوئی نظر آئی اس پر جلی حرفوں میں یہ فقرہ لکھا ہوا تھا ——— میرا بھارت مہان۔

میں نے سوچا کہ ان کی اس تباہی کا سبب ان کا ایک تضاد تھا۔ انھوں نے دھات کی تختی پر لکھ رکھا تھا کہ میرا دیش مہان ہے۔ مگر ان کے دل میں یہ لکھا ہوا تھا کہ میری گاڑی مہان ہے۔ دیش کو مہان بنانا اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعۃً دیش کو مہان بنائے ہوئے ہوتے تو وہ اپنی ذات کی نفی بھی کر چکے ہوتے۔ ایسی صورت میں مذکورہ حادثہ کا امکان اپنے آپ ختم ہو جاتا

ہماری کار محمد معین صاحب (۲۵ سال) چلا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کتنے دن سے گاڑی چلاتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۸۵ سے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے ساتھ کبھی ایکسیڈنٹ ہوا۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ اگر آپ سڑک پر صحیح رخ سے جا رہے ہوں اور سامنے سے آنے والا غلط رخ سے آپ کی طرف آنے لگے تو ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے انھوں نے جواب دیا: اپنی گاڑی کو سلو کر دینا اور ضرورت ہو تو اپنے کو روک لینا۔

یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے۔ سڑک کے ڈرائیوروں میں تو بہت سے ایسے افراد ملیں گے جو اس راز کو جانتے ہوں۔ مگر زندگی کے مسافروں میں کوئی نہیں جو اس قیمتی راز کو جانے اور تعلقات انسانی میں اس کو استعمال کرے۔

ہم ظہیر آباد سے آگے بڑھے تو ہمارے ساتھی نے کہا: "یہاں آندھرا پردیش ختم ہوتا ہے

کرناٹک شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے سڑک کے کنارے کے تمام بورڈ تلگو میں ہوا کرتے تھے، اب تمام بورڈ کنڑی میں دکھائی دینے لگے۔ میں نے کہا کہ ہندستان کے تقریباً ۵۰ فی صد مسائل زبانوں کے اختلافات کی بنا پر ہیں۔ اگر یہاں سارے ملک کی زبان ایک ہوتی، جس طرح چین اور جاپان میں ہے، تو ہندستان کے جھگڑے اتنی شدت کے ساتھ پیدا ہی نہ ہوتے اور اگر پیدا ہوتے تو جلد ہی ختم ہو جاتے۔

سڑک کے دونوں طرف جگہ جگہ آم کے درخت نظر آئے۔ ان پر ہری ہری پتیوں کے درمیان آم کے پھل لٹک رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ درخت پورے ایک سال تک "محنت" کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ اس کی شاخوں پر بامعنی پھل کا ظہور ہو۔ یہاں محنت کے بغیر کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا، نہ درخت کی دنیا میں اور نہ انسان کی دنیا میں۔

گلبرگہ میں میرا قیام وردھامن ہوٹل کے کمرہ ۱۰۶ میں تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ دیر تک کمرہ میں لائٹ نہیں تھی۔ پنکھا اور بلب دونوں بند تھے۔ میں نے کمرے کے اندر کے تمام سوئچ دبائے مگر لائٹ نہیں آئی۔ میں نے سمجھا کہ یہاں کا بجلی کا نظام خراب ہے۔ ایک صاحب حکومت کے خلاف سخت شکایت کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ایک مقامی نوجوان آئے۔ اندر کا حال دیکھ کر وہ باہر نکلے۔ اور اس کے معاً بعد کمرہ میں لائٹ آگئی۔ پنکھا بھی چلنے لگا اور بلب بھی روشن ہو گیا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ کمرہ کے باہر دروازہ کے پاس اس کا مین سوئچ لگا ہوا تھا۔ یہ مسافر کی آسانی کے لیے تھا کہ جب وہ کمرہ سے نکلے تو ایک ہی سوئچ کے دبانے سے پورے کمرہ کی بجلی بند کر سکے۔ اس وقت کمرہ میں کوئی نوجوان تھے۔ میں نے کہا کہ دیکھیے، اس میں بھی نصیحت ہے۔ اس میں یہ سبق ہے کہ اگر آپ نے اصل "سوئچ" نہ دبائی ہو تو نہ آپ کا پنکھا چلے گا اور نہ آپ کا کمرہ روشن ہوگا۔ اس لیے بجلی نہ ہونے کی شکایت نہ کیجیے، بلکہ اصل سوئچ تک اپنا ہاتھ پہنچانے کی کوشش کیجیے۔

مثلاً اگر آپ تعلیم میں پیچھے ہوں، آپ اقتصادیات میں پیچھے ہوں، آپ کے اندر اتحاد نہ ہو، آپ کے اندر کردار کی طاقت نہ ہو تو گویا کہ آپ کا مین سوئچ بند ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو وہ فائدہ کیوں کر مل سکتا ہے جو مین سوئچ کھلا ہونے کی صورت میں کسی کو ملتا ہے۔

گلبرگہ ریاست کرناٹک کا ایک تاریخی شہر ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کے زمانہ میں وہ دہلی سلطنت

کا ایک حصہ تھا۔ ۱۳۴۷ء سے لے کر ۱۴۲۴ء تک وہ آزاد بہمنی سلطنت کی راجدھانی رہا۔ ۱۷ ویں صدی میں اورنگ زیب نے اس کو فتح کر کے دہلی سلطنت میں شامل کیا۔ ۱۸ ویں صدی میں دوبارہ وہ الگ ہو کر ریاست حیدر آباد کا حصہ بن گیا۔ ۱۹۵۶ میں وہ میسور کا حصہ بنا جو اب کرناٹک کہا جاتا ہے۔

گلبرگہ میں بہت سی تاریخی یادگاریں ہیں۔ یہاں بہمنی بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ یہاں کئی قدیم کالج ہیں۔ وہ کپاس اور اس سے متعلق چیزوں کی تجارت کا خاص مرکز ہے۔ محمد بن تغلق نے اس شہر کا نام احسن آباد رکھا تھا۔ مگر وہ دیر تک رائج نہ رہ سکا۔

بہمنی سلطنت محمد بن تغلق (سلطان دہلی) کے کچھ عمال کی بغاوت سے قائم ہوئی۔ اس کا بانی حسن گنگو تھا۔ وہ ۱۳۴۷ء میں تخت پر بیٹھا۔ بغاوت کامیاب ہو تو وہ فتح ہے، اور اگر وہ ناکام ہو جائے تو غداری۔ کیسی عجیب ہے یہ دنیا، اور کیسے عجیب ہیں دنیا کے معاملات۔

گلبرگہ کی سب سے ممتاز عمارت وہ سمجھی جاتی ہے جو قرطبہ کے طرز پر بنائی گئی تھی۔ اس علاقہ میں بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء سے ۱۵۱۸ء تک قائم رہی۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ اسپین کی مسلم سلطنت زوال کا شکار ہوئی، یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں وہ آخری طور پر ختم ہو گئی۔ اس زمانہ میں اسپین کے مسلم اور غیر مسلم سائنس داں وہاں کے حالات سے مایوس ہو کر یورپ کے علاقوں میں جانا شروع ہوئے۔ اس طرح سائنسی تحقیق کا کام مسلم دنیا سے مسیحی دنیا کی طرف منتقل ہو رہا تھا۔ مگر بہمنی حکمرانوں کو آخری چیز جو مسلم اسپین سے قابل درآمد معلوم ہوئی وہ ایک "عمارت" تھی۔ ان حکمرانوں کے اندر اگر علمی شعور ہوتا اور وہ وہاں ہونے والے سائنسی عمل کو اپنے ملک میں منتقل کرتے تو یہ ایک ایسا انقلابی کام ہوتا جو تاریخ کے رخ کو موڑ دیتا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ۱۳۵۰ - ۱۵۰۰ کے درمیان بہمنی سلطنت اور وجے نگر کے حکمرانوں میں کم از کم دس لڑائیاں ہوئیں۔ ان میں سے زیادہ کا تعلق تنگ بھدرا۔ کرشنا دوآبہ پر قبضہ حاصل کرنا تھا:

The period 1350-1500 saw at least ten wars, most of which were concerned with control over the Tungabhadra-Krishna doab. (9/371)

اس علاقہ میں پانی کی کمی کی بنا پر ندی کے پانی کا جھگڑا چھ سو سال سے بھی زیادہ پہلے شروع ہوا تھا اور اب تک بدستور جاری ہے۔ آزادی کا دور بھی اس کو ختم نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فریق اپنے

واقعی حق سے زیادہ لینا چاہتا ہے۔ اگر ہر ایک اپنے واقعی حق پر راضی ہو جائے تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے۔

گلبرگہ کے قیام کے زمانہ میں رہائش گاہ اور دوسرے مقامات پر لوگ برابر اکٹھا ہوتے رہے۔ اور غیر رسمی انداز میں مسلسل گفتگو جاری رہی۔ ایک مجلس میں کچھ نوجوان اکٹھا تھے۔ میں نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جب بھی آپ کوئی بات کسی سے کہیں تو یہ سوچ کر کہیں کہ آپ کی بات سننے والے کے کان میں پہنچنے سے پہلے خدا تک پہنچ رہی ہے۔ یہ احساس اگر زندہ ہو جائے تو اس کے بعد غلط کلام یا بے فائدہ کلام کا اپنے آپ خاتمہ ہو جائے گا۔

۱۵ مئی کی شام کو گلبرگہ کے قلعہ کی مسجد دیکھی۔ یہ ایک بہت بڑا قدیم قلعہ ہے۔ اس کا رقبہ چھ سو مربع ایکڑ بتایا گیا۔ تاہم اب وہ خستہ حالت میں ہے۔ بظاہر محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے اس کی مرمت وغیرہ نہیں کرائی جاتی۔ اس کے اندر بہت سے لوگوں نے رہائش اختیار کر لی ہے۔

قلعہ کے اندر ایک تاریخی مسجد ہے۔ یہ ۱۳۶۵ء میں مکمل ہوئی۔ حسن گنگو بہمنی نے گلبرگہ کو فتح کرنے کے بعد قلعہ کے اندر یہ مسجد بنائی تھی۔ یہ مسجد جامع قرطبہ کے نقشہ پر بنائی گئی ہے۔ وہ آج بھی اچھی حالت میں ہے۔ پوری مسجد میں عمدہ چونے کا پلاسٹر ہے۔ اس مسجد میں معروف طریقہ کے مطابق صحن نہیں ہے۔ پوری مسجد مسقف ہے۔ میں نے اس کے اندر چل کر اسے ناپا تو مشرق و مغرب میں وہ ۱۰۲ قدم تھی اور شمال و جنوب میں ۸۰ قدم۔ پوری مسجد میں ۱۴۰ کھمبے ہیں اور ۲۶۰ کمانوں پر اس کو کھڑا کیا گیا ہے۔ وہ زمین سے اتنی بلندی پر ہے کہ اس کے نیچے بھی ایک منزل بن سکتی ہے۔

دو آدمی ملاقات کے لیے آئے۔ گفتگو کے دوران میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے کس چیز کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو تو ایسا لگتا ہے کہ ہماری زندگی کا کوئی مقصد نہیں۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ جنت کو اپنا مقصد بنائیں۔ آپ شعوری طور پر سوچ سمجھ کر یہ طے کریں کہ ہم کو مرنے کے بعد جنت حاصل کرنا ہے۔

ان میں سے ایک صاحب نے کہا کہ جنت کو پانے کے لیے ضروری عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کا تعین کوئی مشکل کام نہیں۔ آپ قرآن کو صرف اس نیت سے از اول تا آخر پڑھیں کہ اس سلسلہ میں قرآن کیا راستہ بتاتا ہے۔ اور پھر جو راستہ قرآن میں ملے اس کو کسی شک اور تردد کے بغیر اختیار کر لیجئے۔ آپ ان شاء اللہ سیدھے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ قرآن جنت کا بے خطا گائڈ ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ پہلے میں الرسالہ پڑھتا تھا، اب میں نے الرسالہ کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں چھوڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ تو بزدلی سکھاتا ہے۔ اس کا پیغام یہ ہے کہ کوئی اقدام نہ کرو، بس چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھے رہو۔ اس قسم کا شکست خوردہ نظریہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ الرسالہ کو چھوڑنے کے بعد آپ نے کیا کیا بہادری کے کام کیے اور کون کون سے اقدامات کیے۔ وہ کوئی ایک بھی مثال نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ بہادری کی باتیں کرنے کو بہادری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ بہادری کی باتیں کرنا اور بہادری کا عمل نہ کرنا بزدلی سے بھی زیادہ برا ہے۔ کیوں کہ وہ منافقت ہے۔ اور منافقت سے زیادہ بری چیز اللہ کے نزدیک اور کوئی نہیں۔

اسی قسم کے ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ آپ جیسے لوگ نفسیات کی اصطلاح میں، دو قسمی سوچ (dichotomous thinking) کی کمزوری میں مبتلا ہیں۔ آپ کے پاس سوچنے کے لیے صرف دو لفظ ہے، بزدلی اور بہادری۔ آپ حقیقت کو صرف کالا اور سفید، دوست اور دشمن، اقدام اور بے عملی جیسی دو تقسیموں کا معاملہ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس سے زیادہ ہے کہ وہ اس قسم کی سادہ تقسیم میں سما سکے۔ علمار نفسیات بتاتے ہیں کہ اس طرح کی دو قسمی سوچ میں وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جنھوں نے تخلیقی فکر کی صلاحیت اپنے اندر سے کھو دی ہو۔ ایسی سوچ آدمی کی پستی کا ثبوت ہے نہ کہ بلندی کا ثبوت۔

میں نے کہا کہ اقدام یا ٹکراؤ کے بعد دوسری حالت صرف بے عملی اور پسپائی کی نہیں ہے۔ یہاں ایک اور حالت بھی موجود ہے اور وہ وقفۂ تعمیر ہے۔ یعنی ٹکراؤ کو ختم کرکے اپنے لیے عمل کی مہلت حاصل کرنا۔ تاکہ اپنی کمیوں کو دور کرکے اپنی داخلی تیاری کو مکمل کیا جا سکے۔ اس قسم کی روش کا نام منصوبہ بندی ہے نہ کہ بزدلی۔

الرسالہ کی باتیں سادہ اور فطری ہونے کی وجہ سے لوگوں کو آسانی کے ساتھ یاد ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس کے قاری اکثر اس کی باتوں کو جگہ جگہ استعمال کرتے ہیں۔ ایک کارخانہ کے منیجر صاحب نے بتایا کہ وہ اپنے کارخانہ کے غیر مسلم کارکنوں کو اکثر الرسالہ کی باتیں بتاتے ہیں۔ وہ لوگ بہت تاثر کے ساتھ ان کو سنتے ہیں۔ ایک انجینیر صاحب اسی طرح اپنے ادارہ کے آدمیوں کو الرسالہ کے اقوال سناتے رہتے ہیں۔ ایک صاحب نے ایک تربیتی اور اصلاحی ہینڈبل دیا۔ اس کو چھاپ

کر وہ بڑی تعداد میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے آخر میں الرسالہ کا یہ جملہ لکھا ہوا تھا: اختلاف کے باوجود متحد ہونا ہی اتحاد ہے۔ اسی طرح مختلف مسجد اور مدرسہ میں الرسالہ کے تعمیری جملے بورڈوں پر لکھے ہوئے نظر آئے۔

ایک مجلس میں ایک صاحب نے کہا کہ "ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد ہندستانی"۔ میں نے پوچھا کہ کیا صحابہ کرام نے کبھی یہ کہا تھا کہ ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد عرب۔ یا عرب کے باہر جن ملکوں میں وہ گئے وہاں انھوں نے یہ کہا کہ ہم پہلے مسلمان ہیں اور اس کے بعد مصری یا شامی یا ایرانی۔ انھوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے کہا: پھر ایسی بولی بولنا بدعت ہے اور ہر بدعت ضلالت ہے، اور ضلالت تباہی کے سوا کہیں اور پہنچانے والی نہیں۔

میں نے کہا کہ اس قسم کی بولیاں جاہلیت کی بولیاں ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ آپ یوں کہیں کہ میں مذہب کے اعتبار سے مسلمان ہوں اور وطن کے اعتبار سے ہندستانی۔ کوئی آدمی یہ نہیں کہتا کہ میں پہلے اپنے باپ کا ہوں، اس کے بعد میں اپنی ماں کا ہوں۔ آدمی بیک وقت اپنے باپ کا بھی ہے اور اپنی ماں کا بھی۔ اسی طرح آپ بیک وقت مسلمان بھی ہیں اور ہندستانی بھی۔

شہر میں چلتے ہوئے ایک بار ہم ایک عمارت سے گزرے۔ اس پر "سٹی لائبریری" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ہمارے مقامی ساتھی نے کہا کہ اس لائبریری میں الرسالہ آتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اسی طرح گلبرگہ میں بہت سی لائبریریاں ہیں اور اکثر لائبریریوں میں دوسرے میگزین کے ساتھ الرسالہ بھی مطالعہ کی میز پر رکھا جاتا ہے۔

تبلیغی حلقہ کے کئی اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہاں تقریباً ۲۰۰ مسجدیں ہیں اور اکثر مسجدوں میں کم وبیش تبلیغ کا کام ہو رہا ہے۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ یہاں ایسے بہت سے افراد ہیں کہ ان میں سے ایک شخص لہو ولعب کی زندگی میں پڑا ہوا تھا۔ اس کو سمجھایا جاتا تھا۔ مگر وہ اپنے خلاف کچھ سننے کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔ آخر کار اس کو کہہ سن کر "جماعت" میں نکالا گیا۔ چند دن جماعت میں رہ کر جب وہ لوٹا تو وہ بدل چکا تھا۔

اس طرح کے واقعات تبلیغ کے کام میں کثرت سے پیش آئے ہیں۔ اس کا راز کیا ہے۔ یہ کوئی پر اسرار معاملہ نہیں۔ یہ معمولی غور وفکر سے اس کا راز سمجھا جا سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جماعت میں جانے

سے پہلے جو لوگ انھیں سمجھاتے تھے، وہ ان کے ماحول میں رکھتے ہوئے انھیں بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور یہ عام انسانی مزاج کے خلاف ہے۔ جماعت میں نکالنا دراصل آدمی کو اس کے ماحول سے نکالنا ہے۔ آدمی سے جب اس کا ماحول چھوٹ جاتا ہے تو اس کے بعد وہ اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ وہ خالی ذہن کے ساتھ سوچ سکے۔ اس وقت اس کی فطرت کے سوا کوئی اور چیز اس کے پاس موجود نہیں ہوتی۔ اور جب فطرت کے سامنے حق کو پیش کیا جائے تو اس کے بعد اس کی قبولیت میں دیر نہیں لگتی۔

ماحول سے نکال کر اصلاح کرنے کے طریقہ کی مثالیں پیغمبروں کے یہاں موجود ہیں۔ مثلاً مصر میں بنی اسرائیل مشرک قوم کے ماحول میں تھے۔ ان کے اندر کافی بگاڑ آگیا تھا۔ اس وقت حضرت موسیٰ ان کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے گئے۔ یہ گویا ان کو ان کے ماحول سے باہر نکالنا تھا۔ چنانچہ جو تربیتی کام مصر میں نہیں ہو رہا تھا، وہ صحرا کے علاحدہ ماحول میں آسانی کے ساتھ ہونے لگا۔

میں نے کہا کہ ماحول سے نکال کر اصلاح کا یہی طریقہ غیر مسلموں کے لیے بھی استعمال کیا جانا چاہیے۔ اگر کچھ لوگ ایسا کریں تو وہ بہت سے غیر مسلموں کو اپنا ساتھی پائیں گے۔

ایک صاحب نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر و اعراض کی بات کرتے ہیں۔ آخر کس سے صبر و اعراض۔ کیا ان لوگوں سے صبر و اعراض جو کفار لا اعتبار ہیں۔ میں نے کہا کہ "کفار لا اعتبار" کا لفظ مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ بہت سے لوگ اس کو قرآن و حدیث کی طرح دہراتے ہیں۔ حالانکہ قرآن و حدیث تو درکنار، وہ عربی بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ اس جملہ میں اعتبار کا لفظ ٹرسٹ کے معنی میں ہے۔ اور عربی میں اعتبار کا لفظ ٹرسٹ کے معنی میں نہیں آتا بلکہ عبرت پکڑنے کے معنی میں آتا ہے۔

پھر میں نے کہا کہ اس ملک کے غیر مسلموں کو کافر کہنا سرے سے غلط اور غیر اسلامی ہے۔ کافر کے معنی منکر کے ہیں۔ اور کسی شخص کا منکر ہونا اس وقت متحقق ہوتا ہے جب کہ اس کے سامنے بات پوری طرح پیش کر دی جائے اور پھر بھی وہ اس کا انکار کرے۔ اس ملک کے غیر مسلموں کے سامنے ابھی مسلمانوں نے سرے سے دعوت پیش ہی نہیں کی۔ پھر پیشگی طور پر ان کو کافر (منکر) کیسے کہا جا سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ سنت رسول کے مطابق صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس ملک کے غیر مسلموں کو ہم اپنا وطنی بھائی سمجھیں

اور ان کو اپنا ہم قوم کہیں۔

مزید یہ کہ دعوت لاؤڈ اسپیکر کے اعلان کا نام نہیں ہے۔ دعوت در اصل دردمندی اور خیر خواہی کے تحت کیا جانے والا ایک عمل ہے۔ اور جب آپ کسی قوم کو حریف اور رقیب سمجھ لیں تو اس کے حق میں خیر خواہی اور دردمندی کا جذبہ کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔

ایک مجلس میں میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے درمیان بے شمار تحریکیں اٹھیں مگر بیشتر تحریکیں کسی نہ کسی کو رد کرنے کی بنیاد پر اٹھیں ـــــ رد بدعت، رد قادیانیت، رد شرک، رد شیعیت، رد عیسائیت، وغیرہ۔ یہ تمام تحریکیں عملاً بالکل بے نتیجہ رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصل کام اثبات ہے نہ کہ تردید۔

۱۵ مئی کو جمعہ کے دن گلبرگہ کی جامع مسجد میں خطاب تھا۔ یہ خطاب نماز جمعہ کے بعد ہوا۔ خطاب سے پہلے ایک صاحب نے پوچھا کہ آج مسجد میں آپ کے خطاب کا موضوع کیا ہے۔ میں نے کہا کہ نماز۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ اصلاح معاشرہ پر خطاب کرتے تو زیادہ اچھا تھا۔

میں نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ میں سوچتا رہا کہ نماز کے بارہ میں لوگوں کا تصور کتنا محدود ہے۔ وہ نماز کے موضوع کو الگ سمجھتے ہیں اور اصلاح معاشرہ کے موضوع کو الگ۔ حالانکہ نماز پوری اسلامی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ نماز پوری زندگی کی اسلامی تربیت ہے۔ میں نے اپنی تقریر میں اسی اعتبار سے نماز کے عمل کی تشریح کی۔

۱۵ مئی کو نماز عشاء کے بعد دوبارہ جامع مسجد میں ایک تقریر ہوئی۔ اس تقریر میں میں نے کہا کہ ایک ہے بے روح عبادت اور ایک ہے زندہ عبادت۔ بے روح عبادت ایک وقتی قسم کا رسمی عمل ہوتا ہے جس کا آدمی کی زندگی سے کوئی حقیقی تعلق نہیں ہوتا۔ اور زندہ عبادت وہ ہے جو آدمی کی پوری زندگی سے جڑی ہوئی ہو۔

۱۶ مئی کو نماز فجر کے بعد کچھ لوگ مسجد میں جمع ہو گئے۔ یہاں ایک گھنٹہ تک دینی باتیں ہوئیں۔ یہ گفتگو زیادہ تر سوال و جواب کی صورت میں ہوئی۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہم سے کہا جاتا ہے تقدیر کے معاملات میں زیادہ بحث نہ کرو۔ بلکہ مجمل ایمان رکھو، ایسا کیوں ہے۔

میں نے کہا کہ اس کا سبب خود تقدیر کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہماری اپنی محدودیت کا مسئلہ ہے۔

ہم اپنی محدودیت کی بنا پر بہت سی باتوں کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی باتوں کو مجمل طور پر مان لیا جائے۔ یہی سائنٹفک طریقہ ہے۔ مثال کے طور پر سائنس میں ایک مکمل کائنات پر یقین کیا جاتا ہے۔ حالانکہ بلیک ہول تھیوری بتاتی ہے کہ کائنات کے مادہ کا ۹۰ فی صد حصہ ہمارے لیے ناقابل مشاہدہ ہے۔ کیوں کہ اس کی روشنی ہم تک نہیں پہنچتی۔ اور ہم روشنی کے بغیر کسی چیز کو دیکھ نہیں سکتے۔

۱۵ مئی کی سہ پہر کو گلبرگہ کے دو مدرسوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جامعہ عربیہ مظاہر العلوم اور مدرسہ عربیہ مصباح العلوم۔ دونوں مدرسے تعلیم دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ دونوں جگہ مختصر خطاب کیا گیا۔ خطاب میں طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا گیا کہ علم کے حصول کے لیے سب سے ضروری چیز محنت ہے۔

۱۶ مئی کی شام کو نماز عشاء کے بعد گلبرگہ کے نیشنل ہائی روز ہائی اسکول میں خطاب عام تھا۔ اس کا موضوع تھا: توحید سب سے بڑی حقیقت۔ اس خطاب میں کافی تفصیل کے ساتھ موضوع پر روشنی ڈالی گئی۔ میں نے بتایا کہ توحید محض ایک کلمہ کا تلفظ نہیں ہے، وہ عظیم ترین حقیقت کو اپنے دل و دماغ میں اتارنا ہے۔ فرد یا معاشرہ میں جب توحید کا فکر جڑ پکڑتا ہے تو وہ شروع سے آخر تک ہر چیز کو بدل ڈالتا ہے۔ اس وقت کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ توحید کا فکر لوگوں کے ذہنوں میں ڈالا جائے۔

۱۷ مئی کی صبح کو گلبرگہ سے حیدرآباد کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ظہیرآباد واقع ہے۔ یہاں کچھ دیر قیام کر کے دار العلوم ظہیرآباد دیکھا جس کو مولانا مدثر صاحب اور ان کے ساتھی چلا رہے ہیں۔ دنیا پرست لوگ جن کو "ملا" کہہ کر انھیں قوم کا غیر اہم عنصر قرار دیے ہوئے ہیں، وہی اس وقت قوم کا سب سے اہم کام کر رہے ہیں۔ یہ ہے تعلیم دین کا نظام سنبھالنا۔ "ملا" لوگ اگر اس کام میں نہ لگتے تو یہ کام شاید معطل ہو جاتا، کیوں کہ غیر ملا اصحاب کو اس قسم کے کام سے کوئی دل چسپی نہیں۔

ظہیرآباد میں خطاب عام کا ایک پروگرام بھی تھا۔ اس کا انتظام یہاں کے کمیونٹی ہال میں کیا گیا تھا۔ اس خطاب کا عنوان تھا ——— "اسلام میں آخرت کا تصور"

میں نے کہا کہ آخرت کا تصور کوئی رسمی قسم کا عقیدہ نہیں۔ یہ دراصل ایک سنگین ترین حقیقت کا

راف ہے جس سے ہم میں سے ہر شخص کو سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اگر دلوں کے اندر صحیح معنوں ں اس کا احساس و اعتراف پیدا ہو جائے تو پوری زندگی میں انقلاب آجائے۔ مختلف مثالوں کے یعہ اس کی اہمیت کو واضح کیا۔

ظہیر آباد کے مدرسہ میں تحفیظ القرآن کے کلاس میں بیٹھا ہوا تھا۔ بہت سے بچے رحل پر قرآن رکھ قرآن کو یاد کرنے میں مشغول تھے۔ ان سے پوچھا جاتا کہ فلاں سورہ میں کتنے رکوع اور کتنی آیتیں ں تو وہ فوراً بلا توقف اس کا جواب دیتے تھے۔ فلاں سورہ مکی ہے یا مدنی، یا اس قسم کے دوسرے والات۔ کسی آیت کا پہلا لفظ پڑھ دیجئے اور اس کے بعد بچہ اس کے آگے کی آیتیں فی الفور پڑھنے لے گا۔ دنیا میں اس طرح کے لاکھوں مدرسے ہیں۔ اور ان میں تعلیم پانے والے بچے گویا زندہ کمپیوٹر یں جو قرآن کے لفظ لفظ کو محفوظ کرنے میں مشغول ہیں۔

اس منظر کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ انسانیت کی تاریخ میں کئی بلین کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر کسی کتاب مصنف اس پر قادر نہ ہو سکا کہ وہ لوگوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کر دے کہ وہ نسل در نسل اس کو یاد رتے رہیں۔ یہ امتیاز صرف قرآن کو حاصل ہے۔ قرآن کی یہ استثنائی صفت اس کی استثنائی نوعیت و ثابت کر رہی ہے۔

ظہیر آباد کے بیرونی مارکٹ میں ہماری گاڑی تھوڑی دیر کے لیے رکی۔ مولانا اکبر الدین قاسمی کچھ ریداری کے لیے یہاں اترے۔ واپس آنے کے بعد انھوں نے بتایا کہ سڑک کے کنارے میں ایک ٹھیلہ والے پاس کھڑا تھا۔ وہاں ایک نوعمر مسلمان لڑکا آم بیچ رہا تھا۔ میں ابھی وہیں تھا کہ ایک اور مسلمان ڑکا اس کا جاننے والا وہاں آگیا۔

پہلے لڑکے نے دوسرے لڑکے سے پوچھا کہ کیا آج تم اسکول گئے تھے۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ اس پر پہلے والے لڑکے نے کہا: نہیں پڑھے گا تو کسی چائے خانہ میں پیالیاں دھونا ہوگا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے لڑکے کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ مجھ کو دیکھو، میں وقت پر اسکول گیا۔ وہاں سے پڑھ کر آرہا ہوں اور اب آم بیچ رہا ہوں۔ سنو، یہاں ہم کو پڑھنا ہے اور اچھی تعلیم حاصل کرنا ہے، تاکہ ہم کو اچھی ملازمت ملے۔ اور اگر ملازمت نہ بھی ملی تو اگر ہم نے پڑھ لیا تو ہم کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔ پڑھا ہوا آدمی ہر کام کر سکتا ہے۔ بے پڑھا آدمی کوئی کام نہیں کر سکتا۔

غریب طبقہ کے دو مسلمان لڑکوں کی یہ گفتگو میرے لیے بڑی سبق آموز تھی۔ اس کو سن کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں حال کے اس واقعہ میں مسلمانوں کے مستقبل کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نظر آیا کہ اس ملک کے مسلمانوں نے اب نیا فیصلہ کیا ہے، اور اس فیصلہ کا اثر گلیوں میں رہنے والے بچوں تک پہنچا ہے اب تک مسلمان اپنے سطحی لیڈروں کی باتوں میں آکر اپنے مستقبل کا معاملہ دوسروں پر ڈالے ہوئے تھے۔ وہ احتجاج اور مطالبہ کی بے فائدہ مہم میں مشغول تھے۔ اب وہ ان جھوٹے لیڈروں کے فریب سے نکل آئے ہیں۔ اب انھوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ اپنی تقدیر آپ بنائیں گے۔ اور جو قوم اس راز کو پالے اس کی ترقی کو کوئی روکنے والا نہیں۔

ظہیر آباد میں چند گھنٹے گزار کر دوپہر کے وقت یہاں سے حیدرآباد کے لیے روانگی ہوئی۔ راستہ میں ایک نوجوان عالم غیاث احمد رشادی سے بات ہوتی رہی۔ میں نے قرآن و حدیث کے بہت سے مضامین کو سوال و جواب کی صورت میں واضح کیا۔ ان کا تاثر یہ تھا کہ میں پہلی بار قرآن و حدیث کو اس کی گہرائی کے ساتھ سمجھ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن میں ویزکیھم کہا گیا ہے۔ تزکیہ ذہن کے پردہ کو کھولنے کا نام ہے نہ کہ بند حجرہ میں بیٹھ کر الفاظ کی ورزش کرنے کا۔

ساڑھے تین بجے سہ پہر کو حیدرآباد پہنچا۔ یہاں نماز عصر کے بعد ایک اجتماع ہوا۔ محبوب بازار (چادرگھاٹ) میں الرسالہ مطبوعات کی فراہمی کے لیے ایک نیا اسٹال کھولا گیا ہے۔ یہاں سے الرسالہ اور دوسری مطبوعات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس سے رابطہ قائم کرنے کے لیے ٹیلی فون نمبر یہ ہے — 527774

۷ امئی ۱۹۹۲ کو راقم الحروف کی تقریر کے ساتھ اس کا افتتاح کیا گیا۔ میں نے اپنی تقریر میں الرسالہ مشن کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کا مشن یہ ہے کہ مسلمانوں کو دوبارہ اس قائدانہ رول کے لیے کھڑا کیا جائے جو کہ ماضی میں وہ مسلسل ادا کرتے رہے ہیں۔

برطانی دور سے پہلے جب مسلمان اس ملک میں آئے تو جواہر لال نہرو کے الفاظ میں، وہ بریلینٹ کلچر لے کر اس ملک میں آئے۔ انھوں نے مختلف پہلوؤں سے اس ملک کو فائدہ پہنچایا جس کا فیاضانہ اعتراف ڈاکٹر تارا چند نے اپنی کتاب انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر میں کیا ہے۔

انگریزی دور میں دوبارہ مسلمانوں نے یہاں قائدانہ رول ادا کیا۔ اب ضرورت تھی کہ ملک میں آزادی کی تحریک اٹھے اور اس کے لیے قربانیاں دی جائیں۔ یہ کام بھی مسلمان ہی کر سکتے تھے اور انھوں

نے اس کو انجام دیا۔ کیوں کہ مسلمانوں کے پاس "جہاد" کا تصور موجود تھا، جب کہ دوسرے کسی فرقہ کے پاس جہاد کا تصور موجود نہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی جانبازیوں ہی نے دیگر فرقوں کو جدوجہد آزادی کا حوصلہ دیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد دوبارہ یہ ملک اہل اسلام کے قائدانہ رول کا انتظار کر رہا ہے۔ اکثریتی فرقہ میں ذات پات کا عقیدہ یہاں انسانی مساوات کے قیام میں مستقل رکاوٹ ہے۔ دوسرا سنگین مسئلہ لامحدود زرپرستی ہے۔ کیوں کہ زر اس ملک کا سب سے زیادہ پوجا جانے والا دیوتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس چیز کو انڈین کلچر کہا جاتا ہے وہ عملاً صرف زرکلچر (money culture) ہے۔ اور ذات کلچر یا زرکلچر کبھی کسی ملک کی تعمیر میں مثبت کردار ادا نہیں کرسکتا۔

ایسی حالت میں خدائے واحد کے پرستاروں کے لیے یہاں خدمت انسانیت کا زبردست موقع ہے، وہ اٹھیں اور اپنے ہم وطنوں کو توہم پرستی کے اندھیرے سے نکال کر حقیقت پسندی کی روشنی میں لے آئیں ـــــ الرسالہ مشن مسلمانوں کو اسی عظیم خدمت کے لیے تیار کرنے کا مشن ہے۔ الرسالہ کا مشن یہ ہے کہ مسلمان دوبارہ اس ملک میں ہیرو کا کردار ادا کریں جس طرح انھوں نے ماضی میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔

اس ابتدائی تقریر کے بعد لوگ بڑی تعداد میں الرسالہ بک اسٹال پر گئے۔ اور وہاں سے کتابیں حاصل کیں۔ بہت سے لوگوں نے حاصل کردہ کتابوں پر مصنف کے آٹوگراف لیے۔

۱۰ مئی کو نماز عشاء کے بعد ایک عمومی اجتماع تھا۔ اس کا انتظام مدینہ ایجوکیشن سنٹر میں کیا گیا تھا۔ مسٹر کے۔ چندریہ (آئی اے ایس) اس کے صدر اور مسٹر حسن الدین احمد (آئی اے ایس) مہمان خصوصی تھے۔ یہاں میری مفصل تقریر ہوئی۔ اس تقریر کا عنوان "نیو ورلڈ آڈر اور اسلام" تھا۔ میں نے بتایا کہ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ امریکہ اپنے انٹرسٹ کا دوست نمبر ایک ہے۔ یہی معاملہ تمام دوسرے گروہوں کا ہے۔ یہ کہنا بنیادی طور پر غلط ہے کہ فلاں شخص یا گروہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک اپنے انٹرسٹ کا دوست نمبر ایک ہے۔ اس دنیا میں ہر ایک اپنے انٹرسٹ کے لیے دوڑ رہا ہے۔ اس دوڑ میں اگر کسی کی طرف سے ہم کو ٹھوکر لگ جائے تو اس کا سبب دشمنی نہیں بلکہ مسابقت ہوگا۔ میں نے کہا کہ دشمن کی اصطلاح میں سوچنا منفی ذہن

پیدا کرتا ہے اور مقابلہ و مسابقت کی اصطلاح میں سوچنا ثبت ذہن۔

اس کے بعد میں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ "اسلام خطرہ میں" ایک بے معنی لفظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب تاریخ میں ایسا انقلاب آچکا ہے کہ اسلام ابدی طور پر خطرہ سے باہر چلا گیا ہے۔ دنیا کے لوگ جو بھی کارروائی کریں، حتی کہ اگر وہ اسلام کے خلاف مہم چلائیں تب بھی اس کا فائدہ اسلام ہی کو پہنچے گا۔

حیدرآباد میں میری ملاقات ایک صنعت کار جناب حبیب محمد صاحب سے ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ جب کوئی نوجوان جاب کے لیے میرے پاس آتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ میرے پاس تمہارے لیے کام ہے۔ اور جو بھی سلری تمہارے دل میں ہو اس کو دینے کے لیے میں تیار ہوں مگر یہ جان لو کہ مجھے مین کی نہیں، بلکہ سپر مین کی ضرورت ہے۔ اگر تم میرے یہاں کام کرو تو بار بار تمہارے سامنے ابنارمل حالات آئیں گے۔ اس ابنارمل کو نارمل بنانا، یہ تمہاری ذمہ داری ہوگی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آج کی دنیا میں روزگار کی کمی نہیں۔ کمی اس بات کی ہے کہ لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعہ اپنے اندر وہ استعداد پیدا نہیں کرتے جو ان کو موجودہ معنوں میں ایک مفید شخصیت بنا دے، اور پھر وہ کسی کے لیے "سپر مین" بن کر اس سے سپر سلری حاصل کر سکیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ فلاں صاحب نے لکھا ہے کہ الرسالہ تو محض چٹکلوں کا مجموعہ ہوتا ہے جو زیادہ سے زیادہ وقت گزاری کا ایک دلچسپ ذریعہ ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو میرے نزدیک الرسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑا بڑا سبق نکالا جاتا ہے اور اسی لیے مجھ کو الرسالہ پسند ہے۔

میں نے کہا کہ دونوں تبصروں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ جس بات کو مذکورہ صاحب نے بھونڈے لفظوں میں کہا تھا اسی کو آپ خوب صورت لفظوں میں کہہ رہے ہیں۔ آپ دونوں صاحبان کے تبصرہ کا خلاصہ یہ ہے کہ الرسالہ میں جو چیز ہوتی ہے وہ بس ایک ادبی اسلوب ہے۔ حالانکہ حقیقۃً یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ قرآنی اسلوب ہے۔ وہ ایک ایمانی نوعیت کی چیز ہے نہ کہ محض ادبی نوعیت کی چیز۔

قرآن و حدیث میں مختلف الفاظ میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ مومن وہ ہے جو واقعات کو عبرت کی نظر سے دیکھے اور ان سے نصیحت حاصل کرے۔ اس طریقہ کے لیے قرآن میں خاص لفظ

توسم آیا ہے (ان فی ذلک لآیات للمتوسمین) الحجر ۷۵

توسم سے مراد استدلال بالعلامات ہے (الجامع لاحکام القرآن ۱۰/۴۳) یعنی ظاہری علامت سے اندرونی حقیقت کو معلوم کرنا، اسی کو عبرت پذیری کہا جاتا ہے۔ ایک آدمی وہ ہے جو اتنا ہی جانے جتنا وہ دیکھے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو دیکھنے والی چیز کو دیکھ کر نہ دکھائی دینے والی چیز کا پتہ نکالے۔ ایسے شخص کو قرآن میں متوسم کہا گیا ہے۔ الرسالہ درحقیقت لوگوں کے اندر توسم کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ اسی توسم سے وہ ربانی فائدہ حاصل ہوتا ہے جس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ "لمحہ بہ لمحہ بدلتی ہوئی اس دنیا میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے"۔ میں نے کہا کہ لمحہ بہ لمحہ تبدیلی کی کوئی مثال دیجئے۔ وہ کوئی مثال نہ دے سکے۔ میں نے کہا کہ جب بھی آپ اس قسم کا کوئی بیان دیں تو پہلے یہ سوچ لیجئے کہ کیا اس کی کوئی مثال آپ کے پاس موجود ہے۔ اگر اس کے حق میں کوئی واضح مثال موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں آپ کو بولنے کے بجائے چپ رہنا چاہئے۔ کیوں کہ تائیدی مثال کے بغیر اس قسم کے بیان کی کوئی علمی حیثیت نہیں۔

حیدرآباد میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اس مضمون پر اعتراض کیا جو الرسالہ جون ۱۹۹۱ میں "زیادہ صحیح اصول" کے عنوان سے چھپا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری قوم کے پاس تو شاندار نمونے ہیں جب کہ ایک شخص نے یہ کہہ کر جان دے دی کہ "شیر کی زندگی گیدڑ کی سوسالہ زندگی سے بہتر ہے"۔ اب آپ قوم کو شیر کے نمونہ سے ہٹا کر گیدڑ کے نمونہ پر ڈال دینا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ شیر کا نمونہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ شیر کا نمونہ یہی ہے کہ حریف کے مقابلہ میں پسپائی اختیار نہ کرو بلکہ بے خوف ہو کر لڑ جاؤ۔ میں نے کہا کہ یہ شیر کا نمونہ نہیں، یہ تو کسی شاعر کی مضمون بندی ہے یا کسی خطیب کی الفاظی۔

میں نے کہا کہ شاید آپ نے ٹی وی نہیں دیکھا۔ مگر افریقہ اور ہندستان کے جنگلوں میں جو شیر رہتے ہیں ان کی حقیقی فلم امریکہ کی جیوگرافیکل سوسائٹی نے کروروں ڈالر خرچ کر کے بنائی ہے اور وہ ٹی وی پر آتی رہتی ہے۔ اس کو میں نے تفصیل سے دیکھا ہے۔ آپ نے اگر نہ دیکھا ہو تو آپ بھی دیکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر انتہائی حد تک ٹکراؤ سے دور رہنے والا جانور ہے۔ وہ انتہائی

طاقت ور ہونے کے باوجود ہمیشہ ٹکراؤ کو اوائڈ کرنے کی پالیسی اختیار کرتا ہے۔ وہ صرف اس وقت اپنی طاقت استعمال کرتا ہے جب کہ عملاً اس کو زخمی کر دیا گیا ہو۔

اس فلم میں آپ دیکھیں گے کہ شیر چل رہا ہے۔ سامنے سے اس کو ہاتھی آتا ہوا دکھائی دیا تو اس نے اپنے راستہ کو بدل دیا۔ حتی کہ بھینسوں اور جنگلی کتوں سے بھی وہ کترا کر چلتا ہے۔ ہرن اور چیتل شیر کے پسندیدہ شکار ہیں۔ ایک بھوکا شیر شکار کے لیے نکلتا ہے۔ سامنے ہرنوں اور چیتلوں کا غول کھڑا ہوا ہے۔ مگر وہ کبھی غول پر حملہ نہیں کرے گا۔ وہ صرف اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ کسی جانور کو تنہا پالے۔ ایک بار میں نے دیکھا کہ ایک شیر نے پانی کے کنارے شکار کیا۔ اس کے بعد اس کا شکار ایک مگرمچھ پکڑ کر لے جانے لگا۔ اس وقت شیر نے مگرمچھ سے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ حالانکہ شیر اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ ایک بار میں نے دیکھا کہ اس نے سوا سو کیلو کا ایک سانبھر اپنے منہ میں دبایا اور اسی طرح پکڑے ہوئے دریا کو پار کر کے دوسری طرف چلا گیا۔

شیر کا طریقہ یہ ہے کہ طاقت ہو تو تب بھی نہ لڑو۔ اور کچھ لوگوں نے شیر کے نام پر یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ طاقت نہ ہو تب بھی لڑ جاؤ۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کی مین اسٹریم سے میں بھی الگ ہوں اور آپ بھی الگ ہیں ———

میں نے کہا کہ آپ اپنے بارہ میں جو بھی چاہیں کہیں مگر میں تو مسلمانوں کی مین اسٹریم سے بال برابر بھی الگ نہیں ہوں۔ میں تو مین ان کی مین اسٹریم میں شامل ہوں۔ انھوں نے کہا کہ پھر آپ بعض علماء پر تنقید کیوں کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ تنقید کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی مین اسٹریم سے الگ ہو گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا اشرف علی تھانوی سیاسی معاملہ میں ایک دوسرے کے ناقد تھے مگر دونوں مکمل طور پر مسلمانوں کی مین اسٹریم میں شامل تھے۔

پھر میں نے کہا کہ مین اسٹریم کا مطلب، اہل سنت والجماعت کے مسلک میں شامل ہونا ہے۔ میں کسی بھی اختلاف کے بغیر اہل سنت والجماعت کے مسلک پر قائم ہوں۔ اس سے ذرہ برابر بھی میں الگ نہیں۔ البتہ کسی مقصد کے حصول کے لیے کیا طریق کار اختیار کیا جائے، اس میں بعض اوقات میں دوسروں سے اختلاف کرتا ہوں۔ اس قسم کا اختلاف عین جائز ہے۔ وہ ہمیشہ صحابہ، تابعین، محدثین،

انبیاء اور علماء کے درمیان جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔

مثال کے طور پر مجھے شاہ بانو تحریک سے اختلاف تھا۔ مگر یہ اختلاف اصل مسئلہ کے بارہ میں نہیں تھا بلکہ صرف طریق کار کے بارہ میں تھا۔ میرا کہنا تھا کہ ہماری تحریک کا رخ سپریم کورٹ کی طرف نہیں بلکہ مسلمانوں کی فکری اور معاشرتی اصلاح کی طرف ہونا چاہیے۔ اسی طرح میں نے بابری مسجد تحریک کے معاملہ میں اختلاف کیا۔ یہاں بھی میرا اختلاف اصل مسئلہ کے بارہ میں نہ تھا بلکہ میرا کہنا یہ تھا کہ ہماری تحریک کا میدان سڑکوں کا مظاہرہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہمیں اپنی تحریک کو عدالت اور گفت وشنید کے دائرہ میں رکھ کر اسے غیر احتجاجی انداز میں چلانا چاہیے۔

۱۸ مئی ۱۹۹۲ کی صبح کو حیدرآباد سے دہلی کے لیے روانگی ہوئی۔ یہ سفر انڈین ایر لائنز کی فلائٹ ۴۴۴ کے ذریعہ طے ہوا۔ صبح کو قیام گاہ پر فجر کے بعد مجھے نیند آگئی۔ نیند کھلی تو دیر ہو گئی تھی۔ جہاز کا وقت نکل قریب آگیا تھا۔ اگر اندرون شہر سے چل کر ایر پورٹ پہنچنا ہوتا تو جہاز کا پانا مشکل تھا۔ مگر اس وقت میں جبیب بھائی کے بیگم پیٹ کے مکان میں ٹھہرا تھا۔ یہاں سے ایر پورٹ بذریعہ کار دو منٹ کے فاصلہ پر ہے۔ چنانچہ وقت پر ایر پورٹ پہنچ گیا۔

اس اعتبار سے یہ مکان اچھا ہے کہ وہ ایر پورٹ کے بہت قریب ہے۔ مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس قربت کی وجہ سے یہاں ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ بھی کافی سنائی دیتی ہے۔ یہی اس دنیا کا قانون ہے۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ ایک کانٹا شامل ہوتا ہے اور ہر کانٹے کے ساتھ ایک پھول۔

انڈین ایر لائنز کی میگزین سواگت کا شمارہ مئی ۱۹۹۲ جہاز کے اندر موجود تھا۔ اس کے چند مضامین دیکھے۔ ایک مضمون دبئی کے بارہ میں تھا۔ اس سلسلہ میں مختلف واقعات درج تھے۔ ایک خاتون اپنے سفر کے دوران دبئی سے گزریں۔ وہاں انھوں نے اپنے بچوں کے لیے مختلف قسم کے تفریحی سامان خریدے۔ انھوں نے اپنے تین سالہ بچہ کو چاکلیٹ کے بہت سے پیکٹ دیے۔ اس کے بعد ان کا بچہ اپنے نرسری اسکول کے ایک ساتھی سے ٹیلی فون پر کہہ رہا تھا کہ تم میرے گھر پر آؤ تو میں تم کو دبئی کے سندر چاکلیٹ دوں گا جو میری ممی دبئی سے لائی ہے:

You want to come to my house? I'll give you lovely chocolates from Dubai. My mummy went to Dubai and bought me the chocolate.

دوسرے بچے نے اپنے چمک دار کھلونوں کی تعداد اپنے دوست کو دینے کے لیے اس کا نمبر ملایا اور مجھ فخر انداز میں ٹیلی فون پر کہا کہ میری ممی دبئی گئی تھی، اور وہاں سے وہ میرے لیے بہت سے کار اور ایک جہاز اور ایک جیپ خرید کر لائی ہے :

My mummy went to Dubai and she bought me so many cars, and a plane, and a jeep.

موجودہ زمانہ میں یہی حال تمام گھروں کا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے ان کے گھر لذت اور تفریح کے تمام سامان جمع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بچے ہر وقت دنیوی تماشوں میں گم رہتے ہیں۔ گھر میں چاکلیٹ اور کھلونوں کا ماحول ہے۔ ہر گھر دنیا کی یاد دلانے کا کارخانہ بنا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں بچوں کے اندر آخرت پسندی کا مزاج پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۹۲ کو صبح ۱۰ بجے ہمارا جہاز دہلی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ اعلانات کے مطابق اس کے ہوا باز کیپٹن مصطفےٰ تھے۔ میرا خیال تھا کہ دہلی پہنچ کر ان سے ملاقات کروں گا۔ مگر جہاز جب اپنی منزل پر پہنچتا ہے تو اترنے والوں کی عجلت کی وجہ سے جہاز میں ایک ہنگامی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ہنگامہ میں ملاقات کی بات میرے ذہن سے نکل گئی اور میں ان سے ملاقات نہ کر سکا۔

مسلمانوں کے ہر پرچہ میں مسلمانوں کی محرومیوں اور حق تلفیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ مگر میں اس قسم باتوں کو ناقابل ذکر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ کوئی سماج اس قسم کے واقعات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ جن چیزو محرومی یا حق تلفی کہا جاتا ہے وہ قدرت کا ایک سادہ قانون ہے جو ہمیشہ اور ہر انسانی آبادی میں ام رہتا ہے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہر محرومی میں ہمیشہ یافت کے پہلو موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ انڈین کی اعلیٰ سروسوں میں مسلمان داخل ہو رہے ہیں۔ نئی اقتصادی پالیسی کے بعد کچھ مسلمانوں نے انٹر ایر کمپنی بھی بنائی ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور کو بھرپور طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۸ مئی کو سفر سے واپس ہو کر دہلی پہنچا تو لاہور کے دو اخبار وفاق اور نوائے وقت (۷ امئی بذریعہ ڈاک ملے۔ دونوں کے صفحہ اول پر بھارت میں ہونے والے "مسلم کش فساد" کی خبر تھی، وفا

"تعمیری صحافت کا پاسدار" ہے ، اس کے صفحہ اول کی سب سے زیادہ جلی سرخی یہ تھی ——— "نئی دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ، دار الحکومت فوج کے حوالے کر دیا گیا"

مانیٹرنگ ڈیسک کے حوالے سے خبر میں بتایا گیا تھا کہ بھارتی حکومت مسلمانوں کے جان ومال کا تحفظ کرنے میں ناکام ہوگئی۔ ہندو بلوائی پولیس کی شہ پر من مانی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ مسلح انتہا پسند ہندوؤں نے اچانک مسلم علاقوں کا محاصرہ کر کے حملوں کا آغاز کر دیا۔ مسلمانوں کی املاک کو نذر آتش کر دیا گیا۔ مسلم آبادیوں میں خوف وہراس پھیل گیا۔ بھارت ایک مرتبہ پھر بدترین مسلم کش فسادات کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ خدشہ ہے مسلم کش فسادات کی یہ مہم پورے بھارت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ نوائے وقت میں بھی اسی قسم کی خبر صفحہ اول پر شائع کی گئی ہے۔

اس سنسنی خیز رپورٹ میں جس مسلم کش فساد کا ذکر کیا گیا ہے ، اس کا "نئی دہلی" سے کوئی تعلق نہیں جہاں میں پچھلے دس سال سے رہ رہا ہوں۔ اس فساد کا تعلق نئی دہلی سے نہیں بلکہ جمنا پار کی ایک بستی سے ہے جس کو سیلم پور کہا جاتا ہے ، اور ایک شخص کے بقول ، جس کا زیادہ صحیح نام سلم پور ہونا چاہیے۔ زیر ذکر مذکورہ رپورٹ میں اس واقعہ کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے ، اس کا اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ نئی دہلی کے اخبار قومی آواز کے نمائندہ مسٹر نصرت ظہیر نے فساد زدہ علاقہ کا دورہ کرنے کے بعد قومی آواز کے شمارہ ، ۱ مئی ۱۹۹۲ میں مفصل رپورٹ چھاپی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فساد ایک مسلمان کی نادانی کی بنا پر پیش آیا۔ اس فساد کا اصل سبق یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہوش مندی کے ساتھ جینا سکھایا جائے نہ کہ خلاف واقعہ طور پر مذکورہ قسم کی خبریں چھاپ کر ان کے اندر فرضی خوف پیدا کیا جائے۔

دوسرے بچے نے اپنے چمک دار کھلونوں کی خبر اپنے دوست کو دینے کے لیے اس کا نمبر ملایا اور پھر فخر کے انداز میں ٹیلی فون پر کہا کہ میری ممی دبئی گئی تھی، اور وہاں سے وہ میرے لیے بہت سے کار اور ایک جہاز اور ایک جیپ خرید کر لائی ہے:

My mummy went to Dubai and she bought me so many cars, and a plane, and a jeep.

موجودہ زمانہ میں یہی حال تمام گھروں کا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے ان کے گرد لذت اور تفریح کے تمام سامان جمع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ بچے ہر وقت دنیوی تماشوں میں گم رہتے ہیں۔ ہر گھر میں چاکلیٹ اور کھلونوں کا ماحول ہے۔ ہر گھر دنیا کی یاد دلانے کا کارخانہ بنا ہوا ہے۔ ایسی حالت میں بچوں کے اندر آخرت پسندی کا مزاج پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۹۲ کو صبح ۱۰ بجے ہمارا جہاز دہلی ایرپورٹ پر اتر گیا۔ اطلانات کے مطابق، اس کے ہوا باز کیپٹن مصطفےٰ تھے۔ میرا خیال تھا کہ دہلی پہنچ کر ان سے ملاقات کروں گا۔ مگر جہاز جب اپنی منزل پر پہنچتا ہے تو اترنے والوں کی عجلت کی وجہ سے جہاز میں ایک ہنگامی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ہنگامہ میں ملاقات کی بات میرے ذہن سے نکل گئی اور میں ان سے ملاقات نہ کر سکا۔

مسلمانوں کے ہر پرچہ میں مسلمانوں کی محرومیوں اور حق تلفیوں کا ذکر ہوتا ہے۔ مگر میں اس قسم کی باتوں کو ناقابلِ ذکر سمجھتا ہوں۔ کیونکہ کوئی سماج اس قسم کے واقعات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ جن چیزوں کو محرومی یا حق تلفی کہا جاتا ہے وہ قدرت کا ایک سادہ قانون ہے جو ہمیشہ اور ہر انسانی آبادی میں جاری رہتا ہے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہر محرومی میں ہمیشہ یافت کے پہلو موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ انڈین ایلائڈ کی اعلیٰ سروسوں میں مسلمان داخل ہو رہے ہیں۔ نئی اقتصادی پالیسی کے بعد کچھ مسلمانوں نے انٹرنیشنل ایرکمپنی بھی بنائی ہے۔ موجودہ دنیا میں زندگی کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مسائل کو نظر انداز کیا جائے اور مواقع کو بھرپور طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جائے۔

۱۸ مئی کو سفر سے واپس ہو کر دہلی پہنچا تو لاہور کے دو اخبار وفاق اور نوائے وقت (۱۷ مئی ۲) بذریعہ ڈاک ملے۔ دونوں کے صفحہ اول پر بھارت میں ہونے والے "مسلم کش فساد" کی خبر تھی، وفاق

"تعمیری صحافت کا پاسدار" ہے۔ اس کے صفحہ اول کی سب سے زیادہ جلی سرخی یہ تھی ــــــــ "نئی دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام، دار الحکومت فوج کے حوالے کر دیا گیا"

ماینیٹرنگ ڈسک کے حوالے سے خبر میں بتایا گیا تھا کہ بھارتی حکومت مسلمانوں کے جان ومال کا تحفظ کرنے میں ناکام ہو گئی۔ ہندو بلوائی پولیس کی شہہ پر من مانی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ مسلح انتہا پسند ہندوؤں نے اچانک مسلم علاقوں کا محاصرہ کر کے حملوں کا آغاز کر دیا۔ مسلمانوں کی املاک کو نذر آتش کر دیا گیا۔ مسلم آبادیوں میں خوف وہراس پھیل گیا۔ بھارت ایک مرتبہ پھر بدترین مسلم کش فسادات کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ خدشہ ہے کہ مسلم کش فسادات کی یہ مہم پورے بھارت کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ نوائے وقت میں بھی اسی قسم کی خبر صفحہ اول پر شائع کی گئی ہے۔

اس سنسنی خیز رپورٹ میں جس مسلم کش فساد کا ذکر کیا گیا ہے، اس کا "نئی دہلی" سے کوئی تعلق نہیں جہاں میں پچھلے دس سال سے رہ رہا ہوں۔ اس فساد کا تعلق نئی دہلی سے نہیں بلکہ جمنا پار کی ایک بستی سے ہے جس کو سیلم پور کہا جاتا ہے، اور ایک شخص کے بقول، جس کا زیادہ صحیح نام سلم پور ہونا چاہیے۔ نیز یہ کہ مذکورہ رپورٹ میں اس واقعہ کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس کا اصل واقعہ سے کوئی تعلق نہیں۔ نئی دہلی کے اخبار قومی آواز کے نمائندہ مسٹر نصرت ظہیر نے فساد زدہ علاقہ کا دورہ کرنے کے بعد قومی آواز کے شمارہ ۱ مئی ۱۹۹۲ میں مفصل رپورٹ چھاپی ہے جو میرے پاس موجود ہے۔ تفصیل کے طالب اس کو دیکھ سکتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فساد ایک مسلمان کی نادانی کی بنا پر پیش آیا۔ اس فساد کا اصل سبق یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہوش مندی کے ساتھ جینا سکھایا جائے نہ کہ خلاف واقعہ طور پر مذکورہ قسم کی خبریں چھاپ کر ان کے اندر فرضی خوف پیدا کیا جائے۔

پیرو، پرستار

لکھنؤ کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران میں نے اقبال پر تنقید کی۔ میں نے کہا کہ اقبال کا شعر ہے : لڑا دے ممولے کو شہباز سے۔ یعنی تم کمزور ہو تب بھی طاقت ور سے لڑ جاؤ۔ میں نے کہا کہ یہ محض شاعرانہ خیال آرائی ہے۔ اس کا تعلق نہ عقل سے ہے اور نہ اسلام سے۔

مذکورہ مسلمان غصہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ آپ اقبال پر تنقید کرتے ہیں۔ اقبال تو یہ تھے، اقبال تو وہ تھے۔ میں نے کہا کہ آپ لوگ اقبال کے پرستار ہیں مگر آپ لوگ اقبال کے پیرو نہیں۔ اگر واقعۃً آپ اقبال کے پیرو ہیں تو ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب آپ کے پڑوس میں بابری مسجد کو توڑ کر اس کی جگہ مندر بنایا گیا تو اقبال کے مداحوں کو لے کر آپ کیوں نہیں اجودھیا میں گھس پڑے۔ آپ لوگ اگرچہ "مولا" تھے اور کارسیوک آپ کے مقابلہ میں "شہباز" تھے۔ مگر آپ کے اقبال تو یہی کہتے ہیں کہ تم خواہ ممولا ہو، تب بھی تم شہباز سے لڑ جاؤ۔ آپ لوگ اجودھیا میں داخل ہو کر کارسیوکوں سے ٹکرا جاتے۔ اگر وہ لوگ آپ کو مار ڈالتے تب بھی آپ کامیاب تھے۔ کیوں کہ آپ کے محبوب اقبال نے کہا ہے :

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ "اکابر" کی تنقید پر غصہ ہوتے ہیں، ان کے غصہ کی حقیقت کیا ہے۔ یہ لوگ سب کے سب اپنے اکابر کے پرستار ہیں، وہ اپنے اکابر کے پیرو نہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں جو واقعۃً اکابر کے کہے پر چل رہا ہو۔ البتہ اگر کوئی شخص ان کے مفروضہ اکابر پر کوئی نقد کر دے تو وہ بھڑک اٹھیں گے۔ ان کا یہ رویہ پرستاری کی بنا پر ہے، وہ پیروی کی بنا پر نہیں۔ اسلام میں "اکابر" کی کوئی کیٹگری نہیں۔ تاہم اگر کوئی شخص کچھ افراد کو اکابر کا درجہ دے تب بھی، اسلام کے مطابق، ان کی صرف پیروی جائز ہوگی، ان کی پرستاری کے لیے اسلام میں کوئی جواز نہیں۔ لوگ اکابر کے پرستار ہیں، اسی لیے وہ اکابر کی تنقید پر غصہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ اکابر کے پیرو ہوتے تو ہرگز ایسا نہ ہوتا کہ وہ اکابر کی تنقید پر بھڑک اٹھیں۔

خبرنامہ اسلامی مرکز ۹۲

۱ مسٹر یشونت دیش مکھ نے "لکھنؤ فیچرس" کے لئے ۱۰ ستمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ بہت تفصیلی انٹرویو تھا۔ اس کا تعلق زیادہ تر ہندو مسلم مسائل اور انڈیا کے مستقبل سے تھا۔ یہ انٹرویو ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے شمارہ ۸ اکتوبر ۱۹۹۰ میں چھپا ہے۔

۲ رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ الرسالہ مشن کے ساتھی بے معنی اور سطحی مخالفتوں کے باوجود ہر جگہ مشن کا تعمیری کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً شانتی یاترا کے دوران ۱۹ دسمبر ۱۹۹۲ کو کچھ گھنٹے ناندیڑ میں گزارنے کا موقع ملا۔ یہاں حلقہ الرسالہ سے عمومی ملاقات نہ ہوسکی۔ تاہم کرفیو کے باوجود جناب جمال الدین صدیقی خطیب اور جناب محمد زین الدین قاضی ہوٹل میں آکر ملے۔ وہ الرسالہ مشن سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ مقامی حالات معلوم ہوئے۔ اللہ کے فضل سے وہ اور ان کے ساتھی کچھ لوگوں کی مخالفت کے باوجود الرسالہ مشن کے کام کو سرگرمی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اللہ کی توفیق سے انھوں نے اپنی زندگیاں اس دینی مشن میں پوری طرح لگادی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اور تمام کارکنوں کی ہر طرح مدد فرمائے۔

۳ اورنگ آباد کی ایک تعلیمی اور رفاہی تنظیم "اورنگ آباد پیس ایسوسی ایشن" کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اورنگ آباد کا سفر کیا۔ ۴-۵ ستمبر ۱۹۹۳ کو وہاں چند پروگرام ہوئے جس میں خطاب کا موقع ملا۔ ۵ ستمبر کی شام کو "اسلام دین رحمت" کے موضوع پر تقریر کی۔ اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، ہر مذہب کے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس سفر کی روداد انشاء اللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کردی جائے گی۔

۴ ہندی اخبار نو بھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اسرار خاں نے ۱۳ ستمبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم لیڈر شپ اور مسلم سیاست سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمانوں کا مستقبل خود مسلمانوں کے اپنے عمل پر موقوف ہے۔ نہ کہ کسی ایک یا دوسری پارٹی کے رویہ پر۔

۵ انگریزی روزنامہ پانیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز احمد نے ۵ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز

کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر "فسادی کی تاریخ" سے تھا۔ اس سلسلہ میں ضروری تفصیلات انھیں بتائی گئیں۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ "قضا" کا مسئلہ فتوے کے معاملہ سے بالکل الگ ہے۔ ایک شخص کو قابل سزا مجرم قرار دینے کا فتویٰ کوئی مفتی نہیں جاری کر سکتا۔ اس قسم کے معاملہ کا تعلق عدالت سے ہے۔ عدالت میں ضروری کارروائی کے بعد ہی کوئی قاضی یا جج کسی مجرم کے لئے مقرر سزا کا اعلان کر سکتا ہے۔ خواہ اس کے جرم کا تعلق کسی مذہبی معاملہ سے ہو یا سماجی معاملہ سے۔ یہ انٹرویو پانیر کے شمارہ ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ میں شائع ہوا ہے۔

۶ صدر اسلامی مرکز نے ایک پروگرام کے تحت ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۳ میں اٹلی اور انگلینڈ کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں کانفرنس میں شرکت۔ خطابات اور ملاقات کا موقع ملا۔ اس کی روداد سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۷ ہندی اخبار نو بھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اسرار خاں نے ۶ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلمانان ہند سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ انڈیا دوسرے ملکوں سے مختلف نہیں۔ مسلمان جس طرح دوسرے ملکوں میں وہاں کے حالات سے ایڈجسٹ کر کے رہتے ہیں اسی طرح وہ انڈیا کے حالات سے ایڈجسٹ کر کے رہیں تو یہاں بھی ان کو وہی شانتی مل سکتی ہے جو انھیں دوسرے ملکوں میں ملی ہوئی ہے۔

۸ ٹائمس آف انڈیا کے نمائندہ مسٹر فیروز نے ۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ کچھ مفتی صاحبان آجکل جس طرح کسی کے بارہ میں قتل اور پھانسی کا فتویٰ جاری کر رہے ہیں وہ سراسر غیر اسلامی ہے۔ کسی جرم پر سزا کا فیصلہ دینا قاضی کا کام ہے، وہ ہرگز مفتی کا کام نہیں۔ کوئی مفتی اگر کسی کو مجرم بتا کر اس کے لئے سزا کا فتویٰ جاری کرتا ہے تو وہ خود سب سے بڑا مجرم ہے۔

۹ یو این آئی کے نمائندہ مسٹر اقبال نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر تازہ حالات اور مسلمانوں سے تھا۔ انھیں بتایا گیا کہ

اسلامی نقطۂ نظر سے صرف یہ کافی نہیں کہ جو قدم اٹھایا جا رہا ہے وہ بظاہر صحیح ہے۔ اسی کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ نتیجہ کے اعتبار سے وہ مفید ہے یا مضر۔

۱۰ ہفت روزہ نئی دنیا (دہلی) کے نمائندہ مسٹر کرمانی اور ان کے ساتھیوں نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع "اسلامی کورٹ" کے قیام کے بارہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا حالیہ فیصلہ تھا۔ ان کو بتایا گیا کہ اس فیصلہ کا فائدہ کچھ خود ساختہ لیڈروں کو مل سکتا ہے مگر عام لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ ملنے والا نہیں۔

۱۱ انگریزی روزنامہ پائنیر کے نمائندہ مسٹر اعجاز نے ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر اس سے تھا کہ مسلمان کے اوپر شریعت نے کیا کیا ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ اور حالات کے فرق سے ان ذمہ داریوں میں کس قسم کی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ یہ انٹرویو پائنیر کے شمارہ ۱۷ اکتوبر میں شائع ہوا ہے۔

۱۲ کانسٹی ٹیوشن کلب نئی دہلی میں ۱۵ ـ ۱۶ اکتوبر ۱۹۹۳ کو نیشنل سمپوزیم ہوا۔ اس کا موضوع تھا: انڈین کلچر اینڈ نیشنل ہارمنی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے ۱۵ اکتوبر کے اجلاس میں شرکت کی اور "کی نوٹ ایڈریس" کے طور پر وہاں ایک تقریر کی۔ اس تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک میں یک جہتی صرف ٹالرنس کے ذریعہ لائی جا سکتی ہے۔ اتحاد ہمیشہ اختلاف کو برداشت کرنے سے آتا ہے نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔

۱۳ ہندی ہفت روزہ نئی زمین کے نمائندہ مسٹر کرمانی اور مسٹر شاہد نے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ بابری مسجد کے مسئلہ میں جو فارمولا الرسالہ کی طرف سے دیا گیا تھا آج ہندو اور مسلمان دونوں عملی طور پر اس کو اختیار کر چکے ہیں۔

۱۴ دوردرشن (نئی دہلی) کی ٹیم نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر حضرت بل کے حادثہ کے پس منظر میں مسجد کے اسلامی حکم کے بارہ میں تھا۔ اس انٹرویو کا سوال وجواب انگریزی زبان میں ہوا۔ ۱۹ اکتوبر اور ۲۰ اکتوبر کے پروگرام میں اس کو دوردرشن کے نیشنل چینل پر دکھایا گیا۔

Releasing in January 1994

INDIAN MUSLIMS

The Need For A Positive Outlook

By Maulana Wahiduddin Khan

Man must run the gauntlet of adversity in this life, for that is in the very nature of things. But repeated emphasis on the darker side of life, with no mention of brighter prospects ahead can lead only to discouragement, depression and inertia. The better way to find solutions to the problems besetting us would be to seek out and lay stress on whatever opportunities present themselves, so that those upon whom fortune has not smiled may feel encouraged to take the initiative in improving themselves and their lot in life.

In the light of concrete realities, this book focuses, therefore, on how, in entering upon the more positive avenues open to them, Muslims may avail themselves of the same kind of opportunities right here in India as they would find at any other point on the globe. For them treading this path is treading the path of wisdom.

Pages 200; Size 14.5cm x 22cm

Price Rs. 175 (Hardbound)
Rs. 65 (Paperback)

ISBN 81-85063-80-X (HB)
ISBN 81-85063-81-8 (PB)

Published by
AL-RISALA BOOKS
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110013
Tel: 4611128 Fax: 91-11-4697333

Distributed by
UBS Publishers' Distributors Ltd.
5 Ansari Road, New Delhi 110002
Bombay Bangalore Madras Calcutta Patna Kanpur London

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

مئی ۱۹۹۴، شمارہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax : 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 □ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

صبر کی اہمیت

قرآن میں صبر کی غیر معمولی عظمت بیان ہوئی ہے۔ صبر کو اولو العزم پیغمبروں کا طریقہ بتایا گیا ہے (الاحقاف ۳۵) صبر پہ اعلیٰ ترین کامیابیوں کی بشارت ہے (الاعراف ۱۳۷) صبر قیادت عالم کا زینہ ہے (السجدہ ۲۴) صبر حفاظت کا یقینی ذریعہ ہے (یوسف ۹۰) حتیٰ کہ صبر وہ چیز ہے جو آدمی کو بے حساب اجر کا مستحق بناتا ہے (الزمر ۱۰)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی شخص کو صبر سے بہتر اور صبر سے بڑا عطیہ نہیں دیا گیا (وما اعطی احد عطاء خیرا و اوسع من الصبر) عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ہم نے اپنی زندگی کا سب سے بہتر صبر کے ذریعہ پایا (وجدنا خیر عیشنا بالصبر) ابن حجر العسقلانی نے صبر کی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صبر تمام اچھے اخلاق کا جامع ہے (فالصبر جامع لمکارم الاخلاق) فتح الباری ۱۱/ ۳۰۹ - ۳۱۱

صبر نہ بزدلی ہے اور نہ وہ بے عملی ہے۔ صبر ایک مثبت قدر ہے۔ صبر بلند ترین ذہنی حالت ہے۔ صبر سب سے بڑا عمل ہے۔ صبر انسانیت کا تکمیلی درجہ ہے۔

آپ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں، کچھ لوگ آتے ہیں اور آپ کے خلاف اشتعال انگیز نعرہ لگا دیتے ہیں۔ اب آپ کے لیے ردعمل کے دو مختلف طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ نعرہ کو سن کر بھڑک اٹھیں۔ آنے والوں کے ساتھ جھگڑنے لگیں۔ یہ بے صبری کا طریقہ ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اشتعال انگیز نعرہ کو سنیں مگر آپ اس پر مشتعل نہ ہوں، آپ کا ذہن بدستور اعتدال کی حالت پر باقی رہے۔ آپ اپنے جذبات کو تھام کر یہ سوچیں کہ ایسے موقع پر آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ دوسرا طریقہ صبر کا طریقہ ہے۔

بے صبری بھی عمل ہے، اور صبر بھی عمل ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی بے عملی نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بے صبر آدمی فوری جذبات کے تحت اقدام کر بیٹھتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ اس کے برعکس صبر والا آدمی سوچ سمجھ کر اور مشورہ کر کے اپنے اقدام کا فیصلہ کرتا ہے۔

بے صبری کی روش تباہی کی طرف لے جاتی ہے اور صبر کی روش کامیابی کی طرف۔

صحیح رخ

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ما رأیت مثل النار نام هاربها وما رأيت مثل الجنة نام طالبها۔ حدیث میں ہارب نار (جہنم سے بھاگنے والا) اور طالب جنت (جنت کا چاہنے والا) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ اسلوب بہت بامعنی ہے۔ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ آدمی کی تخلیق اس ڈھنگ پر کی گئی ہے کہ وہ عین اپنی فطرت کے اعتبار سے ہارب جہنم اور طالب جنت بنے۔ اگرچہ اپنی فطرت سے انحراف کر کے وہ اس سے مختلف انسان بن جاتا ہے۔

انسان تکلیف کو برداشت نہیں کر پاتا۔ کسی بھی قسم کا دکھ انسان کے لیے آخری حد تک ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس کے بجائے انسان کا حال یہ ہے کہ وہ راحت کو دل و جان سے چاہتا ہے، وہ خوشی اور لذت کا انتہائی حد تک دلدادہ ہے۔ چنانچہ اس کی پوری زندگی انھیں دو چیزوں کے گرد گھومتی ہے۔ یعنی مصیبت سے اپنے آپ کو بچانا اور دنیا کی راحت کو اپنے لیے جمع کرنا۔

مگر یہ حقیقت پسندی کے خلاف ہے۔ ساری تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لیے نہ تو یہ ممکن ہے کہ وہ تکلیف اور مصیبت سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچالے۔ اور نہ کسی کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ راحت اور خوشی کو حقیقی معنوں میں اپنے لیے حاصل کر لے۔ آدمی ساری زندگی اسی کی دوڑ دھوپ میں لگا رہتا ہے۔ مگر آخر کار اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ نہ مصیبتوں سے محفوظ زندگی حاصل کرتا ہے اور نہ آرام و راحت کی دنیا اپنے لیے بنا پاتا ہے۔

ایک طرف انسان کا یہ جذبہ ہے اور دوسری طرف موجودہ دنیا میں اس کا ناقابل حصول ہونا، ان دونوں باتوں پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس جذبہ کا اصل رخ آخرت کی طرف تھا۔ مگر انسان نے انحراف کر کے اس کو دنیا کی طرف موڑ دیا۔

انسان کی فطرت ہر لمحہ پکار رہی ہے کہ اے شخص تو ہارب جہنم اور طالب جنت بن۔ کامیاب وہ ہے جو اس آواز کو سن کر اس کی پیروی کرے۔ ناکام وہ ہے جو اس آواز کو نہ سنے اور آخر کار ابدی مایوسی کے گڑھے میں جا گرے۔

قدردانی

قرآن کی سورہ محمد (آیت ۲۴) میں کہا گیا ہے کہ کیا یہ منافقین قرآن پر تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔ اس آیت کے ذیل میں تفسیروں میں ایک روایت ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے:

عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ، قَالَ تَلَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا، فَقَالَ شَابٌّ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ بَلْ عَلَيْهَا أَقْفَالُهَا حَتَّى يَكُونَ اللهُ تَعَالَى يَفْتَحُهَا أَوْ يُفَرِّجُهَا۔ فَمَا زَالَ الشَّابُّ فِي نَفْسِ عُمَرَ حَتَّى وَلِيَ فَاسْتَعَانَ بِهِ

(تفسیر ابن کثیر ۴/۱۸۰)

ہشام بن عروہ اپنے باپ سے نقل کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز یہ آیت تلاوت فرمائی (کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر اس کے تالے ہیں) یہ سن کر یمن کے ایک نوجوان نے کہا ہاں، ان کے دلوں پر تالے ہیں، یہاں تک کہ خدا ہی ان تالوں کو کھول دے۔ اس نوجوان کی یاد برابر حضرت عمرؓ کے دل میں رہی۔ یہاں تک کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس سے حکومت کے کام میں مدد لی۔

اسی صفت کا نام قدردانی ہے۔ کسی قوم یا کسی حکومت کا نظام اچھا بننے کی ایک ضمانت یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار لوگ افراد کی صلاحیتوں کو پہچانیں اور ان کی قدردانی کریں، وہ ایسے افراد کو ان کی صلاحیت کی نسبت سے کام کے مواقع فراہم کریں۔ ایسے کسی فرد کو وہ جہاں پائیں اس کو اس طرح اٹھا لیں جس طرح ایک جوہری راکھ میں پڑے ہوئے سونے کے ٹکڑے کو اٹھا لیتا ہے۔

اس کے برعکس جب ذمہ دار لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ افراد کو اس اعتبار سے دیکھیں کہ وہ میرا رشتہ دار ہے یا اجنبی ہے۔ وہ میری تعریف کرتا ہے یا میرا ناقد ہے۔ وہ میرے گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا میرے گروہ سے باہر کا آدمی ہے۔ وہ ہر معاملہ میں مجھ سے اتفاق رائے رکھتا ہے یا کسی معاملہ میں اس کی رائے مجھ سے مختلف ہے۔

کسی قوم یا کسی حکومتی نظام میں اول الذکر صفت والے اشخاص کا اختیار کے مناصب پر ہونا اس قوم یا حکومت کی ترقی کی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس جس قوم یا حکومتی نظام میں ثانی الذکر صفت والے اشخاص اختیار کے مناصب پر قابض ہو جائیں، اس کو کوئی چیز تباہی اور بربادی سے بچانے والی نہیں۔

دینی تعلیم کا مقصد

حدیث میں آیا ہے کہ علم کو حاصل کرنا فرض ہے (ان طلب العلم فریضۃ) علم کی اس اہمیت کی بنا پر اہل اسلام نے ہر دور میں دینی تعلیم کے ادارے قائم کیے۔ ان تعلیمی اداروں کی نوعیت کیا ہے، اس کو بتانے کے لیے قرآن کی حسب ذیل آیت بلاشبہ ایک رہنما آیت ہے :

وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ، فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومہم اذا رجعوا الیہم لعلہم یحذرون۔ (التوبہ ۱۲۲)

اور یہ ممکن نہ تھا کہ اہل ایمان سب کے سب نکل کھڑے ہوں، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک حصہ نکل کر آتا تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کرتا اور واپس جا کر اپنی قوم کے لوگوں کو آگاہ کرتا تاکہ وہ پرہیز کرنے والے بنتے۔

القرطبی نے لکھا ہے کہ طلب علم کے وجوب کے لیے یہ آیت اصل کی حیثیت رکھتی ہے (ھذہ الآیۃ اصل فی وجوب طلب العلم) اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم دین سے مراد حقیقۃً تفقہ فی الدین ہے۔ تعلیم دین کو جانچنے کا قرآنی معیار صرف ایک ہے۔ اور وہ خود قرآن کے لفظ میں، تفقہ ہے۔

القرطبی نے لیتفقھوا کی تشریح یتبصّروا کے لفظ سے کی ہے۔ یعنی تفقہ کا مطلب ہے بصیرت حاصل کرنا۔ الراغب الاصفہانی نے لکھا ہے کہ فقہ کا مطلب علم شاہد سے علم غائب تک پہنچنا ہے، اس طرح فقہ زیادہ خاص ہے علم سے (الفقہ ھو التوصل الی علم غائب بعلم شاھد فھو اخص من العلم) فقہ حاصل کیا کا مطلب ہوتا ہے فہم حاصل کیا (فَقِہَہٗ ای فہمہٗ) لسان العرب میں ہے کہ فقہ اصل میں فہم کو کہتے ہیں (الفقہ فی الاصل الفہم)

اس سے معلوم ہوا کہ دینی مدارس کا اصل نشانہ کیا ہونا چاہیے۔ وہ یہ ہونا چاہیے کہ جو لوگ یہاں تعلیم و تربیت حاصل کر کے نکلیں وہ تفقہ فی الدین کی صلاحیت کے حامل ہوں۔ تفقہ سے مراد جزئیات دین کی مہارت نہیں ہے، بلکہ تفقہ سے مراد اساسات دین میں فہم و بصیرت ہے۔ خاص طور پر یہ صلاحیت کہ آدمی ظاہری معلومات کے ذریعہ باطنی حقائق تک پہنچنے کے قابل ہو جائے۔

فطرت سے انحراف

دلی کی ایک سڑک پر ایک تھری وہیلر ڈرائیور اپنا تھری وہیلر چلاتے ہوئے گزر رہا ہے۔ دوسری طرف سے ایک اور شخص اپنا اسکوٹر (ٹو وہیلر) چلاتے ہوئے آیا۔ اتفاق سے دونوں میں ٹکر ہو گئی۔ دونوں رک گئے۔ اسکوٹر سوار جو بظاہر ایک تاجر تھا، سخت غصہ میں آگیا۔ اس نے تھری وہیلر ڈرائیور کو ڈانٹتے ہوئے کہا: اندھے ہو، تم کو دکھائی نہیں دیتا.......

تھری وہیلر ڈرائیور دونوں ہاتھ جوڑ کر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا کہ بابوجی، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اپنی گاڑی اور پہلے موڑنا چاہیے تھی۔ میں نے موڑنے میں دیر کر دی اس لیے ٹکر ہو گئی۔ اب آپ مجھ کو چھما کر دیں۔ آپ جو بھی سزا دینا چاہیں میں اس کو بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ تھری وہیلر ڈرائیور کے ان الفاظ نے آگ پر پانی کا کام کیا۔ اسکوٹر سوار کا غصہ فوراً ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر چپ ہو کر تھری وہیلر ڈرائیور کو دیکھتا رہا اور اس کے بعد بولا: اچھا جاؤ، اب کبھی ایسا مت کرنا۔

اس واقعہ پر غور کیجئے۔ اسکوٹر سوار جب غصہ میں تھا تو اس کے منہ سے دوسرے الفاظ نکلے اور جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تو وہی آدمی چند منٹ بعد بالکل دوسرے الفاظ بولنے لگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غصہ کے وقت آدمی اپنی حالتِ فطری سے ہٹ گیا تھا، جب غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ دوبارہ اپنی حالتِ فطری پر آگیا۔ آدمی اپنی حالتِ فطری پر ہو تو اس کے اندر سنجیدگی، اعتراف، اور انصاف پسندی کا جذبہ ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی وجہ سے وہ اپنی حالتِ فطری سے ہٹ جائے تو اس وقت یہ تمام شریفانہ جذبات دب جاتے ہیں۔ وہ مصنوعی طور پر سرکشی اور انانیت جیسے جذبات کا معمول بن جاتا ہے۔

جب آپ کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ آپ کے اوپر بگڑ گیا ہے، وہ آپ کے خلاف فساد برپا کرنا چاہتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ اپنی حالتِ فطری سے ہٹ گیا ہے۔ ایسے وقت میں اس آدمی سے ٹکرانا مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ حل یہ ہے کہ اس آدمی کو اس کی حالتِ فطری کی طرف دوبارہ واپس لایا جائے۔ حالتِ فطری پر واپس آتے ہی وہ ایک نارمل انسان بن جائے گا اور پھر آپ کا مسئلہ بھی اپنے آپ حل ہو چکا ہوگا۔

سچی ہوشیاری

حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ کی مسجد نبوی میں تھے۔ صحابہ کی ایک تعداد آپ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں انصار کا ایک نوجوان آیا۔ نوجوان نے آپ سے کچھ سوالات کیے جن کا آپ نے جواب دیا۔ وہ سوال وجواب یہ تھا :

قال یارسول اللہ ایُّ المؤمنین افضل۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احسنہم اخلاقاً۔ ثم قال فایُّ المؤمنین اَکْیَسُ۔ قال اکثرہم للموت ذکراً واکثرہم استعداداً لہ قبل ان ینزل بہ۔ اولئک ہم الاکیاسُ

اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول، مسلمانوں میں سب سے بہتر کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔ پھر اس نے پوچھا کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ سمجھ دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ شخص جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرے اور جو موت آنے سے پہلے سب سے زیادہ اس کی تیاری کرے۔ ایسے ہی لوگ سب سے زیادہ سمجھ دار ہیں۔

جس شخص کا ایمان جتنا زیادہ گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا اخلاق اچھا ہوگا۔ جس آدمی کے دل میں اللہ کا ڈر پیدا ہو جائے۔ وہ بندوں کے ساتھ سلوک کرنے میں انصاف کرنے والا اور مہربانی کرنے والا بن جاتا ہے۔ اور اسی کا دوسرا نام حسن اخلاق ہے۔

موت کو یاد رکھنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی دنیا کو عارضی اور آخرت کو ابدی سمجھتا ہے۔ وہ موجودہ دنیا کی چیزوں میں الجھ کر نہیں رہ گیا ہے بلکہ آنے والی زندگی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہے۔ پھر اس سے زیادہ عقل مند کون ہو سکتا ہے جو ابدی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے بارے میں سوچے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے۔

موت کی یاد کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنے عمل کے بارے میں ہوشیار ہو جاتا ہے۔ یہ مزاج اس کے اندر سے بے اعترافی، ناانصافی، فریب، استغلال اور نمود و نمائش کے جذبات ختم کر دیتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کے غلط اور مصنوعی جذبات ختم ہو جائیں، اس کا ہر قدم صحیح سمت میں اٹھے گا، وہ ایک بے پناہ انسان بن جائے گا۔

اصحاب رسول

اسماعیل السدی کہتے ہیں کہ میں نے ابواراکہ تابعی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے علیؓ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ پھر جب انھوں نے اپنے چہرہ کو داہنی طرف پھیرا تو وہ اس طرح ٹھہرے گویا کہ ان کے اوپر شدید غم ہو۔ وہ اسی طرح رہے یہاں تک کہ جب دھوپ مسجد کی دیوار پر ایک نیزہ کے برابر آگئی تو انھوں نے اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر انھوں نے اپنے ہاتھ کو پلٹتے ہوئے کہا۔ خدا کی قسم میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے۔ آج میں کوئی بھی چیز ان کے مشابہ نہیں دیکھتا۔ ان کا حال یہ تھا کہ وہ خالی ہاتھ، پراگندہ بال اور غبار آلود ہوتے تھے۔ ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بکری کے گھٹنے جیسا نشان ہوتا۔ وہ اپنی رات کو سجدہ اور قیام میں گزارتے۔ ان کی آنکھیں آنسو بہاتیں یہاں تک کہ ان کے کپڑے بھیگ جاتے۔ خدا کی قسم، آج کے لوگوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی رات غفلت میں گزاری۔

مذکورہ روایت کے مطابق، خلیفہ چہارم علی رضی اللہ عنہ نے اصحاب رسول کی جو صفات بتائیں، ان میں سے ایک صفت یہ تھی کہ جب وہ صبح کرتے تو وہ اللہ کو یاد کرتے، اس وقت وہ اس طرح ہلتے جس طرح درخت ہوا چلنے کے وقت ہلتا ہے (فاذا اصبحوا فذکروا اللہ ماعوا کما یمید الشجر فی یوم الریح) البدایہ والنہایہ ۸/۶

حضرت علیؓ نے اپنے اس فقرہ میں اس حالت کو بیان کیا ہے جس کو جسم پر تھرتھری پیدا ہونا کہتے ہیں۔ اللہ سے ڈرنے والا انسان جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے جسم کے اوپر مخصوص قسم کی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہ تھرتھراہٹ کبھی صرف جسم کی اوپری جلد پر کپکپی طاری کر دیتی ہے۔ اور کبھی اتنی تیز ہوتی ہے کہ آدمی کا پورا جسم لرز اٹھتا ہے۔ اللہ کی یاد اصلاً آدمی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر جب یہ یاد زیادہ گہری ہو تو وہ آدمی کی روح کو اس طرح پگھلاتی ہے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ اس کے جسم پر بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ اس کے پورے وجود پر ذکر خداوندی کا بھونچال طاری ہو جاتا ہے۔ اس کا جسم اسی طرح ہل جاتا ہے جس طرح تیز ہوا کسی درخت کو ہلاتے۔

شہر کی تعمیر

شکاگو (Chicago) امریکہ کا ایک شہر ہے۔ شکاگو کے لفظی معنی جنگلی پیاز (wild onion) کے ہیں۔ پہلے یہ شہر اپنی گندگی اور جرائم اور ناقص مکانات کے لیے مشہور تھا۔ اس لیے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ آج شکاگو ایک اعلیٰ درجہ کا خوب صورت شہر ہے۔

شکاگو کی جدید تاریخ رچرڈ ڈیلی (Richard J. Daley) کی طرف منسوب ہے۔ وہ ۱۹۰۲ میں پیدا ہوا، ۱۹۷۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۵۵ میں وہ شکاگو کا میئر منتخب ہوا، اور آخر عمر تک وہاں کا میئر رہا۔ میئر بننے کے بعد اس نے از سر نو شہر کا منصوبہ بنایا۔ اس نے قدیم شکاگو کو ہر اعتبار سے نیا شکاگو بنا دیا۔

رچرڈ ڈیلی کی کامیابی کا خاص راز یہ تھا کہ اس نے شکاگو کی تعمیر جدید کو وہاں کے باشندوں میں سے ہر ایک کا ذاتی مسئلہ بنا دیا۔ اس نے ہر ایک کے اندر یہ ذہن پیدا کیا کہ یہ کام مجھ کو کرنا ہے، اور میں ہی اس کو انجام دوں گا۔ اس نے شکاگو میں بسنے والے ہر ہر شخص کو یہ ماٹو دیا ——— میں اس کو کروں گا :

I will do it.

کسی بڑے تعمیری کام کے لیے یہ صحیح ترین ماٹو ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ جب وہ کسی معاملہ کو دیکھے تو وہ سمجھے کہ یہ میری ہی ذمہ داری ہے۔ یہ کام مجھ کو ہی انجام دینا ہے۔ اگر سوسائٹی کے ہر فرد کے اندر یہ جذبہ ابھر آئے تو اس کے بعد ہر منصوبہ کی تکمیل یقینی ہو جائے گی۔

شکاگو بظاہر ایک برا نام تھا۔ مگر اصل کام شہر کا نام بدلنا نہیں ہے بلکہ شہریوں کا مزاج بدلنا ہے۔ شہر کا نام بدلنا ایک بے نتیجہ کام ہے۔ لیکن اگر شہریوں کے مزاج کو بدل دیا جائے تو ایک تباہ حال شہر بھی ایک اچھا شہر بن جائے گا۔

دوسروں کے خلاف نعرہ سماج میں اکھیڑ پچھاڑ پیدا کرتا ہے۔ اپنے لیے نعرہ سماج کو ترقیاتی سرگرمیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ پہلے قسم کے نعرے سے لیڈر کی شخصیت بنتی ہے اور دوسری قسم کے نعرہ سے ملک بنتا ہے۔ پہلا نعرہ تخریب ہے اور دوسرا نعرہ تعمیر۔

ایک سفر

لاہور کے سفر کی بات بہت عرصہ سے چل رہی تھی۔ لاہور میں اسلام پسند نوجوانوں کا ایک حلقہ ہے۔ اس کی طرف سے مجھے سفر کی دعوت دی گئی۔ اس سلسلہ میں ۸۸ - ۱۹۸۷ میں جناب نعیم بلوچ صاحب سے خط وکتابت ہوتی رہی۔ مگر کوئی قطعی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر کار جناب کرامت اللہ شیخ صاحب کی دعوت پر پروگرام طے ہو گیا۔ خط اور ٹیلیفون کے ذریعہ تفصیلات کی بابت تبادلہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ طے پا گیا کہ میں ۱۹ ستمبر کو لاہور پہنچوں۔

۱۹ ستمبر ۱۹۹۱ کی سہ پہر کو میں دہلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔ آج کے ٹائمس آف انڈیا (۱۹ ستمبر) کے صفحہ اول پر وزیر اعظم ہند مسٹر نرسمہا راؤ کا ایک بیان چھپا تھا۔ اس کی سرخی یہ تھی ——— پاکستان سے معاملہ کرنے کے لئے تیار رہو:

Be ready to deal with Pakistan

ایرپورٹ پہنچ کر پی آئی اے کی فلائٹ نمبر ۲۷۱ کے اندر داخل ہوا۔ جہاز میں پاکستانی اخبارات پڑھنے کے لئے موجود تھے۔ لاہور کے روزنامہ جنگ (۱۹ ستمبر) کے صفحہ ۴ پر "بیرونی خطرات" کے عنوان سے ایک مضمون تھا۔ اس میں دوبارہ سابق چیف آف آرمی اسٹاف جنرل اسلم بیگ کا آخری بیان نقل کیا گیا تھا۔ "ہمارے وطن عزیز کی سرحدوں پر جنگ کے گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں"۔

روس اور امریکہ نے سپر پاور ہوتے ہوئے سرد جنگ اور گرم جنگ کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ اب دونوں کے درمیان کوئی بھی جنگ کی بات نہیں کرتا۔ یہ محض دو ملکوں کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک زمانی فیصلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب سرد جنگ یا گرم جنگ کا دور ختم ہو گیا۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سپر پاور خواہ جنگی زبان بولنا بند کر دیں۔ مگر منی پاورس کے درمیان جنگی زبان کا رواج بدستور باقی رہے گا۔

دن کے ڈھائی بجے دہلی انٹرنیشنل ایرپورٹ پہنچا تھا۔ یہاں باہر اور اندر تقریباً سناٹے کا عالم نظر آیا۔ جب کہ رات کے وقت یہاں ہر طرف آدمیوں کا ہجوم دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہندستان کی پسماندگی

یت ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایرپورٹ پر دن کے وقت چہل پہل ہوتی ہے اور غیر ترقی یافتہ ں میں رات کے وقت۔ ترقی یافتہ ملک اپنے شہریوں کی سہولت کے لئے رات کے وقت جہازوں تنے یا وارد ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔ جدید دنیا میں ترقی یافتہ ملک کا باشندہ ہر جگہ برتر یت میں ہوتا ہے اور غیر ترقی یافتہ ملک کا باشندہ ہر جگہ کم تر حیثیت میں۔

دنیا میں جو تقسیم ترقی اور بے ترقی کی بنیاد پر ہے، آخرت میں وہ تقسیم مزید اضافہ کے ساتھ لح اور غیر صالح کی بنیاد پر قائم ہو جائے گی۔ موجودہ دنیا کی تقسیم علامتی صورت میں آخرت میں ں آنے والے واقعہ کا اعلان ہے۔ مگر اس اعلان کو سننے کے لئے وہ کان درکار ہیں جو خاموش ازوں کو اسی طرح سنیں جس طرح کوئی شخص لاؤڈ اسپیکر کی چیخ کو سنتا ہے اور اس کو سمجھ لیتا ہے۔

ایرپورٹ کے اندر انتظار گاہ میں ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں جن پر لکھا ہوا ہے "فری ٹیلیفون" ۔ نے اپنے یہاں کا نمبر ڈائل کیا۔ ہمارے دفتر کے ٹیلیفون پر گھنٹی بجنے لگی۔ "ہیلو" کے تبادلہ کے ساتھ ے محمد دفتر سے ربط قائم ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے "غائب" حیثیت رکھتے تھے، مگر ہم یوں" حاضر" کی طرح باہم گفت گو کر رہے تھے۔

یہ ایک سادہ سا واقعہ ہے۔ مگر جب بھی ایسا ہوتا ہے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ جس دنیا میں نسان غائب" سے رابطہ قائم کرنا ممکن ہو، وہاں "خدائے غائب" سے رابطہ قائم کرنا کیوں ممکن نہ ہوگا۔ شبہ یقینی ہے: ولکن أکثر الناس لا یعلمون۔

۴۵ منٹ کی پرواز کے بعد جہاز لاہور ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ پرواز اور لینڈنگ دونوں نہایت وار رہی۔ اندرونی سروس کا معیار بھی اچھا تھا۔ میں نے جب بھی پاکستان انٹرنیشنل سے سفر کیا ہے، ں کا معیار ہمیشہ اچھا پایا ہے۔ اس بار بھی مجھے ایسا ہی تجربہ ہوا۔

ہوائی اڈہ کے اندر عملہ کے ایک واقف کار آدمی نے میرا پاسپورٹ لے لیا اور رسمی کارروائیاں زی سے طے کرا دیں۔ باہر نکلے تو عین ہوائی اڈہ کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک سادہ اور خوبصورت جد تھی۔ ساتھیوں کی رائے ہوئی کہ نماز مغرب یہاں ادا کر لی جائے۔ اس کے بعد شہر کے لئے روانہ ں۔ چنانچہ مغرب کی نماز اسی مسجد میں ادا کی گئی۔

مسجد کی بیرونی دیوار پر لکھا ہوا تھا: واعتصموا بحبل اللہ جمیعا۔ یہاں اکثر ہوائی

مسافر تھے۔ جب مختلف ملکوں اور قومیتوں کے لوگ ایک امام کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوئے تو یہ محسوس ہوا کہ جیسے کہ وہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً کے حکم کی عملی تصدیق کر رہے ہیں۔ یہ کیسا عجیب سبق ہے جو مسجد کے ماحول میں مسلمانوں کو دیا جاتا ہے۔ اگر یہ سبق مسلمانوں کی پوری زندگی میں شامل ہو جائے تو ان کے اندر عظیم انقلاب آ جائے۔

نماز پڑھ کر باہر نکلا تو مسجد کے گیٹ پر ایک صاحب ملے۔ انھوں نے اپنا نام محمد ظفر عادل بتایا۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سنگین مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر جواب دینے لگے تھے۔ چنانچہ میرے اندر افسردگی (depression) کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ عین اس وقت اتفاق سے آپ کی کتاب "راز حیات" پڑھنے کو ملی۔ اس کو پڑھ کر میری حالت بالکل بدل گئی۔ میرے اندر نیا یقین جاگ اٹھا۔ جو کام دوا نہ کر سکی تھی وہ کام اس کتاب نے کر دیا۔

لاہور میں میرا قیام جناب کرامت شیخ کے یہاں تھا۔ شام کو یہاں مختلف اعلیٰ تعلیم یافتہ اصحاب جمع ہو گئے۔ گیارہ بجے رات تک یہ مجلس جاری رہی۔ علمی انداز میں تبادلہ خیال ہوتا رہا۔

پاکستان کا اقتصادی مرکز کراچی ہے۔ اسلام آباد اس کا سیاسی مرکز ہے۔ لاہور کو پاکستان کے علمی اور تمدنی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ لاہور اگرچہ قدیم شہر ہے۔ مگر اس کی قدیم تاریخ کے بارہ میں زیادہ معلومات حاصل نہیں۔ غزنوی خاندان نے ۱۱۵۲ء میں اس کو اپنی راجدھانی بنایا۔ اس وقت سے وہ باقاعدہ طور پر تاریخ میں ذکر کیا جانے لگا۔ ۱۳۹۸ میں اس کو تیمور کی فوجوں نے تباہ کر دیا تھا۔ مبارک شاہ نے ۱۴۲۲ میں دوبارہ اس کو آباد کیا۔ ۱۴۵۱ میں بہلول خاں لودی نے اس پر اپنی حکومت قائم کی۔

مغل حکمراں بابر کی فوجوں نے ۱۵۲۴ میں اس پر قبضہ کر لیا، اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷) کے بعد ۱۷۹۹ میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کر کے اس کو اپنی وسیع سلطنت کی راجدھانی قرار دیا۔ افغانی حکمراں شاہ زماں نے ۱۲ اپریل ۱۸۰۱ کو اعلان کیا کہ وہ رنجیت سنگھ کو لاہور کا گورنر تسلیم کرتا ہے۔ مگر رنجیت سنگھ نے اس حیثیت کو قبول نہیں کیا اور "مہاراجہ پنجاب" ہونے کا اعلان کر دیا۔ ۱۸۴۹ سے لاہور انگریزوں کی ماتحتی میں آ گیا، ۱۹۴۷ سے وہ پاکستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔

آج اگر مکہ میں کوئی بڑا واقعہ ہو تو اسی دن اس کی خبر پنجاب کے اس شہر میں پہنچ جائے گی۔ مگر ساتویں صدی عیسوی میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ ۶۳۰ء میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے نکلے اور فاتحانہ طور پر مکہ میں داخل ہوئے۔ اسی ۶۳۰ء میں چینی سیاح ہوان سانگ (Hsuan Tsang) سفر کرتا ہوا شمالی پنجاب پہنچا۔ مگر اس کے سفرنامہ میں نہ لاہور کا ذکر ہے اور نہ فتح مکہ کا۔ قدیم دنیا اور جدید دنیا میں کتنا زیادہ فرق ہے۔

پچھلے نبیوں کے ساتھ یہی واقعہ پیش آیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پیروؤں میں علم کی زبردست روح پھونکی۔ اس کی وجہ سے دور اول ہی میں لوگوں نے علم اور ادب میں مہارت پیدا کی اور اسلامی واقعات کو کتابوں کی صورت میں مدون کیا۔ اس طرح اسلام کی تاریخ ماضی کے مذاہب کے برعکس، گم ہونے سے محفوظ رہ گئی۔

جس زمانہ میں میں لاہور میں تھا انھیں دنوں میں برطانیہ کی لیڈی ڈائنا لاہور آئیں۔ ۲۵ ستمبر کو انھوں نے لاہور کی بادشاہی مسجد کی زیارت کی۔ ہندستان ٹائمس (۲۷ ستمبر ۱۹۹۱) میں ایک تصویر چھپی ہے۔ اس میں ایک عورت سر پر دوپٹہ اوڑھے ہوئے اور ننگے پاؤں مسجد کے اندر چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

A barefooted Princess Diana takes a walk inside historical Badshahi mosque on wensday during her one day visit to Lahore city.

لاہور کے روزنامہ امروز (۲۶ ستمبر) میں "شہزادی ڈائنا سے اسلامی ذہن کے مردوں کا مصافحہ" کے عنوان سے ایک دلچسپ نوٹ تھا۔ اس میں درج تھا کہ —— دنیا نے پاکستان ٹیلی ویژن کے خبرنامہ میں یہ خوبصورت منظر بھی دیکھا کہ اعجاز الحق سمیت اسلامی ذہن کے وفاقی وزراء والہانہ انداز میں شہزادی ڈائنا سے ہاتھ ملا رہے ہیں۔ (دوسری طرف) ہمارے ملک میں جب کسی عورت کو اقتدار یا عروج حاصل ہوتا ہے تو لوگ ایسی تصاویر تلاش کر کے نکل کھڑے ہوتے ہیں جس میں اس خاتون نے کسی مرد سے ہاتھ ملایا ہو۔

"اردو زبان یہاں کے لوگوں کے لئے فیشن کی مانند ہے۔ وہ فخر کے ساتھ اردو بولتے ہیں اور اس کو بہت پسند کرتے ہیں": ایک صاحب نے کہا۔ میں نے اپنے تجربہ میں اس کو بالکل درست پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے لوگوں میں اردو زبان کا تقریباً وہی درجہ ہے جو ہندستان میں انگریزی کا ہے۔ لوگوں کی پڑھنے لکھنے کی زبان اردو ہے۔ ہر موضوع پر اعلیٰ کتابیں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ معیاری قسم کے جرائد اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کو کھپونڈ کی سطح پر لانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔ وغیرہ۔

پاکستان کے مسلمانوں میں ایک امتیازی خصوصیت پائی جاتی ہے جو ہندستان کے مسلمانوں میں نہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کے بچے عام طور پر انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ وہ اردو زبان سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس بنا پر ہمارے یہاں علماء اور جدید مسلم نسل کے درمیان ایک لسانی بعد (لینگویج گیپ) پایا جاتا ہے اور وہ صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس کو فارسی شاعر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے :

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

مگر پاکستان میں یہ صورت حال نہیں۔ وہاں اعلیٰ خاندان کے بچے بھی بخوبی طور پر اردو زبان جانتے ہیں۔ اس طرح ان کے اور علماء کے درمیان زبان کی دوری پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اگرچہ بعض تجربات کی بنا پر میں نے محسوس کیا کہ خود علماء کے غیر حکیمانہ رویہ کی بنا پر یہاں کی نئی نسل علماء کے طبقہ سے زیادہ مانوس نہیں۔

میں جس کالونی میں ٹھہرا تھا، مجھے معلوم ہوا کہ اس کی مسجد کے امام صاحب کے لئے مسجد کی طرف سے باقاعدہ رہائش گاہ دی گئی ہے۔ اتفاق سے امام صاحب نے صبح کے ناشتہ پر مدعو کیا۔ اس طرح ان کی رہائش گاہ کو اندر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ یہ ایک صاف ستھرا فلیٹ تھا۔ جس کا کرایہ لاہور کے معیار سے تقریباً چار ہزار روپیہ ماہوار ہوگا۔ اس کے اندر بجلی اور پانی کا معقول انتظام تھا۔ ساتھ ہی ایک وسیع اور صاف ستھرا جدید طرز کا باورچی خانہ تھا۔ جس کے اندر گیس کا چولھا موجود تھا۔ اور گیس بھی سلنڈر کے بجائے پائپ کے ذریعہ آرہی تھی۔ اور یہ سب کچھ امام صاحب کے لئے بالکل فری تھا۔

اگرچہ پاکستان کے تمام ائمہ کا معیار یہی نہیں ہے۔ تاہم اس کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ الحمد للہ

سے دعا کی گئی کاش وہ دن آئے جب ہند و پاک کی تمام مسجدوں میں اسی طرح ائمہ کے لئے معقول تنخواہ اور صاف ستھری رہائش گاہ کا انتظام ہو۔ مساجد کے ائمہ کی حیثیت مسلم معاشرہ میں بے حد اہم ہے۔ مگر معاشی پستی کی وجہ سے ان کے اندر نہ اعلیٰ حوصلہ پیدا ہوتا اور نہ وہ اس قابل ہوتے کہ اعلیٰ سطح پر معاشرہ کی خدمت کر سکیں۔

لاہور کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں قدیم ترین زمانہ سے درس قرآن کے حلقے کثرت سے جاری رہے ہیں۔ لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن (ستمبر ۱۹۹۱) کے ایک مضمون میں "لاہور کے درس قرآن" کی تفصیل بتائی گئی تھی۔ اس کے مطابق، مولانا احمد علی صاحب غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۹۱۷ میں شیرانوالہ دروازہ کی ایک مسجد میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا، یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ مضمون کے مطابق، ۱۹۷۰ میں لاہور شہر کے اندر ۳۰ مقامات پر قرآن کا درس جاری تھا۔

اس پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ قرآن کے فوائد حاصل کرنے کے لئے یہی کافی نہیں ہے کہ قرآن کا درس مسجدوں میں جاری کر دیا جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ قرآن کا درس اپنی صحیح صورت میں دیا جا رہا ہو۔ چودھری غلام احمد پرویز بھی اپنی آخر عمر تک گلبرگ میں قرآن کا درس دیتے رہے۔ مگر تمام علما کے نزدیک ان کا درس مفید نہ تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فلسفہ کے مطابق یہ سمجھ لیا تھا کہ "نظام ربوبیت" قرآن فہمی کی روح ہے۔ وہ اپنے اسی فلسفہ کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کیا کرتے تھے۔

ہر فکری کتاب کی طرح، قرآن کی بھی ایک شاہ کلید ہے۔ ضروری ہے کہ آدمی اس شاہ کلید کے تعین میں غلطی نہ کرے۔ ورنہ وہ قرآن کو سمجھنے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ قرآن فہمی کی شاہ کلید کوئی فن، کوئی نظریہ یا کوئی علمی نکتہ نہیں ہے، قرآن فہمی کی شاہ کلید تقویٰ ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ شرط موجود ہو وہ قرآن کو سمجھے گا۔ اور جس آدمی کے اندر یہ بنیادی شرط نہ پائی جائے وہ دوسری تمام خصوصیات کے باوجود بھٹک کر رہ جائے گا، وہ قرآن کا ماہر ہو کر بھی قرآن فہمی سے محروم رہے گا۔ اسی لئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ: ھدیً للمتقین

کراچی (چاندنی چوک، ناظم آباد) کی محمدی مسجد کے خطیب جناب سید عبدالرؤف صاحب کو ایک تلخ تجربہ ہوا۔ انھوں نے ایک بار جامعہ کراچی میں قرآن کی تلاوت کی۔ تلاوت کے خاتمہ پر، عام قاریوں کے معمول کے خلاف، انھوں نے صدق اللہ العظیم نہیں کہا۔ اس پر ایک طالب علم نے انھیں ٹوکا اور کہا:

جناب، آپ ایک آیت بھول گئے ہیں۔

جناب عبدالرؤف صاحب پر اس کا سخت رد عمل ہوا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال جم گیا کہ چوں کہ علماء اور قراء نے اختتام تلاوت پر صدق اللہ العظیم کہنا اپنا معمول بنا لیا ہے۔ لہٰذا اس تعامل نے عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا ہے کہ شاید یہ الفاظ بھی قرآن کا مستقل حصہ ہیں۔ ان کا یہ احساس اتنا شدید ہوا کہ وہ تلاوت قرآن کے آخر میں اس کلمہ کے کہنے کو بدعت و گمراہی سمجھنے لگے۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک سخت مضمون لکھا جو لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن (نومبر، دسمبر ۱۹۸۹) میں دو قسطوں میں چھپا۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد جوابی رد و کد ہوئی۔ یہاں تک کہ حکمت قرآن (مارچ ۱۹۹۰) میں مدیر محترم نے لکھا کہ یہ انتہا پسندانہ نقطۂ نظر ہے۔ اگر دور اول میں اس کا معمول نہ ہو تب بھی تلاوت قرآن کے آخر میں صدق اللہ العظیم کہنا بدعت اور گمراہی نہیں۔ یہ گویا اختتام تلاوت کی علامت ہے اور اس اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

میں نے ایک صاحب سے گفتگو کے دوران کہا کہ مذکورہ طالب علم کی بات محض ایک انفرادی بات تھی، اس کو اتنی زیادہ اہمیت دینا اور اس کو عمومی گمراہی سمجھ کر اس پر بحث جاری کر دینا صحیح نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے مذہبی حلقوں میں عام طور پر یہی ذہن چھایا ہوا ہے۔ اور اختلاف کا اصل سبب یہی مزاج ہے۔

وفاق پبلی کیشنز لاہور نے ۱۰۰ صفحہ کی ایک کتاب چھاپی ہے۔ اس کا نام نفاذ اسلام: منزل بہ منزل ہے۔ روزنامہ وفاق کے پینل نے جناب مصطفی صادق کی قیادت میں سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق سے کئی انٹرویو لئے تھے۔ ان سب کو کتاب کی صورت میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس کے صفحہ ۸۶ پر سابق صدر پاکستان کا ایک جواب نقل کیا گیا ہے۔ اس کے مطابق، انھوں نے ایک سوال کے جواب میں جلسہ جلوس کی سیاست کو بے مقصد آگ بھڑکانا بتایا۔ انھوں نے کہا:

میرے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق، جلسہ اور جلوس وقت کا ضیاع ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے عوام کی تربیت پر غلط اثرات پڑ سکتے ہیں۔ اگر (جلسہ جلوس) کا یہ طریق کار اختیار کر لیا گیا تو اس کے اثرات اچھے نہیں ہوں گے۔ میں اس کے لئے موزوں الفاظ استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ کسی نے کہا ہے:

Political activities of procession and public meeting have generated more heat than light.

[illegible] چپ بیٹھا رہا جاتا چوڑیاں پہن کر ؟

اس پر گفتگو کے دوران میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس معاملہ میں ٹھیک یہی حالت ہندستان کی بھی ہے۔ یہاں بھی جلوس اور عوامی جلسوں کی صورت میں جو سیاسی سرگرمیاں جاری کی جاتی ہیں انھوں نے صرف اس سے زیادہ گرمی پیدا کرنے کا کام کیا ہے۔ مثلاً سلمان رشدی کی کتاب کے مسئلہ پر بمبئی میں جلوس نکالا گیا اس نے ماحول میں صرف گرمی پیدا کی اور مسلمانوں کی قیمتی جانیں بے فائدہ طور پر ضائع ہوئیں۔ اسی طرح بابری مسجد کے مسئلہ پر جلسہ اور جلوس کے جو ہنگامے جاری کئے گئے اس نے بھی مسلمانوں کو کوئی روشنی نہیں دی۔ البتہ ماحول کے اندر جو گرمی پیدا ہوئی اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو مختلف قسم کے اندوہناک نقصانات اٹھانے پڑے *

پاکستان کے سابق صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے پندرہ روزہ امپیکٹ (لندن) کو ایک انٹرویو دیا تھا۔ یہ انگریزی ہفت روزہ پاکستان کے اسلام پسند نوجوان نکالتے ہیں۔ انٹرویو زیادہ تر پاکستان میں اسلام نظام اور جمہوریت سے متعلق تھا۔ اس کا ایک سوال وجواب یہ ہے :

Q: You are trying to reform democracy. Is it not necessary to reform the administrative structure as well so that it is able to run the Islamic system you are introducing?

A: I wish I can do that, but I don't think we can. I am sorry to say that if I tell... to start growing a beard, he will be the first to say no, because I myself do not keep a beard. (Radiance Weekly, April 12, 1981)

سوال : آپ پاکستان میں جمہوریت کی اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ انتظامی ڈھانچہ کی بھی اصلاح کی جائے تاکہ وہ اس اسلامی نظام کو چلانے کے قابل ہو سکے جس کو آپ ملک میں لا رہے ہیں۔

جواب : میری خواہش ہے کہ میں ایسا کر سکتا۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ اگر میں انتظامی کارکنوں سے کہوں کہ تم داڑھی رکھو تو وہ سب سے پہلے نہیں کر دے گا۔ کیوں کہ میں خود داڑھی نہیں رکھتا۔

اس انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں کامل اقتدار ملا۔ وہ ساڑھے گیارہ سال تک پاکستان کے مطلق حکمراں بنے رہے۔ اس کے باوجود ان

تو کیا اسکرٹ کلچر جاری رہنے دیا جائے مصر کی طرح؟ یہ مسئلہ میں رہی Ideology میں تعویذ چاہیے۔ سمجھے مولانا وحید الدین کے لئے یہ ممکن نہ ہو سکا کہ وہ طاقت کے زور پر مکمل اسلامی نظام نافذ کردیں۔

ایسی حالت میں جو لوگ آج تشدد کی تحریکیں چلا رہے ہیں تاکہ اقتدار پر قبضہ کرکے اسلامی نظام کو نافذ کریں، وہ یا تو انتہائی نادان ہیں یا انتہائی غیر سنجیدہ۔ ان دو کے سوا کوئی اور خانہ نہیں جس میں ان کو جگہ دی جاسکے۔

۱۹۹۱ کے الکشن کے بعد انڈیا کی پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں جو ممبران منتخب ہو کر آئے ہیں ان میں مسلم ممبروں کی تعداد ہمیشہ سے بہت کم ہے۔ اس پر یہاں کے مسلم حلقوں میں طرح طرح کے مایوسانہ تبصرے کئے جارہے ہیں۔ اس سلسلہ میں دہلی کے روزنامہ قومی آواز (۹ ستمبر ۱۹۹۱) میں مسٹر دیش راج گوئل کے قلم سے ایک مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: "ملک کا سب سے زیادہ پریشان حال طبقہ"۔ مضمون نگار لکھتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ کیا بھارتی پارلیمنٹ میں مسلمان ممبران کی زیادہ تعداد ان مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے جو بھارت میں انھیں درپیش ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی میں تو مسلمان ہی بھاری اکثریت میں موجود ہیں۔ پھر کیا یہ مسلم ممبران پاکستان کے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب ہو گئے؟

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ہندو لیڈر کے یہ الفاظ مسلمانوں کے لئے چشم کشا حیثیت رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کا مسئلہ "مسلم ممبران" حل نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان اور بنگلہ دیش میں مسلمانوں کے مسائل حل ہو چکے ہوتے۔ مگر وہاں بھارت سے بھی زیادہ سنگین مسائل موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسائل کے حل کے لئے ہمیں خود مسلم قوم کو تیار کرنا چاہئے۔ مسلم قوم میں جب تک تعمیری انداز میں فکری بیداری نہ لائی جائے، کوئی بھی دوسری تدبیر ان کے مسائل کو حل کرنے والی نہیں، خواہ بھارت کا معاملہ ہو یا پاکستان اور بنگلہ دیش کا معاملہ۔

اگست ۱۹۹۱ کے آخری ہفتہ میں جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے "پچاسویں یوم تاسیس" کی تقریبات لاہور میں منعقد کیں۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کے ذمہ داروں نے پرجوش تقریریں کیں۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، ان تقریروں میں بڑی دلچسپ باتیں کہی گئیں۔ جماعت اسلامی پاکستان اپنے آٹھ ممبران اسمبلی کے ساتھ "اسلامی جمہوری اتحاد" کی حکومت میں شامل ہے۔ مگر جماعت کے

امیر قاضی حسین احمد صاحب نے اسلامی جمہوری اتحاد کے صدر اور پاکستان کے وزیر اعظم میاں نواز شریف پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "میاں نواز شریف اپنے انتخابی منشور کو چھوڑ چکے ہیں۔ وہ اسلامی جمہوری اتحاد کا نام تو لیتے ہیں لیکن عملاً ان پر بھارتی لابی کی گرفت ہے"۔

پاکستان کی جماعت اسلامی کے سابق امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی تقریر میں پاکستان کے شریعت ایکٹ کو ایک منافقانہ قانون بتایا۔ انھوں نے کہا کہ اس شریعت ایکٹ نے گزشتہ (ایودھیا، ہندو کے تعمیل کا کو بھی مات کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ "بھارت میں تو (سابق وزیر اعظم) چندر شیکھر نے مسلمانوں کو حقوق دے رکھے ہیں۔ خود پاکستان میں بھی تمام اقلیتوں کو حقوق حاصل ہیں۔ لیکن پاکستانی مسلمانوں کو حقوق حاصل نہیں" (روزنامہ وفاق، لاہور، ۲۸ اگست ۱۹۹۱، صفحہ ۶)

نوائے وقت (۳۰ اگست ۱۹۹۱) کے مطابق، جماعت اسلامی کے موجودہ اکابر کی تحریروں میں "دو قومی نظریہ، تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کا سارا کریڈٹ مولانا مودودی کو دیا گیا ہے"۔ ایک طرف جماعت کے لوگ یہ کریڈٹ لینا چاہتے ہیں کہ انھوں نے پاکستان بنوا کر وہاں کے مسلمانوں کو محفوظ کر دیا۔ دوسری طرف وہی یہ بھی اعلان کر رہے ہیں کہ اس محفوظ خطہ میں بھی بھارت کی انتہائی طاقت ور لابی موجود ہے۔ اور یہ کہ پاکستانی مسلمانوں کو اتنا حق بھی حاصل نہیں جتنا بھارت میں بسے ہوئے مسلمانوں کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر نوائے وقت (۳۰ اگست) نے ایک مضمون اس عنوان کے تحت چھاپا ہے کہ: جماعت والوں کی مت ماری گئی۔

ہندستان ٹائمس کے نمائندہ مسٹر بھابنی سین گپتا نے حال ہی میں پاکستان کا سفر کیا تھا۔ ان کی ایک رپورٹ ہندستان ٹائمس (۸ ستمبر ۱۹۹۱) میں چھپی ہے۔ اس کا عنوان ہے — بڑی کابینہ نواز شریف کی بقا میں مددگار:

Large cabinet helps Nawaz Sharif survive.

نواز شریف (اسلامی جمہوری اتحاد) اکتوبر ۱۹۹۰ کے الکشن کے بعد برسر اقتدار آئے تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے مختلف پارٹیاں ان کے خلاف شور وغل کرتی رہی ہیں۔ ان کے سخت ناقدین میں جماعت اسلامی پاکستان بھی شامل ہے جو روایتی طور پر ان کی حلیف رہی ہے۔ مزید یہ کہ حال ہی میں اسلام آباد یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد ڈاکٹر عنایت اللہ نے ۱۹۹۰ کے الکشن کے بارہ میں اپنا

واقعی، مولانا وحیدالدین بھی عمر اور علی سے کم محسوب نہیں ہیں۔

جائزہ شائع کیا ہے۔ اس کے مطابق، تقریباً چالیس حلقۂ انتخاب میں واضح طور پر انتخابی دھاندلی کی گئی تھی۔

اس قسم کے مختلف واقعات سے مسٹر نواز شریف کی سیاسی حیثیت کمزور ہو رہی تھی۔ انھوں نے اس کا آسان حل یہ نکالا کہ مخالفین کو عہدے دے کر خاموش کر دیا۔ انھوں نے ۱۱ ستمبر ۱۹۹۱ کو پاکستان کی مرکزی کابینہ میں توسیع کرکے ۲۹ نئے وزیروں کو اس میں شامل کر لیا۔ اس طرح اب ان کی کابینہ میں وزیروں کی مجموعی تعداد ۵۰ ہو گئی ہے۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک صاحب سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مدینہ کے انصار نے حکومتی عہدہ سے دستبرداری اختیار کر لی تھی۔ گویا اسلام کے دور اول میں حکومتی عہدہ چھوڑنے والوں نے اسلام کی تاریخ بنائی تھی، اب موجودہ زمانہ میں ایسے اسلام پسند ظاہر ہوئے ہیں جو حکومتی عہدوں پر قبضہ کرکے اسلام کی تاریخ بنانا چاہتے ہیں۔ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ماضی اور حال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اسلام آباد کے انگریزی اخبار مسلم نے ۳۵ سالہ مہاجر لیڈر الطاف حسین کا ایک انٹرویو شائع کیا تھا۔ میں نے اس انٹرویو کی وہ نقل دیکھی ہے جو دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (۱۲ مارچ ۱۹۸۸) نے صفحہ ۸ پر شائع کی تھی۔ اس انٹرویو کے مطابق مہاجر لیڈر (قائد تحریک) نے کہا کہ ہندستان کی تقسیم کے وقت جو مسلمان ہجرت کرکے پاکستان گئے، ان کو اور ان کی اولاد کو پاکستان میں تیسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے۔ ان کو آج بھی برابر کے حقوق حاصل نہیں۔ یہاں کے قدیم باشندے ان کو خارجی سمجھتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی حکومت نے ان مہاجرین کو فرزند وطن کا درجہ نہیں دیا۔

مسٹر الطاف حسین کے الفاظ میں، پاکستان میں مہاجرین کو ملازمتوں کے معاملہ میں تحفظ حاصل نہیں ہے۔ وہاں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہاں ان کی کوئی شناخت نہیں۔ یہاں ہر شخص اپنے کو پٹھان پنجابی، سندھی، بلوچی کہتا ہے اور اردو بولنے والے مہاجر ان خانوں میں سے کسی خانہ میں نہیں آتے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کی تمام پارٹیاں علاقائی پارٹیاں ہیں جو مذکورہ چار قومیتوں میں سے کسی ایک قومیت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس بنا پر مہاجرین نے اپنی قومی تحریک شروع کی ہے تاکہ ان کو پانچویں

قومیت کی حیثیت سے پاکستان میں جگہ مل سکے۔

مسٹر الطاف حسین نے کہا کہ ہر مہاجر یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے جائز حقوق کو نا جائز طریقہ سے سلب کر لیا گیا ہے۔ اور تعلیم، روزگار، ٹیلیویژن، حتی کہ کھیلوں تک میں ان کے ساتھ امتیاز کیا جاتا ہے۔ انھوں نے شکایت کی کہ مہاجروں کو کرکٹ کی ٹیم میں منتخب ہونے کا اہل نہیں سمجھا جاتا اور اگر بعض خوش قسمت ایسے ہیں جنھیں منتخب کیا گیا تھا تو ان کو عروج پر پہنچنے سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ کراچی تک کی پولیس پنجابیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس محکمہ میں کسی مہاجر کو ملازمت نہیں دی جاتی۔

میں نے ایک صاحب سے کہا کہ پاکستان اب اپنے قیام کی نصف صدی پوری کر رہا ہے۔ مگر وہاں کے اردو خواں مسلمانوں کے لئے بھی وہی مسائل ہیں جو ہندستان کے اردو خواں مسلمانوں کو پیش آرہے ہیں۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ ہندستان اور پاکستان یا ہندو اور مسلم کا نہیں ہے۔ بلکہ ذہنیت کا ہے۔ یہ دراصل ذہنیت ہے جو تمام مسائل پیدا کرتی ہے، اور دوبارہ یہ ذہنیت ہی ہے جو تمام مسائل کو ختم کرنے والی ہے۔ ایک لفظ میں ـــــ تمام مسائل کا سبب غیر حقیقت پسندی ہے۔ اور تمام مسائل کا حل حقیقت پسندی۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہمارے یہاں اسلامی ذہن بنانے کے لئے بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر پچاس سالہ کوشش کے باوجود اب تک اسلامی انداز میں لوگوں کی ذہنی تربیت نہ ہو سکی۔ میں نے کہا کہ مجھے آپ کے بیان کے نصف ثانی سے اتفاق ہے۔ مگر مجھے اس کے نصف اول سے اتفاق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی ذہن بنانے کی حقیقی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ پھر جس چیز کی کوشش ہی نہ کی گئی ہو وہ وجود میں کیوں کر آسکتی ہے۔

صرف اسلام کا نام لینے سے اسلامی تربیت نہیں ہوتی۔ اس کی ایک مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ پاکستان کے پندرہ روزہ المنبر کے تازہ شمارہ ۲۵ ستمبر ۱۹۹۱ میں "ضیاء الحق شہید فاؤنڈیشن" کے زیر اہتمام ہونے والی کانفرنس کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ـــ "ضیاء الحق فاؤنڈیشن کو فوری طور پر قوم کے کردار اور فکر کی تہذیب و تربیت کا کام شروع کرنا چاہئے"

مگر محض اس طرح اسلام کا نام لینے سے اسلامی فکر اور اسلامی کردار پیدا نہیں ہو سکتا۔

جہاد کا جذبہ مزید کم ہوتا جائے گا۔

اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ لوگوں کو حیات و کائنات کا اس طرح مطالعہ کرایا جائے کہ ان کے گرد و پیش کی پوری دنیا ان کے لئے رزق ربانی کا دسترخوان بن جائے۔ مثال کے طور پر المنبر کے مذکورہ شمارہ میں سابق صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کے تذکرہ کے تحت درج ہے کہ "یہ شہید صدر ہی تھے جن کی بدولت قرآن مجید کے لاکھوں نسخے روس میں تقسیم ہوتے رہے۔" صفحہ ۳۲۔

یہ وہی واقعہ ہے جس کا ذکر الرسالہ نومبر ۱۹۹۰ (صفحہ ۲۷) میں کیا گیا ہے۔ الرسالہ میں سوویت سسٹم کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ تدبیروں کے ذریعہ حالات میں وہ تبدیلی پیدا کی جس کے نتیجہ میں سوویت یونین کی آہنی دیواریں ٹوٹ گئیں اور وہاں اسلام کا داخلہ ممکن ہو گیا۔ دوسری طرف المنبر میں اس واقعہ کو تمام تر ایک انسان کی بدولت ظہور میں آنے والا واقعہ بتایا گیا ہے۔

الرسالہ کے مضمون کو پڑھ کر آدمی کے اندر شکر خداوندی کا جذبہ ابھرے گا۔ مزید اس کے اندر یہ جذبہ ابھرے گا کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے نئے امکانات پیدا ہوئے ہیں، اور ہم کو چاہئے کہ ہم ان کو استعمال کریں۔ جب کہ المنبر کے بیان سے صرف ہیرو ورشپ کا جذبہ ابھرے گا، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسلامی تربیت کے لئے موجودہ انداز کلام کس طرح ناکافی ہے۔

ایک صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اتنا زیادہ چرچا ہے۔ اس کے باوجود لوگوں میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سارے معاملہ کو فخر کا معاملہ بنا دیا گیا ہے۔ اسلامی اسپرٹ تواضع کی اسپرٹ کا نام ہے۔ اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ فخر کی باتیں کبھی تواضع کا مزاج پیدا نہیں کرتیں۔

میں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان سے ایک ماہنامہ "ہمدرد صحت" کے نام سے نکلتا ہے۔ اس کا تازہ شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک مضمون "قرآن حکیم کی تکریم" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ قرآن شریف کی تعظیم یہ بھی ہے کہ دوران تلاوت اس کے مضامین کے لحاظ سے قلب میں پیدا ہونے والی کیفیات اور تاثرات کا بھی اندازہ کیا جائے۔ اگر

ذکرِ عذاب پر خوف طاری نہ ہو، اگر جنت کی بشارت پر بشاشت پیدا نہ ہو، اگر عظمت و کبریائی کے ذکر سے دل مائل بہ سجود نہ ہو تو اس کی تکریم کا حق ادا نہیں ہوا (صفحہ ۶)

یہ بات بظاہر درست ہے۔ مگر مضمون کے آخر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اس بات کی نفی ہو جاتی ہے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ : قرآن حکیم وہ دولت دارین ہے جس پر ہمیں فخر بھی کرنا چاہئے۔ اس امت کے لئے سب سے بڑا شرف اور اس کے لئے سب سے بڑا سرمایۂ افتخار قرآن شریف ہے (صفحہ ۱۱)

یہ انسانی نفسیات کے سراسر خلاف ہے۔ قرآن کو اگر آپ مسلمانوں کے سامنے فخر کی کتاب کی حیثیت سے پیش کریں اور اس کو ان کے لئے سرمایۂ افتخار بتائیں تو اس کے بعد اس احساس کا ابھرنا ناممکن ہو جاتا ہے جو تمام اصلاحات کی جان ہے۔ یعنی خوفِ خدا۔ جس چیز کو آدمی اپنے لئے فخر کا سامان سمجھ لے اس کے تصور سے اس کے اندر ناز کی کیفیت تو ابھر سکتی ہے مگر اس کے تصور سے اس کے اندر احتسابِ خویش کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

لاہور میں جو دینی حلقے ہیں ان میں سے ایک حلقہ وہ ہے جو مولانا جاوید احمد غامدی کی سربراہی میں قائم ہے۔ یہ سب کے سب نوجوان لوگ ہیں۔ ان کی اہم ترین صفت یہ ہے کہ وہ سب کے سب نہایت سنجیدہ ہیں۔ یہاں کے زمانۂ قیام میں ان حضرات سے کئی بار انفرادی اور اجتماعی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کی سنجیدگی اور ان کے اسلامی ذوق کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

ان حضرات سے جو باتیں ہوئیں ان کو نقل کرنا ممکن نہیں۔ تاہم ایک چیز جس پر میں نے سب سے زیادہ زور دیا وہ دعوت ہے۔ میں نے کہا کہ دعوت الی اللہ ایک لازمی فریضہ ہے جو ہر حال میں اسی طرح اہل اسلام پر عائد ہوتا ہے جس طرح کہ نماز روزہ۔ فرق صرف یہ ہے کہ نماز روزہ ہر فرد پر فرض ہے اور دعوت الی اللہ کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔ یعنی کچھ لوگ اس کو ادا کر دیں تو پوری امت سے یہ فریضہ عملاً ساقط ہو جائے گا۔ ورنہ تمام امت ذمہ دار ٹھہرے گی۔

اس کام کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ مسلمان یا مسلمانوں کی پوری جماعت اصلاح یافتہ ہو جائے اس کے بعد اس کام کو انجام دیا جائے۔ دعوت سے مراد اسلام کی طرف دعوت ہے نہ کہ امت مسلمہ کی طرف دعوت۔ اس کا مطلب مدعو کو اس حقیقتِ واقعہ سے خبردار کرنا ہے کہ وہ اس دنیا میں

حالت امتحان میں ہے۔ موت کے بعد اس کا حساب لیا جائے گا اور اس کے بعد اس کے لئے یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم۔ دعوت سے مراد انذار و تبشیر ہے۔ اور انذار و تبشیر میں ساری اہمیت پیغام رسانی کی ہوتی ہے۔ اس کے سوا بقیہ تمام چیزیں اضافی بن جاتی ہیں۔

ایک مجلس میں یہ سوال سامنے آیا کہ آدمی نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے۔ مگر اس کے اندر خوف خدا کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا سبب کیا ہے۔ جناب شیخ خاور محمود صاحب نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اس کے مطابق زندگی نہیں گزارتے۔ یہ جواب اگرچہ سادہ تھا مگر مبنی بر حقیقت تھا۔

یہاں ایسے لوگ بڑی تعداد میں ہیں جو الرسالہ اور دوسری کتابوں کو پڑھتے رہے ہیں اور ہمارے مشن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک صاحب نے اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کے مطالعہ سے پہلے میرے اندر منفی سوچ تھی۔ اب الحمد للہ منفی سوچ مکمل طور پر ختم ہو چکی ہے۔ اب میں نے پوری طرح مثبت سوچ کو اپنا لیا ہے اور اسی پر اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

ایک نوجوان نے اپنی ڈائری دی اور کہا کہ اس میں کوئی چھوٹی سی نصیحت میرے لئے لکھ دیجئے۔ میں نے یہ جملہ لکھ دیا: دانش مند وہ ہے جو چھوٹی بات کو بڑی بات کے روپ میں دیکھ سکے۔

ایک طالب علم سے میں نے پوچھا کہ پاکستان کے جو ہندو نوجوان تعلیم میں مسلم نوجوانوں سے آگے ہیں اس کا راز کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس سلسلہ میں مجھے خود تو ذاتی طور پر کوئی تجربہ نہیں۔ البتہ میرے ایک ٹیچر نے ایک بار کلاس میں یہی بات کہی۔ ہم لوگوں نے ان سے پوچھا کہ اس کا سبب کیا ہے۔ ہمارے استاد نے کہا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو طلبہ مشترکہ مطالعہ (combined study) کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے علم سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اجتماعی مطالعہ کی بنا پر انھیں زیادہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس مسلم طلبہ صرف انفرادی طور پر پڑھتے ہیں، ان کی معلومات کم رہتی ہیں۔ اس طرح ہندو آگے بڑھ جاتے ہیں اور مسلمان ان کے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت (۲۴ ستمبر) میں ایک مضمون دیکھا۔ اس کا عنوان تھا: "ہندوؤں کی اسلام دشمنی" اس مضمون کا پہلا پیراگراف یہ ہے ـــ یہ ایک ناقابل تردید اور اٹل حقیقت ہے جسے ہر پاکستانی کو مکمل طرح اپنے ذہن نشیں کر لینا چاہئے کہ پاکستان اور پاکستانیوں کا ازلی اور ابدی دشمن مسیحی نہیں، پارسی

نہیں بدھ اور جین نہیں بلکہ ہنود برو زن یہود ہیں" (صفحہ ۱۱)

ایک صاحب سے گفت گو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ یہ سراسر غیر داعیانہ انداز کلام ہے۔ اگر ہم اپنے کو داعی اور دوسری قوموں کو مدعو سمجھیں تو ہم تمام قوموں کو انسان کی نظر سے دیکھیں گے بالفرض کوئی قوم زیادتی کرے تو اس کو نظر انداز کرکے اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کریں گے جیساکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

عجیب بات ہے کہ اسی اخبار (نوائے وقت ۲۴ ستمبر) میں برطانیہ کی شہزادی ڈائنا کی تقریر چھپی ہوئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ برطانی خاتون نے اسلام آباد میں تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال کے شعر کا حوالہ دیا۔ جنھوں نے کہا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو خدا سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اس کی تلاش میں جنگل میں گھومتے ہیں۔ لیکن میں اس شخص سے محبت کروں گا جو خدا تعالیٰ کی تمام انسانیت سے پیار کرتا ہے۔ لیڈی ڈائنا نے کہا کہ اس شعر کے الفاظ دل کی گہرائیوں تک اثر کرتے ہیں اور میں اس کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہوں۔ (صفحہ ۶)

میں نے ایک صاحب سے اس خبر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ محبت اپنے اندر تسخیری طاقت رکھتی ہے۔ دعوت کا سب سے بڑا ہتھیار محبت ہے۔ مگر اس دنیا میں محبت نام ہے یک طرفہ محبت کا۔ اس دنیا میں لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت پیش آتی ہے۔ ایک کو دوسرے کی طرف سے زیادتی کا تجربہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں وہی شخص محبت کر سکتا ہے جو شکایتوں اور زیادتیوں کے باوجود لوگوں سے محبت کرنے کا حوصلہ کر سکے۔

کرامت شیخ صاحب (پیدائش ۱۹۳۶) آٹومیٹک بک بائنڈنگ کی مشین اپنے یہاں لگانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے وہ لندن گئے۔ وہاں کی ایک کمپنی (Muller Martini) سے انھیں یہ مشین خریدنا تھا۔ کمپنی کے دفتر سے بات کرکے یہ طے ہوا کہ اس کا نمائندہ کرامت شیخ صاحب کی قیام گاہ پر آئے گا اور ان کو ساتھ لے جاکر شوروم میں مذکورہ مشین دکھائے گا۔

طے شدہ وقت پر کمپنی کا ایک انگریز نمائندہ گاڑی لے کر آیا اور شیخ صاحب کو اپنے ساتھ لے گیا تاکہ انھیں مذکورہ مشین دکھائے۔ راستہ میں گفت گو کے دوران اسلام زیر بحث آیا۔ اس نے کہا کہ یہ کیسا مذہب اسلام ہے۔ ایک شوہر اپنی بیوی پر زیادتیاں کرتا ہے، وہ مسلسل

پریشان کرتا رہتا ہے۔ مگر وہ عورت اپنے شوہر سے طلاق نہیں لے سکتی۔

کرامت شیخ صاحب نے کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہے۔ ایسی عورت طلاق لے سکتی ہے۔ اسلام میں اس کی اجازت ہے۔ یہ سن کر وہ مبہوت ہو گیا۔ اس نے حیرانی کے ساتھ کہا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ہم تو سمجھے ہوئے تھے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں اس نے کہا ــــ جناب، آپ جیتے، میں ہار گیا۔

کرامت شیخ صاحب نے اپنا ذاتی تجربہ بتانے کے بعد کہا: موجودہ زمانہ میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ اسلام کا پیغام دوسری قوموں تک پہنچایا ہی نہیں گیا۔ اگر ہم صحیح طور پر اسلام کا پیغام جدید انسان تک پہنچائیں تو وہ چیخ اٹھے گا اور کہے گا کہ میں غلطی پر تھا، تم حق پر ہو۔ میں تمہارے دین کو قبول کرتا ہوں۔

میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں دعوتی کام شروع نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنی "غلطی" ماننے کے لئے تیار نہیں۔ مسلمانوں کو پہلے یہ ماننا ہوگا کہ موجودہ زمانہ میں انھوں نے غلط تحریکیں چلائیں، اس کے بعد ہی ان کے درمیان صحیح دعوتی تحریک ابھر سکتی ہے۔

۲۱ ستمبر کو جناب مصطفی صادق (اڈیٹر انچیف روزنامہ وفاق) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بہت سے سبق آموز واقعات بتائے۔ انھوں نے بتایا کہ ۱۹۸۵ میں وہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کے ساتھ امریکہ گئے تھے۔ وہاں ہیوسٹن کی لیڈی میئر نے ضیاء الحق صاحب کے اعزاز میں ہوٹل (Inn on the park) میں پارٹی دی۔ جب لوگ میز کے گرد جمع ہو گئے تو امریکی میئر نے کہا کہ آج ہمارا مہمان ایک ایسا شخص ہے جو شراب نہیں پیتا۔ اور جس کے مذہب میں شراب حرام ہے۔ اس لئے ان کے احترام میں آج ہم نے یہاں شراب کا انتظام نہیں کیا ہے۔ مہمان حضرات اس کے لئے ہمیں معاف فرمائیں:

اگلے دن وہاں کے انگریزی اخبار ہیوسٹن ٹائمز (Huston Times) میں اس پارٹی کی خبر چھپی۔ اس خبر کی سرخی اخبار نے ان الفاظ میں قائم کی تھی ــــ اسلام کے لمبے بازو ہیوسٹن تک پہنچ گئے:

Long arms of Islam reach Huston.

یہ صرف اتفاقی طور پر اس امکان کو بتا رہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے ابدی طور پر کھول دیا ہے۔ وہ یہ کہ اسلام کے بازو اتنے لمبے ہیں کہ امریکہ بھی اس کی زد سے باہر نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے حق میں اس امکان کو بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو سمجھا جائے اور اس کو پوری طرح استعمال کیا جائے۔

جنرل ضیاء الحق صاحب ساڑھے گیارہ سال تک پاکستان کے بااختیار صدر رہے۔ مگر انھوں نے اپنے لڑکوں کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔ ان کے لڑکے عام لوگوں کی طرح بینک وغیرہ میں سروس کرتے رہے۔ مگر ضیاء الحق صاحب کی وفات کے بعد ان کے دونوں لڑکے (اعجاز الحق، انوار الحق) نے انتخاب میں حصہ لیا۔ وہ بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوئے۔ اب دونوں لڑکے مرکزی کیبنٹ میں منسٹر ہیں۔

عام طور پر بااختیار لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار کو استعمال کرکے اپنے بیٹوں کو اچھے عہدے دلا دیں۔ مگر مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ بیٹوں کو عہدہ نہ دلانا بھی انھیں بڑی چیز دینا ہے۔ ایسے لوگوں کے بچے خواہ اپنے والد کی زندگی میں ترقی کے درجات تک نہ پہنچیں مگر باپ کے بعد وہ ضرور اعلیٰ ترقیات تک پہنچ کر رہتے ہیں۔

کرامت بشیخ صاحب نے بتایا کہ سابق صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک بار علماء کی میٹنگ بلائی۔ اس میں مولانا نورانی بھی تھے۔ وہ پان کھانے کے عادی ہیں۔ ان کے منہ میں پان دیکھ کر ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ مولانا، آپ پان کھاتے ہیں، یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا نورانی نے کہا: آپ خود بھی تو سگرٹ (Dunhill) پیتے ہیں۔ ضیاء الحق صاحب نے یہ جملہ سننے کے بعد اسی وقت سگرٹ چھوڑنے کا اعلان کر دیا۔ اور پھر ساری زندگی کبھی سگرٹ نہیں پیا۔

مسجد بلال (تیموگارڈن ٹاؤن)، بڑی خوب صورت مسجد ہے۔ اس میں امام اور موذن کے لئے رہائش گاہ بھی بنی ہوئی ہے۔ میں نے امام صاحب کی رہائش گاہ کو دیکھا۔ فلیٹ کے انداز کا ایک کشادہ مکان تھا۔ نہایت صاف ستھرا بنا ہوا۔ چپس کا فرش تھا۔ جدید طرز کا باورچی خانہ اور حمام وغیرہ اس کے اندر موجود تھے۔ پانی، بجلی اور پائپ گیس کے کنکشن بھی تھے۔

بہت سے لوگ ملیں گے جو یہ کہیں کہ مسجدوں کے امام حضرات کو معاشرہ کی اصلاح کا کام کرنا

چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ائمہ کو زیادہ فعّال بنانے کے لئے ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانا ضروری ہے۔ ائمہ کی معاشی حالت اگر عام طور پر بہتر ہو جائے تو ان کے اندر اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوگا اور وہ معاشرہ کی اصلاح میں اپنا موثر کردار ادا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ایک صاحب سے میں نے پوچھا کہ پاکستان میں جو اسلامی رسالے نکلتے ہیں، ان میں سے کون سا رسالہ ہے جو ہر حلقہ میں پڑھا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہاں تو ایسا کوئی رسالہ نہیں۔ یہاں جتنے اسلامی رسالے نکلتے ہیں وہ سب کسی حلقہ سے نکلتے ہیں اور اسی حلقہ میں پڑھے جاتے ہیں۔

ایک نوجوان نے بتایا کہ یہاں انڈیا کی فلمیں پاکستانی فلموں سے زیادہ مقبول ہیں۔ انڈیا کو دوسرا ہالی وڈ کہا جاتا ہے۔ یہاں کے نوجوان کہتے ہیں کہ انگریزی ہالی وڈ امریکہ میں ہے اور اردو ہالی وڈ انڈیا میں۔ پاکستان کے سینما ہاؤسوں میں انڈیا کی فلم دکھائی نہیں جاتی۔ البتہ اس کے ویڈیو گھروں کے اندر وی سی آر پر بہت بڑے پیمانے پر دیکھے جاتے ہیں۔

گورنمنٹ فورمن کرسچین کالج یہاں کا بہت بڑا کالج ہے۔ اس کا رقبہ ۱۸۲ ایکڑ ہے۔ طلبہ کی تعداد چھ ہزار سے زیادہ ہے۔ ۲۴ ستمبر کی دوپہر کو یہاں کے آڈیٹوریم میں خطاب کے بعد اتنے زیادہ سوالات آئے کہ کاغذات کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک سوال بہت صاف ہندی رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔ طلبہ کے جوش و خروش کو دیکھ کر میں نے کہا کہ آج میری سمجھ میں آگیا کہ یہاں کے لوگوں کے لئے کسی نے "زندہ دلان پنجاب" کا لفظ کیوں استعمال کیا تھا۔

عبدالمجید صاحب ٹوکیو (جاپان) میں رہتے ہیں۔ ان کا ایک خط مورخہ ۱۶ ستمبر جناب محمد اسلم اٹل کے پاس دیکھا۔ اس میں انھوں نے جاپانیوں کے حالات لکھے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ جاپانی بہت باکردار قوم ہیں۔ ان کے یہاں رشوت، سفارش، دھوکا، چوری، قتل وغیرہ کا نام تک نہیں۔ میں نے کبھی کسی مرد یا عورت کو کسی سے جھگڑتے نہیں دیکھا۔ ان کی زندگی کا مقصد یہ ہے — خود خوش رہو اور دوسروں کو خوش رہنے دو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ فطری اعتبار سے اس معیار اخلاق پر ہیں جس کو حدیث میں اس طرح بتایا گیا ہے کہ "مومن وہ ہے جو دوسروں کے لئے وہی پسند کرے جو وہ اپنے

لے پسند کرتا ہے۔" گویا کہ وہ لوگ "۵۰ فیصد" دین خداوندی کے قریب آچکے ہیں۔ اب صرف "پچاس فیصد" مزید انھیں خدا کے دین کے قریب لانا ہے۔ اس کے بعد وہ یہ کہتے ہوئے خدا کے دین میں داخل ہو جائیں گے کہ "ہم تو پہلے ہی سے اس پر ایمان لائے ہوئے تھے۔"

جناب محمد اسلم اُپّل اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور اسی کے ساتھ نہایت سنجیدہ ہیں۔ وہ ایک کالج میں استاد ہیں۔ وہ اس کے سخت خلاف ہیں کہ تعلیم گاہوں میں سیاست کو داخل کیا جائے۔ انھوں نے ایک ملاقات میں کہا کہ اگر ہماری تعلیم گاہوں کے طلبہ اور معلم سیاسی مزاج کے ہو جائیں تو اس کے بعد ہمیں کسی اور دشمن کی ضرورت نہیں:

We need not any enemy when teachers and the taught have been politicized.

مجھے ان لوگوں کے نقطۂ نظر سے تو سخت اختلاف ہے جنھوں نے جدید درسگاہوں کو "قتل گاہ" بتایا۔ مگر جناب اسلم صاحب کی مذکورہ رائے سے مجھے صد فیصد اتفاق ہے۔ میری قطعی رائے ہے کہ تعلیم گاہوں سے یونین کا نظام اور سیاسی سرگرمیوں کو مطلق طور پر بند کر دینا چاہئے۔ طالب علمی کے زمانہ میں طالب علم کو صرف پڑھنا چاہئے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک مجلس میں میں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات اور دین کے بنیادی تقاضوں پر گفتگو کی۔ گفتگو ختم ہوئی تو ایک صاحب نے کہا کہ ــــــ" اور بابری مسجد کا مسئلہ" میں نے کہا کہ اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی ہے جیسا لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ۔ حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کا مسئلہ مسجد کا مسئلہ نہیں بلکہ مسجد کو سیاست بنانے کا مسئلہ ہے۔ جہاں کہیں بھی آپ کسی دینی معاملہ کو سیاسی استحصال (political exploitation) کا ذریعہ بنائیں گے تو وہی ہوگا جو بابری مسجد کے ساتھ ہوا۔

آپ کے لئے اس کی ایک قریبی مثال لاہور کی مسجد شہید گنج ہے۔ اس مسجد کو ۱۹۳۵ میں سیاسی استعمال کا ذریعہ بنایا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے ۴۵ سال بعد بھی مسجد شہید گنج تعمیر نہ ہو سکی۔ اس سے آپ اجودھیا کی بابری مسجد کے معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ لاہور کی مسجد شہید گنج کا مسئلہ یہاں کے پرجوش لیڈروں نے پیدا کیا تھا۔ ٹھیک اسی طرح اجودھیا کی بابری مسجد کا مسئلہ

حقیقۃً ہندستان کے کچھ نااہل مسلم لیڈروں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ دونوں کا معاملہ اپنی نوعیت کے اعتبار
سے بالکل یکساں ہے۔

یہاں خطابات کے علاوہ روزانہ صبح وشام کثرت سے لوگ ملنے کے لئے آتے رہے اور ان سے گفت گو اور تبادلۂ خیال جاری رہا۔ چوں کہ میری گفت گو کا سب سے زیادہ ابھرا ہوا موضوع دعوت ہوتا تھا، اس لئے سوال وجواب بھی اکثر براہ راست یا بالواسطہ طور پر اسی سے متعلق تھے۔

کچھ لوگوں نے میرے دعوتی نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہمارا سب سے پہلا کام مسلمانوں کی اصلاح ہے۔ دعوت کا مرحلہ اس کے بعد آتا ہے۔ دوسرے نے کہا کہ ہم کو پہلے اپنے ملک میں اسلام کا نظام قائم کرنا ہے اس کے بعد قوموں کو اسلام کا مخاطب بنانا ہے۔ تیسرے صاحب نے کہا کہ سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی حالت کو درست کیا جائے۔ اس کے بعد دعوت وغیرہ کا کام کیا جائے۔ چوتھے صاحب نے کہا کہ ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم پہلے مسلم امہ کو تیار کریں۔ اس کے بعد یہ مسلم امہ دوسری قوموں پر دین کی گواہی کا کام انجام دے گی۔ وغیرہ۔

اس قسم کی تمام باتوں کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد مسلمان مقام نبوت پر ہیں۔ انذار وتبشیر کا پیغمبرانہ کام ان کی لازمی ذمہ داری ہے۔ کسی بھی عذر یا کسی بھی تاخیر کے بغیر انھیں اس کام کے لئے اٹھنا ہے۔ اور اپنی پوری طاقت کو خرچ کرکے اس کام کو انجام دینا ہے۔ اس کام کی فطری ترتیب یہ ہے کہ جن افراد کے اندر اس کا احساس پیدا ہو وہ افراد اس کام کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس کے بعد دھیرے دھیرے دوسرے افراد بھی اٹھیں گے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آسکتا ہے کہ یہ کام اجتماعی سطح پر ہونے لگے۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ مسلمان اس وقت ساری دنیا میں مسائل کے اندر گھرے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی کوشش انھیں مسائل سے نجات دلانے والی نظر نہیں آتی۔ میں نے کہا کہ یہ معاملہ کسی قوم کی سازش کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنی اصل ڈیوٹی (دعوت الی اللہ) کو چھوڑ رکھا ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کا معاملہ سیدنا یونس جیسا ہے۔ وہ دعوت کے محاذ سے ہٹ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو مچھلی نے نگل لیا۔ اسی طرح مسلمانوں کو مسائل نے نگل رکھا ہے۔ یہ حالت صرف اس وقت ختم ہوگی جبکہ

مسلمان اپنی غلطی کا احساس کریں اور دوبارہ دعوتی ڈیوٹی انجام دینے کی طرف پلٹ آئیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی دوسری تدبیر سے یہ صورت حال ختم ہونے والی نہیں۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں ہر روز خطابات کا پروگرام رہتا تھا۔ اس کی خبریں روزانہ اخبارات میں آتی رہیں۔ مگر اخباری رپورٹر چوں کہ خاص طرح کی زبان کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے بعض اوقات رپورٹنگ میں بڑی عجیب سی غلطیاں ہوئیں۔ مثلاً روزنامہ وفاق (۲۴ ستمبر) میں ایک تقریر کی رپورٹنگ میں یہ درج تھا کہ " مولانا نے کہا کہ اس وقت اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں نے نماز روزہ ترک کر دیا ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کو دین کی روح سے بیگانہ کیا جا رہا ہے (صفحہ ۱)

آجکل یہ مزاج ہے کہ ہر خرابی کا ذمہ دار حکومت کو بتا کر اس کی مذمت کی جاتی ہے۔ اس لئے رپورٹر کی زبان پر " بیگانہ کیا جا رہا ہے " کا جملہ آگیا۔ حالاں کہ الرسالہ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ یہ میرا مسلک نہیں۔ میں نے اپنی بات " لازم " کے صیغہ میں کہی تھی، رپورٹر نے اس کو " متعدی " کے صیغہ میں تبدیل کر دیا۔

ایک صاحب سے صدام حسین اور ان کے پیدا کردہ خلیجی المیہ پر گفتگو ہوئی۔ میں نے کہا کہ مسلم تاریخ میں اتنی بڑی نادانی کی کوئی اور مثال مشکل سے ملے گی۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی اکثریت ہر جگہ بشمول پاکستان صدام حسین کی حامی بن گئی۔ انھوں نے کہا کہ صدام حسین کا جرأتمندانہ انداز اور اس کا امریکہ اور اسرائیل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولنا ایسا واقعہ تھا جس نے تمام مسلمانوں کو مسحور کر دیا۔ میں نے کہا کہ یہی مسلمانوں کی اصل کمزوری ہے۔ موجودہ مسلمان ایک الفاظ پسند قوم بن گئے ہیں۔ اور سیاسی لیڈران کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مگر الفاظ پسندی صرف زوال کی علامت ہے۔

امام مالک نے اپنی موطا میں قاسم بن محمد تابعی کا قول صحابہ کے بارے میں نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایسے لوگ دیکھے ہیں جو قول پر کچھ بھی خوش نہیں ہوتے تھے (ادركت الناس وما يعجبون بالقول)

زندہ لوگ ہمیشہ عمل کو اہمیت دیتے ہیں اور مردہ لوگ الفاظ کو۔ صحابہ کرام زندہ لوگ تھے، اس لئے وہ عمل کو اہمیت دیتے تھے۔ موجودہ مسلمانوں میں زندگی نہیں۔ اس لئے وہ الفاظ کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں یہی ہمارا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مسلمانوں کی یہی وہ کمزوری ہے

لاہور میں اجتماعی پروگرام

۲۰ ستمبر ۱۹۹۱	مسجد بلال نیو گارڈن ٹاؤن، خطبہ جمعہ سے پہلے تقریر، موضوع:	نماز کی حقیقت
	مسجد بلال گارڈن ٹاؤن، بعد نماز مغرب:	درس قرآن
	لاہور کے کچھ مسلم نوجوانوں سے ملاقات:	اسلامی جماعتیں
۲۱ ستمبر	قائد اعظم لائبریری کے ہال میں خطاب:	اسلام اور عصر حاضر
	روزنامہ جنگ کے صدر دفتر کے ہال میں صحافیوں سے خطاب:	اسلام اور امن عالم
	پریس کونسل آف انٹرنیشنل افیرس کے تحت، ہلٹن ہوٹل:	صحابہ کرام کے کارنامے
	گارڈن ٹاؤن کے ایک مکان پر	درس حدیث
۲۲ ستمبر	قارئین الرسالہ سے ملاقات بر مکان کرامت شیخ صاحب:	تاثرات، سوال و جواب
	مسجد شان اسلام، گلبرگ میں خطاب:	اسلام کا عقیدۂ آخرت
	ہفت روزہ زندگی کی ٹیم سے تفصیلی انٹرویو:	ملت اسلامی کے مسائل
۲۳ ستمبر	روزنامہ نوائے وقت کے نمائندہ مسٹر عطاء الرحمن سے انٹرویو:	مسلمانان ہند کے مسائل
	ادارہ امور پاکستان کے ہال میں خطاب:	اسلام اور نیا چیلنج
	ماہنامہ اشراق کے دفتر میں ملاقات:	مسائل حاضرہ پر گفتگو
۲۴ ستمبر	گورنمنٹ فورمن کرسچین کالج میں خطاب:	اظہار اسلام
	کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کی مسجد میں خطاب:	دین کی حقیقت
	مسجد بلال، نیو گارڈن ٹاؤن میں بعد نماز مغرب:	درس حدیث
۲۵ ستمبر	نوجوانوں کے ایک حلقہ سے ملاقات:	موجودہ اسلامی تحریکیں
	گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں اساتذہ و طلبہ سے خطاب	عہد حاضر کا چیلنج
	مسجد بلال میں نماز مغرب کے بعد	درس حدیث
	جم خانہ کلب میں	آج کا انسان اور اسلام
۲۶ ستمبر	اخبار پاکستان کے نمائندہ مسٹر حفیظ قریشی سے انٹرویو	مسلمانان ہند کے مسائل
	نوجوانوں کے ایک اجتماع سے خطاب	توحید اور آخرت

جس نے انہیں اشتعال پسند لیڈروں کی شکارگاہ بنادیا ہے۔

کرسٹینا لیمب برطانیہ کی ایک خاتون جرنلسٹ ہیں۔ وہ فائنینشل ٹائمس کی کرسپانڈنٹ کی حیثیت سے کئی سال تک پاکستان میں رہی ہیں۔ پاکستان کے بارہ میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں انھوں نے ۳۰۰ صفحہ کی ایک کتاب تیار کی ہے۔ یہ کتاب لندن سے چھپی ہے:

Christina Lamb,
Waiting for Allah — Pakistan's Struggle for Democracy

وہ لکھتی ہیں کہ ابتداءً جب میں پاکستان آئی تو اس سے مجھے بہت دلچسپی ہوئی۔ میں نے اس کے بارہ میں بڑی بڑی امیدیں قائم کرلیں۔ مگر حقیقی تجربات نے مجھے اس کے بارہ میں مایوس کر دیا۔ خاص طور سیاسی کرپشن پاکستان کو اتنا زیادہ برباد کرچکا ہے کہ بظاہر اس کی ترقی کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے خیالات کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے کہ —— آؤ ہم خدا پر بھروسہ کریں اور انتظار کریں کہ وہ ہم کو نجات دے گا۔ کیونکہ ہم خود یہ کام نہیں کرسکتے:

Let us have faith in Allah and wait for Him to redeem us, because we cannot do it ourselves.

کتاب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ پاکستان کے بارہ میں برطانوی خاتون کے احساسات اس کے معاندکے احساسات نہیں ہیں بلکہ اس کے دوست کے احساسات ہیں۔ تاہم میں نے ایک صاحب سے کہا کہ پاکستان کی موجودہ صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ جس کے اوپر آتی ہے وہ یہاں کا "اسلام پسند طبقہ ہے۔ پاکستان بننے کے فوراً بعد ان لوگوں نے نہایت غیر دانش مندانہ طور پر یہ کیا کہ وہ "اسلامائزیشن آف پاکستان" کا سیاسی جھنڈا لے کر کھڑے ہوگئے۔ حالاں کہ ان کے کرنے کا کام یہ تھا کہ وہ اسلامائزیشن آف مین کے محاذ پر اپنی ساری قوتیں صرف کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے کہ ریاست کے معاملہ کو نارمل پولٹیکل پراسس کے حوالے کر دیتے اور خود فرد اور معاشرہ کی اصلاح کی مہم میں لگ جاتے تو یقینی طور پر پاکستان کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو برطانی صحافی جیسے بہی خواہوں کو آج وہاں نظر آتی ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ مسلم دنیا کو ایٹمی طاقت بننا چاہئے۔ انھوں نے حوالہ دیا کہ لیبیا کے لیڈر

معمر قذافی نے عرب ملکوں سے کہا ہے کہ انھیں اگلے ۲۰ سال میں متحدہ طور پر ذرّی ہتھیاروں پر مشتمل مزاحمتی طاقت بنانا چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ اگر لیبیا نے مناسب مقدار میں طاقت ور اسلحہ بنایا ہوتا تو پھر ہم ۱۹۸۶ میں امریکہ کی بم باری کا جواب دیتے۔ اگر ہمارے پاس نیویارک پہنچنے والے میزائل ہوتے تو اس بمباری کے جواب میں اسی وقت ہم اپنی فوجوں کو نیویارک پر میزائل پھینکنے کی ہدایت کرتے۔ اس لئے ہمیں یہ طاقت حاصل کرنا چاہئے تاکہ آئندہ امریکہ یا کوئی اور ہم پر دوبارہ حملہ کرنے کے بارے میں نہ سوچے (نوائے وقت، ۲۳ اپریل ۱۹۹۰)

میں نے کہا کہ ہتھیار کی جس طاقت کو معمر قذافی حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ سوویت روس کے پاس بھاری مقدار میں موجود تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے ہتھیار کو اپنے دشمن امریکہ پر استعمال کرنے کے لئے اپنے آپ کو عاجز پایا۔ چنانچہ اس نے امریکہ پر میزائل مارنے کے بجائے اس سے مصالحت کی بات چیت کی۔ حتی کہ اس مصالحت کو ممکن بنانے کے لئے اس پر راضی ہو گیا کہ وہ اپنے ہتھیاروں کو برباد کر دے۔

مختلف واقعات نے ثابت کیا ہے کہ آج دنیا اس حد تک بدل چکی ہے کہ اب تشدد کی طاقت نے اپنی اثر انگیزی کھو دی ہے۔ آج تشدد کی طاقت کے مقابلہ میں امن کی طاقت زیادہ موثر ہے۔

اس معاملہ کی ایک مثال جاپان ہے۔ جاپان نے صنعتی اعتبار سے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ مگر جاپان کے پاس آج بھی کوئی قابل ذکر فوجی طاقت نہیں۔ مگر جاپان کی تعمیری ترقی امریکہ کے لئے زیادہ بڑا خطرہ بن گئی ہے۔ امریکہ میں اوپی نین پول سے معلوم ہوا ہے کہ بیشتر امریکی روس کی فوجی طاقت کے مقابلہ میں جاپان کی صنعتی اور اقتصادی طاقت کو اپنے لئے زیادہ بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔

ٹائم (۳۰ اپریل ۱۹۹۰) نے ایک اوپی نین پول میں اپنے امریکی قارئین سے پوچھا کہ :

Was the U.S. right or wrong to get involved in the Vietnam War?

اس سوال کے جواب میں ۲۹ فی صد امریکیوں نے کہا کہ امریکہ اپنے اس اقدام میں رائٹ تھا اور ۵۷ فی صد امریکیوں نے کہا کہ امریکہ اپنے اس اقدام میں رانگ تھا۔ یہ ویٹ نام جنگ ختم ہونے کے پندرہ سال بعد کا جواب ہے۔ ویٹ نام کی جنگ (۷۵ - ۱۹۶۵) میں امریکہ کے ۵۸۰۲۲ مرد اور عورت ہلاک ہوئے۔ ویٹ نام کی جنگ ۱۹۶۵ سے ۱۹۷۵ تک جاری رہی۔

ٹائمس آف انڈیا (۳۰ ستمبر ۱۹۹۱) میں یہ خبر دی گئی ہے کہ مولانا عبد القادر آزاد کو کچھ لوگ تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں جنھوں نے شہزادی ڈائنا کو بادشاہی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی تھی۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ شہزادی ڈائنا جس وقت مسجد کے اندر داخل ہوئیں ان کی ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں، اور یہ اسلام کی رو سے جائز نہیں۔ مولانا عبد القادر آزاد نے اس کے جواب میں کہا کہ اسلام کا یہ اصول مسلم عورتوں کے لئے ہے نہ کہ غیر مسلم عورتوں کے لئے۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ لاہور کے ایک وکیل کی معرفت کچھ لوگوں نے مولانا عبد القادر آزاد کے خلاف ایک فوجداری کیس (criminal complaint) دائر کر دیا ہے۔ خبر میں یہ اشارہ ہے کہ اس کے پیچھے اصل میں سیاسی مقصد ہے۔ مولانا عبد القادر آزاد وزیر اعظم نواز شریف سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ نواز شریف کے مخالفین اس واقعہ کو وزیر اعظم کو بدنام کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال کرنے کی یہ سیاست مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ مگر وہ بہت بڑا گناہ ہے اور مسلمانوں کو آخری حد تک اس سے بچنا چاہئے۔

لاہور کے ایک اخبار کے نمائندہ انٹرویو لینے کے لئے آئے۔ انھوں نے ہندستانی مسلمانوں کے بارہ میں دریافت کیا۔ ان کے ہاتھ میں دہلی کا انگریزی ماہنامہ "مسلم انڈیا" تھا۔ میں نے کہا کہ آپ ہندستانی مسلمانوں کی حالت اسی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہندستان کا مسلمان اپنے ماہنامہ کا نام "مسلم انڈیا" رکھتا ہے اور برسوں سے اس کو نکال رہا ہے۔ مگر اس کو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اس کے برعکس پاکستان کے ہندو اگر "ہندو پاکستان" کے نام سے اپنا ماہنامہ نکالیں تو مجھے امید نہیں کہ یہاں وہ اس کو نکالنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

میں نے کہا کہ ہندستان میں ہم کو مکمل آزادی ہے۔ وہاں "ہندستان میں اسلام کا غلبہ" (موومنٹ اگست ۱۹۹۱) کے عنوان سے مضامین چھپتے ہیں۔ حالاں کہ پاکستان میں ہندوؤں کے لئے ناممکن ہے کہ وہ "پاکستان میں ہندوازم کا غلبہ" کے عنوان سے مضامین چھاپیں۔ لاہور کے ایک صاحب ہندستان جاتے ہیں اور وہاں یہ تقریر کرتے ہیں کہ ہم آرمڈ اسٹرگل کے ذریعہ اسلامی انقلاب برپا کریں گے۔ اور وہاں ان کی تقریر پر پابندی نہیں لگتی۔ حالاں کہ انڈیا سے ایک ہندو آکر یہاں تقریر

کرے کہ ہم ہتھیاروں کے زور پر ہندو نظام قائم کریں گے، تو ناممکن ہے کہ وہ یہاں اس قسم کی تقریر کر سکے۔

انڈیا میں ۳ لاکھ مسجدیں ہیں۔ ان مسجدوں میں اسی طرح لاؤڈ اسپیکر پر اذان ہوتی ہے جس طرح پاکستان میں ہوتی ہے۔ وہاں ہر شہر اور ہر بستی میں لاکھوں کی تعداد میں مدرسے قائم ہیں۔ اور سب کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ مسلمان اسلام کے نام پر بڑے بڑے جلسے اور کانفرنسیں کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

انھوں نے کہا کہ "مسلم انڈیا" تو لکھتا ہے کہ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں بہت کم ہیں۔ میں نے کہا کہ مسلم انڈیا آدھی بات لکھتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مسلمان تعلیم میں دوسری قوموں سے بہت زیادہ پیچھے ہیں۔ اور جب تعلیم میں پیچھے ہیں تو سروسوں میں وہ برابری کا درجہ کس طرح پا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر ہندستان میں ہندو مسلم فساد کیوں ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ اسی بنا پر جس بنا پر پاکستان میں مسلم مسلم فساد ہوتے ہیں۔ دونوں کا سبب ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے صبر و اعراض نہ کرنا۔

مجھے اشتیاق تھا کہ لاہور کے اس تاریخی مقام کو دیکھوں جو "مسجد شہید گنج" کے نام سے مشہور ہے۔ ۲۱ ستمبر کی شام کو جناب کرامت شیخ صاحب کے ساتھ اس کو دیکھا۔ یہ مقام یہاں کے مشہور نولکھا بازار میں واقع ہے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہماری گاڑی نولکھا بازار کی تنگ گلیوں میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ہم نے گاڑی کو باہر سڑک پر چھوڑ دیا اور نولکھا بازار میں داخل ہو کر پیدل روانہ ہوئے۔ پر ہجوم گلی سے گزرتے ہوئے آخر کار ہم وہاں پہنچے جہاں مذکورہ عمارت واقع ہے۔

وہاں پہنچ کر سب سے پہلا عجیب منظر جو دکھائی دیا وہ عمارت کے مقام داخلہ پر لگا ہوا بورڈ تھا اس بورڈ پر انگریزی اور اردو میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: گوردوارہ شہید گنج سنگھیاں۔ گویا بورڈ کے اعتبار سے یہ عمارت مسجد نہیں ہے بلکہ گوردوارہ ہے۔

یہ مقام اس وقت پاکستان وقف بورڈ کے تحت ہے۔ یہاں بورڈ کی طرف سے ایک صاحب چوکیدار کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا نام عادل بادشاہ اور ۳۵ سال بتائی۔ انھوں نے کئی حیرت انگیز باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ تقریباً [illegible] سال پہلے یہاں انڈیا [illegible] ہوگئے۔ [illegible] سال [illegible] تقریباً [illegible] داخل ہوئے تو مسجد میں پہنچ کر بری طرح رونے لگے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیوں روتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جب انگریز پولیس نے

معلوم ہوگئی تھی۔ اس وقت میں یہاں موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ بہت سے مسلمان یہاں جمع ہیں اور اندر داخل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریز پولیس نے ایک نشان کردیا تھا کہ اس حد سے آگے کوئی نہ بڑھے۔ مسلمان نہایت جوش میں تھے۔ وہ بڑھ کر اس حد کو پار کرتے۔ میں نے دیکھا کہ ایک مسلمان آگے بڑھا۔ پولیس نے گولی چلائی۔ اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا مسلمان آگے بڑھا۔ دوبارہ پولیس نے گولی چلائی۔ اور اس کی لاش وہیں گر پڑی۔ اس طرح بارہ آدمی بڑھے اور سب کے سب گولی کھاکر گرتے رہے۔ اس کے بعد مجھے دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ میں وہاں سے ہٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کے بعد کیا ہوا۔

خدابخش لائبریری جرنل کے حوالے سے ہفت روزہ نقیب (پٹنہ) کے شمارہ ۹ ستمبر ۱۹۹۱ میں ایک دستاویز شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب لنڈا بازار میں دو سو سال پہلے ایک مسجد تعمیر ہوئی جو مسجد عبداللہ خاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کو لاہور کے کوتوال عبداللہ خاں نے بنوایا تھا۔ سکھوں کی شورش کے زمانہ میں پنجاب کے مغل گورنر نے ان کی سرکوبی شروع کی۔ مسجد کے قریب ہی کوتوالی میں سکھ مجرموں کو سزا دی جاتی تھی۔ اسی زمانہ میں ایک سکھ لیڈر تارو سنگھ یہیں مارا گیا۔

اس کے بعد جب سکھوں کا راج آیا تو انھوں نے مسجد پر قبضہ کرلیا اور اس کے قریب تارو سنگھ کی یاد میں ایک سمادھی بنادی۔ جون ۱۹۳۵ میں سکھوں نے فیصلہ کیا کہ مسجد عبداللہ خاں (جو اب مسجد شہید گنج کہی جاتی تھی) کو ڈھاکر وہیں گوردوارہ بنایا جائے۔ اس پر مسلمانوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مسلم رہنماؤں کا ایک وفد انگریز گورنر سے ملا لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ اور برطانی سنگینوں کی حفاظت میں سکھوں نے مسجد کو گرادیا۔

اس پر مسلمانوں کا بہت بڑا جلوس نکلا جو اندرون شہر سے دہلی دروازہ کے باہر پہنچا۔ یہاں پولیس نے صف بندی کی۔ مگر جلوس صف بندی کو توڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد پولیس اور فوج کے ساتھ مسلمانوں کا خونیں تصادم شروع ہوا جو ۴۸ گھنٹے تک جاری رہا۔ دو دن کے اندر دس بار گولی چلی۔ تیرہ نوجوان ہلاک ہوگئے اور سیکڑوں مسلمان زخمی ہوئے۔ گورنمنٹ نے مسجد کے انہدام سے پہلے ہی مسلمانوں کے لیڈر ظفر علی خاں وغیرہ کو پکڑ کر جیل میں بند کر دیا تھا۔

انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے مال روڈ پر مسجد شاہ چراغ کو واگزار کر دیا جو تقریباً ۵۰ سال سے انگریزوں کے قبضہ میں چلی آرہی تھی۔ مگر مسلمان اس پر راضی نہیں ہوئے۔ مجلس اتحاد ملت کے نیلی پوش رضاکاروں نے سول نافرمانی شروع کر دی۔ ہزاروں نوجوان جیلوں میں چلے گئے۔ مسلمانوں کے تمام لیڈر بھی قید میں تھے۔ ایک نوجوان ابو سعید انور اور اس کے ساتھی بادشاہی مسجد کو اڈا بنا کر حکومت کے خلاف تحریک چلا رہے تھے۔

اسی کے ساتھ لاہور کی دو مسلم جماعتوں کے درمیان معرکہ گرم ہوگیا۔ دہلی دروازہ کے باہر سرخ رنگ کی دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ جو شخص ادھر سے گزرتا، احراری اس کی قمیص اتار کر سرخ رنگ میں رنگ دیتے۔ دوسری طرف موچی دروازہ کے باہر نیلے رنگ کی دیگیں تیار رہتی تھیں۔ یہاں لوگوں کے کرتے نیلے رنگ میں رنگے جا رہے تھے۔ بازاروں میں سرخ پوش اور نیلی پوش کثرت سے نظر آرہے تھے۔

مجلس احرار کا نشان سرخ رنگ تھا اور مجلس اتحاد ملت کا نشان نیلا رنگ۔ مسجد شہید گنج کی تحریک کے زمانہ میں ان دونوں کا جوش اپنے شباب پر پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ وہ عام مسلمانوں کو پکڑ کر ان کے کپڑے اپنے پسندیدہ رنگ میں رنگنے لگے تھے۔ اس نے مسجد شہید گنج کے مسئلہ کو تو حل نہیں کیا۔ البتہ اس جنونی عمل کے نتیجے میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان ناقابل بیان نفرت پیدا ہوگئی —— یہی انجام موجودہ زمانہ کی تمام مشہور مسلم تحریکوں کا ہوا ہے۔

قرآن میں حکم ہے کہ اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں ان پر سب وشتم نہ کرو، ورنہ یہ لوگ حد سے گزر کر جہالت کی بنا پر اللہ کو سب وشتم کرنے لگیں گے۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نظر میں اس کے عمل کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ اس وقت اللہ انھیں بتا دے گا جو وہ کرتے تھے (الانعام ۱۰۹)

علماء نے کہا ہے کہ اس آیت کا حکم اس امت پر ہر حال میں باقی ہے۔ جب بھی اہل باطل طاقتور حیثیت میں ہوں اور یہ اندیشہ ہو کہ اسلام پر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یا اللہ پر سب وشتم کیا جائے گا تو کسی مسلمان کے لئے جائز نہ ہوگا کہ وہ ان کی صلیب کو یا ان کے دین کو یا ان کے عبادت خانہ کو برا کہے اور نہ کوئی ایسا فعل کرے جس کا یہ نتیجہ نکلنے والا ہو۔ کیونکہ یہ ان کو معصیت پر ابھارنے کے ہم معنی ہے (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۶۱/۷)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی شریعت میں ایسے ہر اقدام سے منع کیا گیا ہے جو الٹا نتیجہ (کاؤنٹر پروڈکٹو)

ثابت ہوئے۔ دوسری طرف موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے بڑے پیمانہ پر یہ فعل انجام دیا ہے۔ مسجد اقصیٰ (۱۹۶۹) سلمان رشدی (۱۹۸۹)، شاہ بانو کیس (۱۹۸۵)، بابری مسجد (۱۹۸۶) وغیرہ مسائل پر جو دھواں دھار تحریکیں چلائی گئیں وہ سب اسی کے تحت آتی ہیں۔ ان تحریکوں سے کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں ملا۔ البتہ ان کا یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا کہ ساری دنیا میں اسلام سے نفرت پیدا ہوگئی۔ دین رحمت لوگوں کی نظر میں صرف دین تشدد بن کر رہ گیا۔

۲۶ جنوری ۱۹۳۸ کو لاہور ہائی کورٹ نے مسجد شہید گنج کے مقدمہ میں مسلمانوں کے خلاف فیصلہ دیا۔ اگلے دن اسلامیہ کالج کے گراؤنڈ میں احتجاجی جلسہ ہوا۔ اس کے بعد بادشاہی مسجد میں ایک جلسہ عام ہوا۔ شہر کے مختلف حصوں سے جلوس نکل رہے تھے۔ سب کی منزل بادشاہی مسجد تھی۔ مسجد مسلمانوں سے بھر گئی۔ مولانا ظفر علی خاں جلسہ کی صدارت کے لئے آئے۔ وہ منبر پر کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا: عزیزان ملت - میں تمہارے لئے ایک بشارت لایا ہوں۔ انھوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہر طرف اللہ اکبر کے نعرے گونجنے لگے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا کہ آج میری آنکھوں نے یہ روح پرور منظر دیکھا کہ ہزاروں مسلم نوجوان ننگے سر اور دیوانہ وار سڑک پر چلے جا رہے ہیں۔ ایک طالب علم کہتا ہے: تم کو کیا چاہئے (What do you want) اور پھر سب کے سب جواب دیتے ہیں: مسجد شہید گنج (Shahid ganj mosque) لوگو، جب کسی قوم کے نوجوان اس طرح فیصلہ کرلیں تو کوئی طاقت انھیں کامیابی سے روک نہیں سکتی۔

شورش کاشمیری نے اپنی کتاب "بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل" میں مسجد شہید گنج کا قصہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کے کچھ حصے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

جولائی ۱۹۳۵ میں ایک دن ہنگامہ برپا ہوگیا کہ سکھ اس مسجد کو گرا رہے ہیں۔ پورا شہر بھڑک اٹھا۔ اس روز جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز کے بعد مسلمانوں نے شہید گنج کا رخ کیا۔ ہزارہا مسلمان نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے شہید گنج کی طرف روانہ ہوگئے۔ سیکڑوں لوگ مسلح تھے۔ اور بعض نوجوانوں نے تیزاب کی پچکاریاں بھری ہوئی تھیں۔ میں بھی تماشائی کے طور پر ساتھ ہوگیا۔

جلوس شہید گنج کے چوک پر پہنچا تھا کہ اسی وقت گھوڑ سوار پولیس آگئی۔ پیادہ پولیس بھی کافی تعداد میں تھی۔ سٹی مجسٹریٹ نریندر سنگھ نے آتے ہی مسلمانوں پر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا۔

سکھوں نے شہید گنج کی بالکونی سے " راج کرے گا خالصہ " کے نعرے بلند کئے۔ مسجد پر مستقل گولی چلی اگلے دن تک مسجد کا نام و نشان نہ تھا۔ جب لاٹھی چارج کارگر نہیں ہوا تو پولیس نے گولی چلائی جس میں بہت سے مسلمان ہلاک ہو گئے۔ دو دن متواتر مسلمانوں نے گولیاں کھائیں۔

اس سے پہلے سکھوں نے گوردوارہ تحریک چلائی تھی۔ ان کی بے مثال قربانیوں کے بعد گوردوارہ ایکٹ بنا تو گوردوارے مہنتوں اور گیانیوں سے لے کر گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کئے گئے۔ اس فہرست میں شہید گنج کو بھی شامل کیا گیا۔ نواب مظفر خاں نے سکھوں کا یہ حق تسلیم کر لیا اور انھیں کے دستخطوں سے شہید گنج سکھوں کو ملی تھی۔ مسلمان اپنا دعویٰ ہار چکے تھے۔ اب گیارہ بارہ سال بعد ان کا دعوائے ملکیت برطانوی قانون کے نزدیک بے معنی تھا۔ آخر کار مورچہ ختم ہو گیا۔

اسی زمانہ میں پیر جماعت علی شاہ نے اعلان کیا تھا کہ اگر شہید گنج مسجد مسلمانوں کے حوالے نہ کی گئی تو وہ شاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگا دیں گے۔ مسلمان اس اعلان پر ہجوم اٹھے۔ مگر شاہی مسجد کے مینار سراپا انتظار بنے کھڑے رہے۔ پیر صاحب نے عذر تراشا کہ شاہی مسجد کا امام وہابی ہے، اور وہ آج تک وہاں کی مسجد میں نہیں گئے۔

اس کے بعد ریزولیوشن پاس ہوتے رہے۔ کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ نعرے لگے۔ جلسے ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ شہید گنج اب بھی اسی طرح پڑی ہے اور اسلامی سلطنت کے دور میں بھی وہ سکھوں کی ملکیت تسلیم کی جاتی ہے"

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے ہمیشہ منفی تحریکیں چلائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا عام مزاج منفی مزاج بن گیا۔ اب مسلمان ہمیشہ اس وقت جوش دکھاتے ہیں جب کہ مسئلہ " مسلم ورسس نان مسلم " ہو۔ جب نان مسلم نشانہ سے ہٹ جائے تو اس کے بعد مسلمانوں کا جوش عمل بھی ختم ہو جاتا ہے۔

یہی معاملہ خود ہندوؤں کا بھی ہے۔ ہندستان کے جو ہندو مسلمانوں کے خلاف جوش دکھا رہے ہیں وہ اسی لئے ایسا کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو ان کے نشانہ پر کھڑا کر رکھا ہے۔ اگر مسلمان اپنے آپ کو ان کے نشانہ سے ہٹا لیں تو اس کے بعد ان ہندوؤں کا جوش بھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر ایودھیا کے " رام مندر " کا بھی وہی انجام ہوگا جو لاہور کی مسجد شہید گنج کا ہوا ہے۔

اس مزاج کا ایک دلچسپ مظاہرہ ستمبر ۱۹۹۱ میں ہوا ہے۔ دوردرشن پر بچوں کے ایک پروگرام میں کوئز (Quiz) کے دوران ایک ہندو بچہ سے پوچھا گیا کہ "شوبوائے" کی تاریخ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ آزادی سے پہلے مسٹر جناح نے یہ لفظ مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے استعمال کیا تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں میں دوردرشن کے خلاف ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ اس قول کی اصل ذمہ داری مسٹر جناح پر ہے۔ مگر مسلمانوں نے کبھی مسٹر جناح کے خلاف ہنگامہ نہیں کیا۔ البتہ یہی لفظ ٹی وی پر ایک ہندو بچہ نے دہرایا تو اس کے خلاف وہ ہنگامہ کرنے لگے۔ وہ یہ مطالبہ لے کر کھڑے ہوگئے کہ ٹی وی کے اس عملہ کو برطرف کیا جائے جس نے اس قسم کا کوئز ٹی وی پر دکھایا ہے۔

لاہور کے سفر کے لئے جب میرا رزرویشن ہوا تو اس کے مطابق، مجھے ۱۹ ستمبر کو وہاں جانا تھا اور ۲۶ ستمبر کو دہلی واپس آنا تھا۔ یہ مدت میرے لئے غیر معمولی طور پر زیادہ تھی۔ چنانچہ لاہور پہنچتے ہی یہ حال ہوا کہ میں دن گننے لگا۔ ایک ایک دن ختم ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۲۶ ستمبر آگیا جب کہ مجھے یہاں سے روانہ ہونا تھا۔ ۲۶ ستمبر کی صبح کو جب میں اٹھا اور روانگی کی تیاری کرنے لگا تو ایسا محسوس ہوا کہ گویا میں سفر آخرت کی تیاری کر رہا ہوں۔

میں نے سوچا کہ جس طرح لاہور میں ایک ایک دن ختم ہو کر آخر کار ۲۶ ستمبر آگیا۔ اسی طرح دنیا میں بھی میرے ایک ایک دن گزر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ لمحہ آجائے گا جب کہ دنیا سے نکل کر مجھے آخرت کی طرف سفر کرنا ہوگا۔ ایک مدت ختم ہوگئی۔ اسی طرح دوسری مدت بھی ختم ہو جائے گی۔ پہلی مدت کے خاتمہ پر انسانی سواری مجھے لاہور سے اٹھا کر دہلی پہنچا رہی ہے۔ دوسری مدت کے خاتمہ پر فرشتوں کی سواری آجائے گی اور مجھ کو دنیا سے نکال کر آخرت کے عالم میں پہنچا دے گی۔ کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آچکا، کیسا عجیب ہے وہ وقت جو آنے والا ہے۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ کو پی آئی اے کی فلائٹ ۲۷۰ کے ذریعہ لاہور سے دہلی کے لئے روانگی ہوئی۔ ایرپورٹ پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری سیٹ کینسل ہو چکی ہے۔ دہلی سے اگرچہ میری واپسی کی سیٹ کنفرم تھی۔ مگر قاعدہ کے مطابق، مجھے اپنی سیٹ کو ری کنفرم کرانا چاہئے تھا۔ مگر میں نہ کرا سکا۔ اس بنا پر حسب قاعدہ میری سیٹ کینسل ہوگئی۔ مگر ایرپورٹ کے عملہ نے غیر معمولی تعاون دیا۔ مجھے سیٹ دوبارہ مل گئی۔

ایرپورٹ پر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ روانگی کے اعلان کا انتظار کر رہا تھا۔ ان میں جناب

امیر العظیم صاحب (انچارج شعبۂ اطلاعات جماعت اسلامی پاکستان) بھی تھے۔ امیر العظیم صاحب کے ہاتھ میں ایک "موبائل ٹیلیفون" تھا۔ ٹیلی فون کا عام تصور یہ ہے کہ گھر یا آفس میں جہاں ٹیلی فون نصب ہو، وہیں سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ مگر موبائل ٹیلی فون ایک چلتا پھرتا ذریعہ رابطہ ہے۔ چنانچہ امیر العظیم صاحب کے دستی ٹیلی فون پر کئی بار گفتگو کی۔ انھوں نے لاہور کے اندر اور لاہور کے باہر مختلف مقامات سے اس طرح گفتگو کی جیسے کہ دونوں پاس بیٹھے ہوئے ہوں۔ امیر العظیم صاحب نے کہا کہ پہلے مجھے ربط قائم کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں اپنے دفتر یا گھر میں موجود رہوں۔ اب میں خواہ جہاں بھی رہوں فوراً لوگوں کے ساتھ میرا رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے قرآن کی وہ آیت یاد آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اللہ تم سب کو لے آئے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (البقرہ ۱۴۸) اللہ کے لئے پوری طرح ممکن ہے کہ وہ مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے انسانوں سے ربط قائم کرے اور ان کو اپنے پاس بلائے۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کی ایجادات نے اس عقیدہ کو واقعاتی طور پر قابل فہم بنا دیا ہے۔

جہاز کے اندر داخل ہو کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا کہ جہاز کے عملہ کے ایک صاحب مسکراتے ہوئے میرے پاس آئے۔ ان کے ہاتھ میں لاہور کے اخبار وفاق (۲۶ ستمبر) کا شمارہ تھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اخبار "مولانا وحید الدین نمبر" کے طور پر نکالا گیا ہے۔ اس کی تصویروں سے میں نے سمجھا کہ وہ آپ ہی ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: "آپ بزرگ آدمی ہیں۔ خصوصی دعائیں کریں ہمارے لئے۔ بہت برا حال ہے ہمارا۔" ان کے چہرہ پر داڑھی تھی۔ انھوں نے اپنا نام اکرام اللہ بتایا۔

اکرام اللہ صاحب کا یہ جملہ سن کر میرے سامنے وہ مناظر گھومنے لگے جو لاہور میں میرے ساتھ گزرے تھے۔ ایک صاحب سے میری ملاقات کرائی گئی۔ وہ کرتا اور پائجامہ پہنے ہوئے تھے۔ سر پر گول ٹوپی اور چہرہ پر داڑھی تھی۔ بظاہر وہ ایک مولوی معلوم ہوتے تھے۔ مگر تعارف کرانے والے نے بتایا کہ یہ ہمارے یہاں کے فلاں شعبہ کے ڈائرکٹر ہیں۔ اسی طرح بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ کوئی چیف انجینئر تھا اور کوئی ڈاکٹر، کوئی پروفیسر تھا اور کوئی بہت بڑا تاجر۔ مگر اسی کے ساتھ دین دار اور اسلامی تشخص کو اپنائے ہوئے۔ اسی فہرست میں اکرام اللہ صاحب کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

میں نے سوچا کہ جب پاکستان میں ایسے قابل رشک دین دار موجود ہیں تو اکرام اللہ صاحب نے ایسا

پرنسس کی جھلکیوں کو دیکھا۔ غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ اس کا اصل سبب موجودہ اخبارات ہیں۔ یہ اخبارات ملک کے اچھے واقعات کو نمایاں نہیں کرتے۔ وہ زیادہ تر برے واقعات کو اپنے صفحات میں نمایاں کرتے ہیں۔ عام آدمی جو صبح سے شام تک اپنے کام میں مشغول رہتا ہے، اس کے لئے اخبارات ہی ملکی حالات کو جاننے کا ذریعہ ہیں۔ اخباروں کا "زرد صحافت" کا انداز انھیں ملک کے حالات کے صرف ۵۰ فیصد سے باخبر کرتا ہے۔ بقیہ ۵۰ فیصد ان کے لئے نامعلوم بنا رہتا ہے۔ اس صورت حال نے سوچنے والے لوگوں میں غیر ضروری طور پر مایوسی کی نفسیات پیدا کر دی ہے۔ حالاں کہ وہ اصل حقیقت کے مطابق نہیں۔

جہاز میں لاہور کا انگریزی اخبار پاکستان ٹائمس (۲۶ ستمبر) دیکھا۔ اس کے صفحہ اول اور صفحہ آخر پر لیڈی ڈائنا کی رنگین تصویر تھی۔ اس کے علاوہ بھی اس میں موصوفہ کی بہت سی تصویریں تھیں۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ لیڈی ڈائنا جب بادشاہی مسجد پہنچیں تو وہاں کے امام مولانا عبد القادر نے ان کو قرآن کا ہدیہ پیش کیا اور سیرت رسول پر ایک کتاب انھیں عطا کی۔ تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ امام صاحب سے قرآن کا ہدیہ لیتے ہوئے شہزادی ڈائنا نے اپنے سر کو دوپٹہ سے ڈھانک رکھا تھا۔ خبر کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی گئی تھی:

Diana impressed by Lahore cultural heritage.

جہاز میں پی آئی اے کا میگزین ہم سفر (ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۱) موجود تھا۔ اس میں ایک مضمون کھیوڑہ کی نمک کی کانوں کے بارہ میں تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ دنیا میں نمک کے سب سے بڑے ذخائر پاکستان میں ہیں۔ یہاں کے پہاڑوں میں ایک ایسا طویل سلسلہ موجود ہے جو اندر سے مکمل طور پر نمک ہیں۔ ان پہاڑوں کو کوہستان نمک یا سالٹ رینج کہا جاتا ہے۔ دنیا میں نمک کے دوسرے سب سے بڑے ذخائر پولینڈ میں ہیں۔

نمک کی ان کانوں کو ماہرین نے "ارضیاتی عجائب گھر" کا نام دیا ہے۔ ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ نمک کے یہ پہاڑ تقریباً چار ارب سال پرانے ہیں۔ نمک کی یہ کانیں ۳۲۲ قبل مسیح میں سکندر اعظم کے زمانہ میں دریافت ہو چکی تھیں۔ کھیوڑہ میں سائنسی بنیادوں پر نمک کی کان کنی کا آغاز ۱۸۴۹ میں انگریزوں کے دور حکومت میں ہوا۔ کھیوڑہ کی کانوں سے ہر روز تقریباً ۲۰ ہزار من نمک نکالا جاتا ہے۔

مضمون میں بہت سی دلچسپ معلومات تھیں۔ نیز بتایا گیا تھا کہ جس مقام سے نمک کے ذخائر

کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ یہ دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد مسجد ہے اس مسجد کا فرش پورا نمک کا ہے۔ اس کی دیواروں میں جو اینٹیں لگی ہوئی ہیں وہ بھی سب نمک ہیں۔ یہ مسجد ۵۰ سال پہلے بنائی گئی تھی۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۱ کو میں دہلی واپس پہنچا تھا۔ پاکستان میں صرف ویزا کی مدت کے بقدر رہ سکتا تھا۔ ہندستان میں میرے قیام کے لئے بظاہر اس قسم کی کوئی تحدید نہیں ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہاں بھی میرا ٹھہرنا ایک محدود مدت تک ہی کے لئے ہے۔ اس کے بعد میرے لئے آخری روانگی کا وقت آجائے گا۔ موجودہ سواری نے مجھے دہلی ایرپورٹ پر اتارا ہے، اگلی سواری مجھے کہاں اتارے گی، اس کا علم اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں ——— کیسا عجیب مرحلۂ حیات پیش آچکا ہے، کیسا عجیب مرحلۂ حیات پیش آنے والا ہے۔

الرسالہ کیسٹ — ارکانِ اسلام سیٹ

اس وقت ارکانِ اسلام کے نام سے کیسٹوں کا ایک سیٹ زیر تیاری ہے۔ جس کی ترتیب حسب ذیل ہے۔

۱۔ حقیقتِ ایمان

۲۔ حقیقتِ نماز

۳۔ حقیقتِ روزہ

۴۔ حقیقتِ زکاۃ

۵۔ حقیقتِ حج

ایمان کے موضوع پر ابتدا ہی میں ایک کیسٹ تیار کیا جا چکا ہے۔ اب بقیہ چار موضوعات پر علاحدہ علاحدہ کیسٹ بنائے جارہے ہیں جن میں عام فہم انداز میں اسلامی عبادات کی حقیقت اور ان کے تربیتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ پورا سیٹ جلد ہی تیار ہو جائے گا۔

ہدیہ فی کیسٹ ۲۵ روپیہ □ ہدیہ فی سیٹ ۱۱۰ روپیہ

AL-RISALA CASSETTE C-29 Nizamuddin West New Delhi 110 013

ہندستانی اندولن کی طرف سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۹۳ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر (نئی دہلی) میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: (Movement for National resurgence) منتظمین کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ملک کی سیاسی اور سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اہل ملک کو تعلیم یافتہ اور باشعور بنایا جائے۔

۲ پانچ جنیہ کے سب اڈیٹر مسٹر ایم اے بھرت نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق مسلمانان ہند کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ڈبل اسٹینڈرڈ بننا اسلام میں حرام ہے۔ اسلام میں یہ ہے کہ آدمی جو کہے وہی کرے اور جو کرتا ہے وہی بولے۔

۳ مسٹر للت کمار شرما نے ۳ اکتوبر ۱۹۹۳ کو آل انڈیا ریڈیو کے لئے صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۴ اکتوبر کی صبح کو آکاشں وانی (میڈیم ویو) سے نشر کیا گیا۔ ایک سوال کے جواب میں انھیں بتایا گیا کہ ہمارا ایک ہی مشن ہے جس کو ہم ۲۵ سال سے چلا رہے ہیں۔ اور وہ یہ کہ زندگی کا راز ایڈجسٹمنٹ میں ہے۔ کامیابی اس کو ملتی ہے جو مشکلات کو نظر انداز کرے اور امکانات کو استعمال کرے۔

۴ صدر اسلامی مرکز نے ۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو جگت گرو سوامی سروپانندجی سرسوتی، سنکراچاریہ آف دوارکا پیٹھ سے نئی دہلی میں ملاقات کی۔ ان سے بابری مسجد اور دوسرے ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز کی اس تجویز سے اتفاق کیا کہ جس طرح چاروں سنکراچاریہ کی میٹنگ سرنگیری میں ہوئی تھی، اسی طرح مخصوص علماء کی ایک میٹنگ بلائی جائے تاکہ اس مسئلہ پر غور ہو سکے۔

۵ انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر کے اڈیٹر سیشادری چاری نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز سے طویل صحافتی ملاقات کی۔ ڈاکٹر مہیش شرما بھی ان کے ساتھ موجود تھے۔ مسلمان ہندو اور ملک کے بہت سے مسائل زیر بحث آئے۔

خلاف ہے۔ عرب ملکوں میں کچھ پرجوش تحریکوں نے مسجد کو مخالفانہ سرگرمیوں کا مرکز بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں مسجدیں صرف نماز کے وقت کھلتی ہیں اور نماز کے بعد فوراً بند کر دی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہئے کہ عرب ملکوں کی یہی مثال دوسرے ملکوں میں بھی دہرائی جائے۔

۱۰ مسٹر میک کیونس (Dalip MACcuns) نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو دہلی کے انگلش میگزین راشٹریہ سہارا کے لئے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ انڈیا کوئی مستثنیٰ ملک نہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں جس طرح مسلمان امن کے ساتھ رہتے ہیں اسی طرح وہ انڈیا میں بھی رہ سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ انڈیا میں بھی اس طرح غیر احتجاجی انداز میں رہنے لگیں جس طرح وہ دوسرے ملکوں میں غیر احتجاجی انداز میں رہ رہے ہیں۔

۱۱ ہندی اخبار دینک جاگرن کے نمائندہ مسٹر وقاص نے ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستان میں مسلمانوں کے موجودہ مسائل سے تھا۔

۱۲ بی بی سی کے نمائندہ مسٹر پرویز عالم نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔

۱۳ ہندی اخبار جن ستا کے نمائندہ مسٹر رام بہادر رائے نے ۲ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ ۱۸ اکتوبر کو دوردرشن پر جو کچھ کہا گیا وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ یہ بات میں ۱۹۶۸ سے مسلسل کہتا رہا ہوں۔ اس کے لئے الجمعیۃ کا فائل اور الرسالہ کا فائل دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۴ نوبھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر یشونت دیش مکھ نے ۳۱ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا مفصل انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا تعلق زیادہ تر ملک کے موجودہ حالات اور موجودہ مسلم مسائل سے تھا۔ یہ انٹرویو اور اس کی بنیاد پر اڈیٹوریل دونوں نوبھارت ٹائمس کے شمارہ ۲ نومبر میں شائع ہوئے ہیں۔

۶ سارناتھ (بنارس) کے ادارہ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف ہائر تبتن اسٹڈیز :

Central Institute of Higher Tibetan Studies

میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۹۳ کو ایک انٹر ریلیجس ڈائیلاگ ہوا۔ اس کا موضوع تھا :

Plurality of Religions in the Contemporary World

اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ بعض وجوہ سے وہ شریک نہ ہو سکے۔ تاہم اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے انھیں ایک پیپر بھیج دیا گیا۔

۷ مراکش کے ایک صحافی استاد الصادق ۱۸ اکتوبر ۱۹۹۳ کو مرکز میں آئے۔ ان کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد جناب محمد ایوب صاحب بھی تھے۔ مراکش کے صحافی ہندستانی مسلمانوں پر ایک رپورٹ تیار کرنے کے لئے ہندستان آئے ہیں۔ انھوں نے صدر اسلامی مرکز سے اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کی۔ انھیں بتایا گیا کہ ہندستان کے مسلمانوں کا معاملہ بھی ویسا ہی ہے جیسا دوسرے ملکوں کا معاملہ۔ یہاں کے مسلمانوں کو اسی طرح ہر قسم کی ترقی کے مواقع حاصل ہوئے ہیں جس طرح دوسرے ملکوں میں ہیں۔ تاہم کسی بھی ملک میں ترقی اور کامیابی ہوش مندی کے ذریعہ حاصل کی جا سکتی ہے اور اسی طرح ہندستان میں بھی۔

۸ ہندی روزنامہ نوبھارت ٹائمس کے نمائندہ مسٹر اسرار خاں نے ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع یہ تھا کہ مسجد کے اندر سیاسی سرگرمی اور مسلح سرگرمی کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ مسجد عبادت اور ذکر الٰہی کے لئے ہوتی ہے۔ چنانچہ مسجدوں میں یہ شعر لکھا رہتا ہے :

مسجد خدا کا گھر ہے عبادت کا کام ہے دنیا کی بات کرنا مطلق حرام ہے

۹ دوردرشن (نئی دہلی) کی ایک ٹیم نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۹۳ کو صدر اسلامی مرکز کی ایک تقریر ریکارڈ کی جو اسی دن نیشنل چینل پر دکھائی گئی۔ اس تقریر کا موضوع یہ تھا کہ اسلام میں مسجد کا حکم کیا ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ مسجد ذکر اور عبادت یا اس سے براہ راست تعلق رکھنے والی خالص دینی سرگرمیوں کے لئے ہے۔ مسجد کو سیاست کا مرکز بنانا اسلامی تعلیم کے بالکل

کیا مسجد نبوی صرف ذکر الٰہی کے لئے مخصوص تھی - ہر لڑائی کا Control

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ ہندی اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (ہندی اور انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو، ہندی یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

ہندستان کے لیے		بیرونی ممالک کے لیے	(ہوائی ڈاک)	(بحری ڈاک)
ایک سال	Rs 70	ایک سال	$20 / £10	$10 / £5
دو سال	Rs 135	دو سال	$35 / £18	$18 / £8
تین سال	Rs 200	تین سال	$50 / £25	$25 / £12
پانچ سال	Rs 300	پانچ سال	$80 / £40	$40 / £18
خصوصی تعاون (سالانہ)	Rs 500	خصوصی تعاون (سالانہ)	$100 / £50	

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

نومبر ۱۹۹۴، شمارہ ۲۱۶

ضروری اعلان

الرسالہ کی قیمت دسمبر ۱۹۹۴ سے ۷ روپیہ فی شمارہ ہوگی۔

منیجر الرسالہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 6 □ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

ایمان میں نقصان

ذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم
لم اولئک لہم الامن وہم مہتدون
لانعام ۸۲)

جو لوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے اپنے ایمان میں کوئی نقصان نہیں ملایا انھیں کے لیے امن ہے اور وہی لوگ ہدایت پائے ہوئے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں ظلم سے مراد نقصان ہے۔ لغت عرب میں ظلم کا یہ مفہوم آتا ہے (لسان رب) اور خود قرآن میں اس کا استعمال موجود ہے۔ سورہ الکہف میں دو باغ کا ذکر ہے۔ اس سلسلہ ں فرمایا کہ دونوں باغ خوب سرسبز و شاداب تھے۔ دونوں اپنا پھل لائے اور اس میں کچھ نہیں ایا (الکہف ۳۳)

اس دنیا میں ہر فائدہ والی چیز کے ساتھ نقصان کا پہلو لگا ہوا ہے۔ مثلاً تجارت ایک مفید رہے۔ لیکن ایک تاجر اگر ایسا کرے کہ وہ تجارت کرنے کے ساتھ بری عادتوں میں بھی اپنے کو پھنسا لے۔ وہ اپنی پوری بکری کو اپنا نفع سمجھ لے۔ وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ دادا گیری کرنے لگے۔ وہ پنے اصحاب معاملہ سے وعدہ خلافی اور بددیانتی کا سلوک کرے۔ جو تاجر ایسا کرے وہ بہت جلد دالیہ ہو جائے گا، ایسا تاجر کبھی کامیاب تاجر نہیں بن سکتا۔

یہی معاملہ ایمان کا ہے۔ ایمان بے حد قیمتی چیز ہے۔ مگر ایمان کو اس کے نقصانات سے بچانا ہے۔ جو آدمی اپنے ایمان کو اس کے نقصانات سے نہ بچائے اس کا ایمان اس کو نفع پہنچانے والا نہیں۔

ایمان کا نقصان یہ ہے کہ آدمی کے سامنے حق آئے مگر وہ اس کا اعتراف نہ کرے۔ اس سے گناہ زد ہو مگر وہ توبہ نہ کرے۔ وہ اپنی توحید میں شرک کی ملاوٹ کر دے۔ اس کو امانت سونپی جائے وہ اس میں خیانت کرنے لگے۔ ایک عمل خیر اس کی استطاعت میں ہو مگر وہ اس کو انجام نہ ے۔ خدا کے دین کو وہ اپنے لیے سامان تجارت بنا لے۔ وہ ایک ایسے کام کا کریڈٹ نے کی کوشش کرے جس کو اس نے انجام نہیں دیا۔ اس قسم کی تمام چیزیں ایمان میں نقص پیدا نے والی ہیں، اور جس ایمان میں نقص شامل ہو جائے وہ ایمان خدا کے یہاں قابل قبول نہیں۔

منافق کی پہچان

صحیح بخاری اور صحیح مسلم (کتاب الایمان) میں منافقت کی پہچان کے بارہ میں کچھ روایتیں آئی
معمولی لفظی فرق کے ساتھ وہ روایت یہ ہے :

ع مَن كنَّ فيه كانَ منافِقاً خالصاً۔
ائتمِنَ خانَ - وَ اذا حدَّثَ كَذَبَ۔
ا عاهدَ غدَرَ و اذا خاصَمَ
رَ - و إن صامَ وصلّى و زعَمَ
ه مُسلِمٌ -

چار خصلتیں جس میں ہوں وہ پورا منافق ہے جب وہ امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ اور جب وہ وعدہ کرے تو اس سے پھر جائے اور جب وہ بحث کرے تو انصاف سے ہٹ جائے۔ خواہ وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔

اجتماعی زندگی میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان جو باہمی معاملات پیش آتے
ان کی مختلف صورتیں ہیں۔ تاہم بڑی تقسیم میں وہ چار ہیں۔ آدمی کی اندرونی شخصیت کیسی ہے، اس
ہار ان پہلوؤں میں ہوتا رہتا ہے۔ ایک قسم کا اظہار آدمی کے مخلص ہونے کی پہچان ہے اور دوسرے
ا اظہار آدمی کے منافق ہونے کی پہچان۔

مال اور جائداد کے سلسلہ میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کی چیز دوسرے انسان کے
میں آجاتی ہے۔ اب جو آدمی دوسرے کی چیز کو حق دار کے حوالے نہ کرے بلکہ اس پر خود قبضہ
نے لگے وہ ایسا کرکے اپنے آپ کو منافق ثابت کر رہا ہے۔

یہی معاملہ قول کا ہے۔ ایک آدمی اگر اپنے قول میں محتاط نہ ہو، وہ بات کرے تو اس
جھوٹ ملادے تو ایسا آدمی اللہ کے نزدیک منافقین میں شامل ہے۔

اس طرح ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان بسا اوقات معاہدہ کی صورت پیش
ہے۔ اب جو شخص معاہدہ تو کرے مگر معاہدہ پورا کرنے کا وقت آئے تو اس کو پورا نہ کرے
ہ حقیقت کے اعتبار سے منافق ہے۔

مومن با اصول انسان کا نام ہے اور منافق بے اصول انسان کا نام۔

۵ الرسالہ نومبر ۱۹۹۴

محفوظ دوری

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد سے فرمایا کہ تم لوگ زمین پر آباد ہو اور تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنو گے (بعضکم لبعض عدو) اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ امتحانی دنیا میں انسان کو جن حالات کے درمیان رہنا ہے ان میں ایسا بھی ضرور ہوتا ہے کہ لوگوں میں اختلاف اور مقابلے جاری ہوں جو بڑھ کر عداوت تک پہنچ جائیں۔ حتیٰ کہ قتل و خون کی نوبت آجائے۔ ایسا ہونا خود تخلیقی منصوبہ کے مطابق ہے۔ اس لیے اس کو ختم کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ درخت سے کانٹے کو ختم کرنا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لیے کیا کیا جائے۔ کیونکہ لڑائی اور ٹکراؤ کے درمیان صحت مند زندگی کی تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ صحت مند زندگی بنانے کے لیے معتدل حالات کی موجودگی لازمی طور پر ضروری ہے۔

اس کا جواب خود خالق حقیقی نے پیشگی طور پر دے دیا ہے۔ اور وہ صبر و اعراض ہے۔ عداوت کی اس دنیا میں کامیاب زندگی بنانے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ ٹکراؤ کے مواقع سے اعراض کیا جائے۔ اشتعال انگیزی اور ناخوش گواری اور ضرر رسانی کے تجربات پیش آئیں مگر ان کو نظر انداز کیا جائے۔ زیادہ فائدہ کی خاطر کم نقصان کو برداشت کر لیا جائے۔

جنگل کے جانوروں میں بھی عداوت کا یہی اصول کارفرما ہے۔ پھر جنگل کے جانور کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ کرتا ہے کہ فطرت کی رہنمائی کے تحت وہ اپنے آپ کو اپنے دشمن یا حریف کے مقابلہ میں محفوظ فاصلہ (safe distance) پر رکھتا ہے۔ یہی واحد فطری اصول ہے جس پر جنگل کی زندگی کروروں سال سے قائم ہے۔

محفوظ دوری پر رہنے کا یہ اصول فطرت کا اصول ہے۔ اسی کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ سڑک پر آپ اپنے کو دوسری گاڑیوں سے محفوظ دوری پر رکھتے ہیں، اسی لیے آپ کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کر کے منزل پر پہنچتے ہیں۔ یہی اصول گھر کے لیے، بازار کے لیے، اجتماعی زندگی کے تمام مواقع کے لیے ضروری ہے۔ ہر جگہ ہمیں اپنے آپ کو دوسروں سے محفوظ دوری پر رکھنا ہے۔ اس دنیا میں یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے، اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کا حصول ممکن نہیں۔

انسانی فطرت

ابوالبرکات صاحب (نظام پور، اعظم گڑھ) سے ۲ دسمبر ۱۹۹۱ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں انھوں نے مندرجہ ذیل واقعہ بتایا۔

ضلع اعظم گڑھ میں ماہل کے قریب ہندوؤں کا ایک گاؤں ہے۔ اس کا نام ٹکریا (Tikurya) ہے۔ پڑوس کے گاؤں رسول پور سے ایک یادو چوری کی غرض سے یہاں پہنچا۔ رات کا وقت تھا۔ ایک گھر کے پاس پہنچ کر اس نے اس کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ یہ بھی ایک یادو کا گھر تھا۔ اس نے اپنی بھانجی کی اپنے یہاں پرورش کی تھی، اس وقت صرف بھانجی گھر میں تھی۔ اس کا ماما (ماموں) کسی ضرورت سے باہر چلا گیا تھا۔

کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سن کر لڑکی دروازہ پر آئی۔ اس نے سمجھا کہ اس کا ماما واپس آیا ہے۔ تصدیق کے لیے اس نے اندر سے کہا "ماما!" باہر کے آدمی نے یہ سن کر کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ مگر جب دروازہ کھلا تو سامنے کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ آخر کار وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ لڑکی دوبارہ دروازہ پر آئی اور تصدیق کے لیے پھر کہا کہ ماما!۔ باہر سے آواز آئی کہ ہاں۔ اب لڑکی نے دوبارہ دروازہ کھول دیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا ماما واپس آیا ہے۔ ابھی دونوں دروازہ ہی پر تھے کہ لڑکی نے کہا کہ اس سے پہلے آپ دروازہ کھلوا کر کہاں چلے گئے تھے۔ ماما نے کہا کہ میں تو اس سے پہلے نہیں آیا۔ لڑکی نے کہا کہ پھر کون تھا جس نے اس سے پہلے کنڈی کھٹکھٹائی۔

یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی کہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ ماما نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا کہ میں چور ہوں۔ ماما نے دوبارہ کہا کہ جب تم چور ہو تو دروازہ کھلنے کے بعد اندر گھس کر اپنا کام کیوں نہیں کیا۔ چور نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جب لڑکی نے اندر سے پوچھا کہ ماما۔ تو میں نے کہہ دیا کہ ہاں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنے آپ کو لڑکی کا ماما بنا دیا۔ اور ماما کبھی کسی بھانجی کے گھر میں چوری نہیں کر سکتا۔

، الرسالہ نومبر ۱۹۹۴

صفحۂ عبرت

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (صفر ۱۴۱۴ھ) میں کرسٹوفر کولمبس (۱۵۰۶-۱۴۵۱ء) کے بارہ میں ایک تحقیقی مضمون چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: لماذا أخطأ کولمبس (کولمبس نے کیوں غلطی کی؟) اس کے لکھنے والے دکتور مظفر صلاح الدین شعبان ہیں۔ اس مضمون کا ایک پیراگراف یہ ہے:

فی الفترة الممتدة من القرن الثامن و حتی القرن الثانی عشر کانت اللغة العربیة هی لغة العلوم لغالبیة الجنس البشری۔ و لهذا السبب فقد اعتبر کولمبس اللغة العربیة ام جمیع اللغات۔ و هذا یفسر سبب اصطحابه معه فی رحلته الاولی الإسبانی لویس دی تور الذی یتقن العربیة مترجما خاصا له (صفحہ ۳۰)

آٹھویں صدی سے لے کر بارھویں صدی عیسوی تک کے زمانہ میں عربی زبان ہی دنیا کے بیشتر لوگوں کی علمی زبان تھی۔ اور اسی بنا پر کولمبس نے عربی زبان کو تمام زبانوں کی ماں قرار دیا اور اسی سے اس کا سبب بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیوں اپنے پہلے سفر میں ایک اسپینی لوئی دی تور کو خصوصی مترجم کے طور پر اپنے ساتھ لے گیا جو کہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھا۔

اس واقعہ کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں اس طرح آیا ہے — کولمبس چوں کہ نہیں جانتا تھا کہ وہ جہاں جا رہا ہے وہاں اس کو وحشی لوگ ملیں گے یا مہذب لوگ، اس نے اپنے جہازوں پر سستے اور معمولی سامان لاد لیے تاکہ وہ وہاں کے قدیم باشندوں سے ان کا سونا حاصل کر سکے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے ایک شخص لوئی دی تور کو اپنے جہاز میں بٹھایا جو کہ ایک یہودی تھا اور وہ عبرانی اور کلدانی کے علاوہ کچھ عربی زبان بھی جانتا تھا، اس ضرورت کے پیش نظر کہ وہاں "عظیم خان" سے اس کی ملاقات پیش آجائے:

As Columbus did not know whether he was to come across new savages or old civilizations, he loaded his ships with cheap merchandise to relieve aboriginals of their gold, but also took on board one Luis de Torres — "who had been a Jew and knew Hebrew and Chaldeand a little Arabic" — in case he met the "grand khan". (4/938)

یہ اس دور کی بات ہے جو پانچ سو سال پہلے دنیا میں پایا جاتا تھا۔ اس وقت عربی زبان کا وہی مقام تھا جو آج انگریزی زبان کا مقام ہے۔ اس وقت عربوں کو وہی درجہ حاصل تھا جو آج اہل مغرب کو حاصل ہے۔ اس وقت عالمی واقعات کی کنجی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی جس طرح آج وہ غیر مسلموں کے ہاتھ میں دکھائی دیتی ہے۔

یہ تبدیلی کسی سازش کی بنا پر پیش نہیں آئی۔ بلکہ تمام تر فطرت کے قانون کے تحت پیش آئی۔ اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ جس کو جو کچھ ملے گا استعداد کی بنا پر ملے گا اور جس سے جو کچھ چھنے گا بے استعدادی کی بنا پر چھن جائے گا۔ اس دنیا میں جو لوگ محروم رہ جائیں انہیں دوسروں کی سازش یا تعدی کا انکشاف کرنے کے بجائے اپنی بے استعدادی کو ختم کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اگر وہ کچھ پائیں گے تو اپنی بے استعدادی کو ختم کر کے ہی پائیں گے۔ شکایت اور احتجاج کی بنیاد پر یہاں انھیں کچھ ملنے والا نہیں۔

موجودہ دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے کسی خاص نسل یا کسی خاص گروہ کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ تمام انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہاں کسی ایک انسان کا جو حق ہے وہی دوسرے تمام انسانوں کا حق بھی ہے۔ یہاں کوئی چیز صرف وہ لوگ پاتے ہیں جو فی الواقع اس کے حق دار ہوں۔

حق دار کون ہے۔ قرآن کے مطابق، حق دار وہ ہے جس میں نفع بخشی کی صلاحیت ہو۔ قرآن میں فطرت کا ایک مستقل اصول یہ بتایا گیا ہے کہ جو چیز انسانوں کو نفع پہنچانے والی ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے (وامّا ما ینفع النّاس فیمکث فی الارض) :

and that which is for the good of mankind remains on the earth

یہی اس دنیا کے تمام انسانوں کے لیے ابدی قانون ہے۔ یہاں قیام و استحکام صرف اس کو ملتا ہے جو نفع بخشی کا ثبوت دے۔ جو دوسروں کے لیے مفید ثابت ہو۔ کسی قوم کی زبان ہو یا اس کی حکومت، کسی قوم کا کلچر ہو یا اس کی اقتصادیات، کسی بھی چیز کو صرف اس وقت تک زمین کے اوپر برتری اور بالادستی حاصل ہوگی جب کہ اس میں دوسروں کو نفع پہنچانے کی صلاحیت ہو۔ نفع بخشی کی صلاحیت کھوتے ہی وہ اپنا غالب مقام بھی کھو دے گی۔

اصل مسئلہ

مولانا شکیل احمد قاسمی (۴۰ سال) مدرسہ امداد الاسلام میرٹھ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۳ کو دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک تجربہ بتایا جو نہایت سبق آموز ہے۔

انھوں نے کہا کہ نومبر ۱۹۹۲ میں صدر بازار (میرٹھ) کے ایک تعلیم یافتہ ہندو مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیا ان کے مدرسہ میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے دو لڑکوں، گورو اہلو والیا اور چارلی اہلو والیا کو اُردو اور عربی زبان پڑھانا چاہتا ہوں۔ آپ ان کے لیے کسی ٹیوٹر کا انتظام کر دیں۔ مولانا قاسمی نے پوچھا کہ آپ ان بچوں کو اُردو، عربی کیوں پڑھانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچوں میں کھلا ذہن پیدا ہو۔ وہ تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر سوچنے والے بنیں۔ واضح ہو کہ مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیا کا تعلق آر ایس ایس سے ہے اور وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایکٹو ممبر ہیں۔

مولانا شکیل احمد قاسمی نے سوچا کہ اگر میں مدرسہ کے کسی طالب علم کو اس کام پر مقرر کروں تو شاید وہ ٹھیک سے اس کو انجام نہ دے سکے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی اس کام کو کریں گے۔ انھوں نے جب مسٹر اہلو والیا سے یہ بات کہی تو ان کو بہت تعجب ہوا۔ تاہم مولانا قاسمی کے اصرار پر انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اب انھوں نے پوچھا کہ مولانا صاحب، ہم کو ماہوار کتنا دینا ہوگا۔ مولانا قاسمی نے کہا کہ کچھ نہیں۔ یہ تو میرے لیے ایک خوشی کا کام ہے۔ میرے لیے یہی قیمت کافی ہے کہ ایک ایسے حلقہ میں جہاں اُردو ختم ہو رہی ہے وہاں کچھ لوگ اُردو اور عربی جاننے والے پیدا ہو جائیں گے۔ غرض کچھ دیر کی بحث کے بعد طے ہو گیا کہ مولانا قاسمی ان کے گھر پر جا کر ان کے بچوں کو اردو پڑھایا کریں گے۔

مولانا شکیل احمد قاسمی نے مولانا اسماعیل میرٹھی کی ریڈر سے ان بچوں کو اردو پڑھانا شروع کیا۔ یہ سلسلہ یکم دسمبر ۹۲ ۱۹ کو شروع ہوا اور اب تک وہ بدستور جاری ہے۔ اس مدت میں ان ہندو بچوں نے کئی ریڈریں ختم کر لی ہیں۔ وہ اب صحیح املا لکھ لیتے ہیں اور اُردو اخبار (مثلاً قومی آواز) کو آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ اب انھوں نے منہاج العربیۃ کے ذریعہ سے عربی پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت وہ منہاج العربیۃ کا دوسرا حصہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے گھر میں اُردو کا اتنا چرچا ہوا کہ اب خود مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیہ نے بھی مولانا قاسمی سے اردو پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے اردو

کتابوں کے علاوہ بازار سے ضخیم فیروز اللغات بھی خریدلی ہے تاکہ اردو سیکھنے میں وہ ان کے لیے معاون ہو سکے۔

اس تعلیم کا مزید اثر یہ ہوا ہے کہ اہلووالیا فیملی میں "اردو تہذیب" آنا شروع ہو گئی ہے۔ وہ لوگ گفتگو میں ان شاء اللہ، ماشاء اللہ، خدا حافظ جیسے الفاظ کو استعمال کرنے لگے ہیں۔

مسٹر اہلووالیہ ہر طرح مولانا شکیل احمد قاسمی کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر ان کے ساتھ تعاون کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مثلاً مسٹر اہلووالیہ ایک ہندو علاقہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا قاسمی جب ان کے یہاں سے پڑھا کر نکلتے ہیں تو وہ اپنے بچوں کو ان کے ساتھ دور تک بھیجتے ہیں تاکہ لوگ انھیں اجنبی محسوس نہ کریں۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ ہندستان میں ہمارا مسئلہ کیا ہے۔ موجودہ ہندستان میں ہمارا مسئلہ "ہندو فرقہ واریت" نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ ہندو مسلم دوری ہے۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی بھی ذریعہ سے ملنا جلنا شروع ہو جائے تو اس کے بعد تمام مسائل اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ وہ سکتے ہی نہیں۔

دوری غلط فہمی پیدا کرتی ہے اور قربت سے دوستی پیدا ہوتی ہے۔ عام تجربہ ہے کہ جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری آئی وہاں ساتھ ساتھ غلط فہمیاں بھی آگئیں۔ اور جہاں میل طاپ بڑھا وہاں اپنے آپ ایک دوسرے سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان زرعی دور میں تھا۔ اس وقت زراعتی زندگی کے تحت فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بار بار ملنے کی صورتیں پیدا ہوتی تھیں۔ آزادی کے بعد ہندستان میں صنعتی دور آگیا۔ صنعتی دور کے تقاضے کے تحت خاندان منتشر ہو گئے۔ لوگ ادھر ادھر جانے لگے۔ اس طرح مشترک زندگی کا نظام ٹوٹ گیا۔ پچھلے تعلقات باقی نہیں رہے۔ موجودہ زمانہ میں دونوں فرقوں میں دوری کا بڑا سبب یہی ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعلیمی اداروں میں جائیں۔ جدید اقتصادی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ کر حصہ لیں۔ نیز اس انداز کے کام بھی کریں جس کی ایک مثال مولانا شکیل احمد قاسمی کا مذکورہ واقعہ ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ دوبارہ میل طاپ کا سابقہ دور واپس آجائے گا۔

خاموشی

ارنسٹ سیاچری (Ernest Psiachari) ایک فرانسیسی رائٹر ہے۔ وہ ۱۸۸۳ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ ۱۹۱۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ابتداءً آزاد خیال اور ملحد تھا۔ مگر بعد کو وہ مسیحی عقیدہ کی طرف لوٹ آیا اور خدا اور مذہب کو ماننے والا بن گیا۔

ارنسٹ سیاچری مشہور مؤرخ ارنسٹ ریناں کا پوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سمجھا جاتا ہے جنھوں نے ۱۹۱۴ سے پہلے فرانس میں روحانی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے —— خاموشی آسمان کا ایک ٹکڑا ہے جو زمین پر اتارا گیا ہے:

Silence is a bit of heaven that comes down to earth.

خاموشی فطرت کی زبان ہے۔ ایک آدمی جب خاموش ہوتا ہے تو وہ عالم فطرت کا ہم زبان بن جاتا ہے۔ اس کی سطح وہ ہو جاتی ہے جو فطرت کی سطح ہے۔ اور فطرت کی سطح سے بلند سطح اور کوئی نہیں۔

انسان مطلق معنوں میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ انسان جب بظاہر خاموش ہوتا ہے تو اس وقت وہ دوسروں کے لیے خاموش ہوتا ہے مگر اپنے لیے خاموش نہیں ہوتا۔ وہ خارجی دنیا کی طرف سے خاموش ہو کر اپنی داخلی دنیا سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔

چپ رہنا ایک عظیم عمل ہے۔ جب آدمی چپ رہتا ہے تو وہ "زمین" کی باتوں سے زیادہ "آسمان" کی باتوں پر دھیان دے رہا ہوتا ہے۔ وہ انسان سے زیادہ فرشتوں کی سرگوشیوں پر کان لگائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ خود اپنی بات کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ سطحی اور ظاہری باتوں سے زیادہ گہری حقیقتوں کی دریافت میں مشغول ہوتا ہے۔

آدمی جب بولتا ہے تو وہ محدود دنیا میں ہوتا ہے۔ آدمی جب چپ رہتا ہے تو وہ لا محدود دنیا کی وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے۔

خاموش جواب

ڈاکٹر حسن الدین احمد صاحب (حیدرآباد) اپنے خط مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ میں لکھتے ہیں :

قرآن مجید کی تلاوت کے دوران سورہ النسار کی آیت ۱۴۰ اور سورہ الانعام کی آیت ۶۸ نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ دونوں میں تقریباً یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیات کے متعلق بے ہودہ باتیں کرتے ہیں تو تم ان سے منہ پھیر لو۔ یہاں تک کہ وہ ان باتوں کے سوا دوسری باتوں پر غور و خوض شروع کر دیں۔

ان آیات میں تو بظاہر مسلمانوں کو ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے سے منع کیا گیا ہے۔ لیکن سورہ الانعام کی آیت ۶۸ میں فاعرض عنہم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفین کے منہ کو نہ لگیں کہ اس سے بات بڑھ کر رائی سے پہاڑ بن سکتی ہے۔

ان آیات میں آج کی "سیاست ملی" کے لیے کھلا حکم موجود ہے ——— مخالف کو "چپ کرنے" سے وہ چپ نہیں ہوتا۔ بلکہ "چپ رہنے" سے اسے مجبوراً چپ ہونا پڑتا ہے۔ مولانا حالی نے اسی بات کو اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں اس طرح بیان کیا :

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ   سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا"

یہ نہایت صحیح بات ہے۔ عقل اور نقل دونوں کا فیصلہ ہے کہ جو لوگ غیر سنجیدہ باتیں کریں۔ جھوٹے الزام لگائیں۔ طنز، تعریض، تنقیص پر اتر آئیں، ایسے لوگوں کا جواب صرف اعراض ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کا بہترین جواب یہ ہے کہ ان کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔

اعراض کوئی منفعل روش نہیں۔ وہ فریق ثانی کا خاموش جواب ہے۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ بعض اوقات خاموش جواب بولنے سے زیادہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔

اعراض کی پالیسی بے عملی کی پالیسی نہیں، وہ پورے معنوں میں ایک عمل ہے۔ بلکہ اکثر اوقات زیادہ نتیجہ خیز عمل۔ اگر آپ مخالف کی بات کا جواب دیں تو وہ دوبارہ اس کا جواب دے گا۔ اس طرح نزاع باقی رہے گی۔ مگر جب اس کی بات کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ مجبور ہو کر کسی اور کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس طرح نزاع اپنے آپ ختم ہو جاتی ہے۔

ماضی کا ایک صفحہ

انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (جاری شدہ ۱۸۳۸) میں روزانہ اس کے قدیم فائل سے کوئی ایک شائع شدہ خبر نقل کی جاتی ہے۔ اس کے شمارہ ۱۸ جون ۱۹۹۴ میں اس کالم کے تحت وہ خبر نقل کی گئی ہے جو اخبار مذکورہ کے شمارہ ۳۱ مئی ۱۸۷۵ میں چھپی تھی۔ اس خبر کا عنوان تھا ——

مزید یورپی کا قبول اسلام :

More European converts to Islam

اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ بنگلور میں یورپی لوگ اکثر اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے مطابق ۱۰ مئی ۱۸۷۵ کی صبح کو جب ایک ٹرین بنگلور اسٹیشن پر رکی تو اس سے چار یورپی افراد برآمد ہوئے۔ وہ اسٹیشن کے باہر آکر کینٹونمنٹ کے علاقہ میں جنرل بازار کی ایک مسجد میں پہنچے۔ وہاں بہت سے مسلمانوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک مولوی سے کرائی گئی جو حیدرآباد سے بلایا گیا تھا۔ اس مولوی نے کلمہ پڑھا کر ان چاروں کو اسلام میں داخل کیا۔ ان کے نام کی تفصیل یہ ہے :

Captain J. Colin Campbell, 31	Muslim name:	Mahomed Abdoolah
Francis O'Neill, Irish sailor, 20		Abdool Lateef
W. Elder, Irish sailor, 21		Abdoolah
F. White, German sailor, 20		Abdoos Salam

خبر میں مزید بتایا گیا ہے کہ ان نومسلموں میں سے دو آدمی اس کے بعد السور (Ulsoor) گئے۔ وہاں انھوں نے ایک انگریز اورسیر کے پندرہ سالہ لڑکے کو آمادہ کیا کہ وہ بھی انھیں کی طرح اسلام قبول کر لے۔ اس کو راضی کر کے وہ اسے ایک مسجد میں لے گئے۔ مگر مسجد کے ذمہ داروں نے اس کو اسلام میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ لڑکا ابھی نابالغ ہے۔ اگر اس کے باپ کو معلوم ہوا تو وہ ہم کو پریشان کرے گا۔ مگر نومسلموں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اس کے بعد انھوں نے خود ہی لڑکے کا بال مونڈا اور اس کو محمڈن مذہب میں داخل کر لیا۔ sayint

انیسویں صدی کے مسلم رہناؤں نے انگریزوں کو اسلام کا دشمن قرار دے کر ان سے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ مگر اسلام دین فطرت ہے۔ اگر نفرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو ہر ایک کو اسلام اپنے دل کی آواز محسوس ہونے لگے گا۔

ایرانی انقلاب

جون ۱۹۹۲ کے آغاز میں ایران کے صدر ہاشمی رفسنجانی نے اپنے دفتر میں ایرانی مہاجرین کی ایک جماعت سے ملاقات کی۔ وہ لوگ ترک وطن کے کئی سال بعد اعلیٰ تعلیم کی وزارت کی دعوت پر ایران آئے تھے۔ زائرین میں سے ایک صاحب جو کہ ایٹمی تحقیق کے میدان میں بین اقوامی ماہر سمجھے جاتے ہیں، ان سے رفسنجانی نے پوچھا کہ اپنے سابق وطن ایران کے بارہ میں آپ کے تاثرات کیا ہیں۔ صدر کے سوال کے جواب میں ایرانی مہاجر نے جو الفاظ کہے وہ آج کل ایران میں لوگوں کے درمیان بہت گردش کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا : میں نے ملک میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں دیکھی، سوا اس کے کہ شاہ اب عمامہ پہنتا ہے اور اس کے آدمیوں نے بھی اپنے لباس بدل لیے ہیں۔ نائٹ کلب سڑکوں سے منتقل ہو کر گھروں کے اندر چلے گئے ہیں، اور نفاق ایک معمول کی چیز بن گیا ہے۔ بلکہ جو شخص جتنا زیادہ مصنوعی دین داری دکھاتا ہے وہ اتنا ہی بڑا منصب حاصل کرتا ہے۔ حاضرین مجلس کے تعجب اور اضطراب کے درمیان صدر رفسنجانی نے مذکورہ شخص سے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں :

في بداية الشهر الماضي استقبل الرئيس الايراني هاشمي رفسنجاني في مكتبه مجموعة من المغتربين الايرانيين ممن كانوا يزورون ايران بعد سنوات عديدة من الغربة بدعوة من وزارة التعليم العالي. سأل رفسنجاني احد زواره الذي يعتبر خبيرا دوليا في مجال البحوث الذرية، عن انطباعاته خلال زيارته للوطن. وجاء رد المغترب الايراني على سؤال الرئيس في عبارة تتردد حاليا في ايران بين الناسّ، فقال: لم اشاهد تغيرا اساسياً في البلاد سوى ان الشاه يلبس العمامة ورجاله بدّلوا ألبستهم، والنوادي الليلية انتقلت من الشوارع الى داخل البيوت، والنفاق اصبح أمراً عادياً، بل ان من يتظاهر بالتدين اكثر فانه يحصل على منصب أعلى. ووسط استغراب وربما قلق بعض الذين حضروا الاجتماع قال الرئيس لزائره انه على الحق. (المجلة، لندن، ۲۲-۲۸ يوليو ۱۹۹۲)

یہی ہر اس سیاسی انقلاب کی بات ہے جو موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر لایا جا رہا ہے۔ اسلامی انقلاب ہمیشہ دعوت اور کردار سازی اور صابرانہ جدو جہد اور تدریج کے اصول پر برپا ہوتا ہے۔ جب بھی سیاسی ہنگامہ آرائی یا گن کلچر کے ذریعہ انقلاب لانے کی کوشش کی جائے گی تو اس کا انجام ایران جیسا ہوگا، خواہ اس کا نام اسلامی انقلاب یا آسمانی انقلاب کیوں نہ رکھ دیا جائے۔

سطحی اعتراض

ایک ہندو بھائی ہیں۔ وہ الرسالہ (اردو) کو ہر مہینہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ الرسالہ کے بارہ میں آپ کا تاثر کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اور تو سب اچھا ہے۔ اس میں بہت سی اخلاق اور مذہب کی باتیں ہوتی ہیں۔ مگر ایک بات مجھے کھٹکتی ہے۔ ہندستان کے فرقہ وارانہ فساد کے معاملہ میں الرسالہ ہمیشہ ہندوؤں ہی کو برا کہتا ہے۔

پوچھنے والے نے پوچھا کہ یہ تو آپ الٹی بات کہہ رہے ہیں۔ کیوں کہ الرسالہ میں تو کبھی ہندوؤں کے خلاف کچھ نہیں چھپتا۔ اس میں تو ہمیشہ مسلمانوں کو صبر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ ہندو بھائی نے جواب دیا: یہی تو ہندوؤں کو برا بتانا ہے۔ کیوں کہ صبر کسی ظلم کے خلاف ہوتا ہے۔ جب الرسالہ مسلمانوں سے صبر کرنے کے لیے کہتا ہے تو یہ بات اس میں اپنے آپ شامل ہے کہ ہندو ان کے اوپر ظلم کر رہا ہے۔ اگر کوئی مسلمانوں کے اوپر ظلم نہ کر رہا ہو تو صبر کی بات کہاں سے آئے گی۔

میں نے اس واقعہ کو سنا تو میں نے کہا کہ ہمارے مخالف مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو زیادہ گہرائی کے ساتھ الرسالہ کو پڑھتا ہے۔ مسلمانوں میں جو لوگ الرسالہ کے مخالف ہیں، ان کا خاص اعتراض یہ ہے کہ الرسالہ میں ہمیشہ مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے اور ان سے صبر کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے خلاف الرسالہ میں کچھ نہیں ہوتا۔

حالاں کہ مسلمانوں سے صبر کرنے کے لیے کہنا بذات خود یہ معنی رکھتا ہے کہ دوسرا فریق ان کے اوپر ظلم کر رہا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ صبر کرو (الاعراف ۱۲۸) تو اس میں یہ بات لازمی طور پر شامل تھی کہ فرعون یا اس کی قوم تمہارے اوپر ظلم کر رہی ہے۔ مگر اس کے مقابلہ میں تمہیں جوابی تشدد نہیں کرنا ہے۔ بلکہ صبر کرتے ہوئے اللہ کی مدد کا انتظار کرنا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کی مخالفت کرنے والے کتنے سطحی لوگ ہیں۔ انھیں گہری حقیقتوں کی خبر نہیں۔ ان کے اعتراضات کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اپنی سطحیت کو الرسالہ کے اوپر انڈیل رہے ہیں۔

کتنے جاننے والے ایسے ہیں جنھوں نے اب تک کچھ نہیں جانا۔

سنت اجتہاد

رسول کا زمانہ، صحابہ کا زمانہ اور تابعین کا زمانہ اسلام کی تاریخ میں معیاری زمانہ ہے۔ اس کو پیغمبر کی حدیث کی بنا پر قرون مشہود لہا بالخیر کہا جاتا ہے۔ یہ گویا اسلام کا دور اول ہے۔ اسی دور اول کی روشنی میں بعد کے زمانوں کو جانچا جائے گا، نہ کہ بعد کے زمانہ کی روشنی میں دور اول کو جانچا جانے لگے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں بجا طور پر لکھا ہے کہ دور اول میں اسلامی فقہ موجودہ فنی صورت میں پائی نہیں جاتی تھی اور نہ اس کی باقاعدہ تدوین ہوئی تھی۔ مدون فقہ کا آغاز خلافت عباسیہ کے زمانہ میں ہوا۔ دور اول کی فقہ سادہ اور فطری اسلوب پر تھی۔ بعد کے زمانہ میں اس میں تعمق اور تقعّر اور تقسیم کا اضافہ ہوا۔ اس طرح فطری فقہ نے ایک فنی فقہ کی صورت اختیار کرلی۔

فنی فقہ کو سمجھنے کے لئے ایک سادہ مثال لیجئے۔ ایک شخص نے ایک مفتی سے طلاق کے بارہ میں سوال کیا۔ سوال یہ تھا کہ فریقین کے درمیان اگر مسلک کا اختلاف ہو، یعنی ایک حنفی ہے اور دوسرا غیر حنفی، ایسی صورت میں قاضی کیا فیصلہ کرے گا اور اس کا فیصلہ کس طرح ان کے اوپر نافذ ہوگا۔ مفتی نے جواب دیا ——— امور مجتہد فیہا میں فقہاء نے قاضی کے فیصلہ کو رافع خلاف قرار دیا ہے۔

یہ کسی سوال کے جواب کا فنی انداز ہے۔ یہ انداز بعد کے زمانہ میں رائج ہوا۔ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں جواب کے لئے اس انداز کا رواج نہ تھا۔ اس مخصوص اسلوب کو اگر علم فقہ کا لازمی جزء سمجھ لیا جائے تو اس کے بعد یہی ہوگا کہ اگر اس فنی اسلوب میں کمال رکھنے والے لوگ موجود نہ ہوں تو کہنے والے کہیں گے کہ فقہی غور و فکر کا دروازہ بند کر دو، کیوں کہ اب اس کے اہل افراد دنیا میں پائے نہیں جاتے۔

اس تفنن نے فطری دین میں غیر فطری مسائل پیدا کر دئے۔ مثلاً ایک مسئلہ یہ تھا کہ شریعت میں استدلال کی بنیاد کیا ہو۔ اس میں فنی خوض کر کے فقہاء نے چار اصول وضع کئے ———

عبارت النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک غیر ضروری تدقیق ہے۔ اس چار کو ہم سادہ طور پر صرف دو میں بیان کر سکتے ہیں۔ یعنی منصوص استدلال اور استنباطی استدلال۔ جو استدلال براہ راست کسی نص صریح پر مبنی ہو، وہ منصوص استدلال ہے۔ اور جو استدلال کسی نص سے مستنبط کیا جائے وہ استنباطی استدلال۔

اجتہاد کے معاملہ میں بھی اسی طرح کی تدقیق کر کے اس کو غیر ضروری طور پر پیچیدہ بنا دیا گیا ہے۔ اسی مصنوعی پیچیدگی نے چوتھی صدی ہجری میں یہ ذہن پیدا کیا کہ اب ہمیشہ کے لئے اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ کیوں کہ اجتہادی صلاحیت کے لوگ دنیا میں باقی نہیں رہے۔ حالاں کہ اجتہاد کو اگر اس کے فطری مفہوم میں لیا جائے تو اس کا دروازہ بند ہونے کی بات بالکل بے معنی نظر آئے گی۔ کیوں کہ اجتہاد محض ایک شرعی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ضرورتِ حیات ہے۔ اجتہاد دراصل استنباط ہی کی اعلیٰ صورت ہے۔ اور استنباط ایک ایسی انسانی ضرورت ہے جس سے کسی بھی حال میں اور کسی بھی معاملہ میں مفر ممکن نہیں۔

قدیم زمانہ میں اقتصادی معاملات (commercial transactions) کے لئے سونے اور چاندی کے سکے کا رواج تھا جن کا نقل و حمل سخت مشکل تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کاغذی نوٹ کا عمومی استعمال شروع ہوا جس نے اس مسئلہ کو نہایت آسان بنا دیا۔ اس وقت دہلی میں مولانا عبدالحق حقانی موجود تھے۔ کسی آدمی نے مولانا سے فتویٰ پوچھا کہ نوٹ کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ مولانا نے جواب دیا: میرا فتویٰ نہیں چلے گا۔ مگر نوٹ چل جائے گا۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ اجتہاد کس طرح ایک ضرورت حیات ہے۔ اور جو چیز ضرورت حیات کی حیثیت رکھتی ہو وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک خود حیات باقی ہے۔ نہ اس کا دروازہ بند ہونے کا سوال ہے اور نہ اس کی کنجی گم ہونے کا۔

اجتہاد کا لفظ جُہد سے بنا ہے۔ جہد کے معنی کوشش کے ہیں اور اجتہاد کے معنی زیادہ کوشش کے ہیں۔ اجتھد فی الامر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے فلاں معاملہ میں انتہائی کوشش کی۔ اس میں اس نے اپنی پوری صلاحیت استعمال کر ڈالی۔ شریعت کے مسائل میں جب اجتہاد کا لفظ بولا جائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے، اپنی پوری کوشش صرف کر کے متعلقہ معاملہ میں

حل معلوم کرنا۔

مجتہد کی دو بڑی تقسیم کی گئی ہے۔ مجتہد مقید، مجتہد مطلق۔ مجتہد مقید وہ ہے جو پیش آمدہ حالات میں مروجہ فقہی مسالک میں سے کسی مسلک کا پابند رہ کر فتویٰ دے۔ وہ اپنے اختیار کردہ مسلک سے باہر نہ جائے۔ مثلاً فقہ حنفی میں ایک مجلس کی تین طلاق کو تین مانا جاتا ہے۔ اب مسلک حنفی سے وابستہ مجتہد اسی کی پیروی میں فتویٰ دے گا، وہ کسی حال میں اس سے باہر نہیں جائے گا۔

مجتہد مطلق وہ مجتہد ہے جو کسی مسلک فقہ یا کسی امام کی پیروی نہ کرے۔ بلکہ معاملہ پیش آنے کے بعد براہ راست شرعی دلائل کی روشنی میں از خود مسائل و احکام کا استنباط کرے۔ ان دونوں اصطلاحوں میں مقید اور مطلق کا تعین مسالک فقہ کی نسبت سے ہے۔ یعنی مروجہ مسالک فقہ کا پابند رہ کر مسئلہ بیان کرنے والا مجتہد مقید ہے، اور مروجہ مسالک فقہ کی پابندی کے بغیر مسئلہ بیان کرنے والا مجتہد مطلق۔

اس کے بعد مزید تدقیق کر کے مجتہد مقید کی کئی قسمیں بنائی گئی ہیں۔ مثلاً مجتہد منتسب مجتہد تخریج، مجتہد ترجیح، مجتہد الفتیا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کتاب عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید میں مجتہد کی یہ قسمیں بتائی ہیں۔ لیکن اگر تدقیق کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اس فہرست میں مزید اتنے ہی مجتہدین کا اضافہ کیا جا سکتا ہے جتنا کہ بیان کیا جاتا ہے۔

اس معاملہ کو اگر فطری انداز سے دیکھا جائے تو بنیادی طور پر مجتہدین کی صرف دو قسمیں قرار پائیں گی۔ میں ان کو کلی مجتہد اور جزئی مجتہد کہوں گا۔ جزئی مجتہد وہ ہے جو شریعت کے فروعی احکام میں مسلمہ فقہی اصولوں کے مطابق اجتہاد کرے۔ کلی مجتہد وہ ہے جو کسی پیش آمدہ صورت معاملہ میں رواجی ڈھانچہ سے اوپر اٹھ کر شریعت کے وسیع تر اور گہرے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے تخلیقی نوعیت کا ایک اصول وضع کر سکے۔

رسول اور اصحاب رسول کی زندگی میں جس طرح تمام معاملات و مسائل کے لئے نظیریں موجود ہیں۔ اسی طرح جزئی اجتہاد اور کلی اجتہاد کی نظیریں بھی موجود ہیں۔ ان نظیروں اور مثالوں کا مطالعہ کر کے بعد کے زمانوں کے لئے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

جزئی اجتہاد کا ایک واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ خندق سے فراغت کے بعد ذوالقعدہ ۵ھ میں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کی بستی بنو قریظہ کے محاصرہ کے لئے ان کی طرف صحابہ کی ایک جماعت بھیجی۔ ان کو روانہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز اس وقت تک نہ پڑھے جب تک وہ بنو قریظہ کی بستی میں نہ پہنچ جائے (لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ)

السیرۃ النبویہ لابن کثیر ۳ / ۲۲۵

مہم روانہ ہوئی تو راستہ میں عصر کا وقت آگیا۔ کچھ لوگوں نے حکم کی لفظی تعمیل کی۔ وہ راستہ طے کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب بنو قریظہ کی بستی میں پہنچ گئے، اس وقت سواری سے اتر کر عصر کی نماز پڑھی۔ کچھ اور افراد کو اندیشہ ہوا کہ عصر کا وقت شاید نکل جائے۔ چنانچہ انھوں نے درمیان میں رک کر عصر کی نماز ادا کی۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے مراد تعمیل سیر تھی نہ کہ ہر حال میں نماز کی ادائگی میں تاخیر۔

بنو قریظہ کے سفر کا یہ واقعہ جزئی اجتہاد کی ایک مثال ہے۔ یہ مثال خود اصحاب رسول کے ذریعہ قائم ہوئی۔ اس میں بظاہر حکم رسول کی خلاف ورزی تھی۔ اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصدیق فرمائی۔ اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ اجتہاد میں ابتدائی حکم سے ظاہری مطابقت ضروری نہیں ہے۔ اگر اجتہاد میں حکم شرعی کی اصل روح پائی جارہی ہو تو وہ صحیح اجتہاد قرار دیا جائے گا۔

دور اول میں اجتہاد کلی کی ایک مثال وہ ہے جو حدیبیہ کے موقع پر پیش آئی۔ حدیبیہ کا معاہدہ تمام ظاہری حالات سے اوپر اٹھ کر کیا گیا۔ اس اعتبار سے وہ کلی اجتہاد کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے ایک معیاری نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حدیبیہ کا معاہدہ دس سال کا ناجنگ معاہدہ تھا جو یکطرفہ شرائط کی بنیاد پر کیا گیا۔ اس وقت قرآن میں یہ آیت اتر چکی تھی کہ ان لوگوں کو لڑائی کی اجازت دے دی گئی جن سے لڑائی کی جارہی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا (الحج ۳۹) حدیبیہ کے وقت اور حدیبیہ سے پہلے فریق ثانی واضح طور پر ظلم اور جارحیت کا معاملہ کر چکا تھا۔ اس کے باوجود ان کے خلاف جنگ نہیں چھیڑی گئی۔

عمرہ کی ادائگی کے بغیر حدیبیہ سے واپسی سراسر ملی وقار کے خلاف تھی مگر آپ نے اس کو نظرانداز

کر دیا۔ معاہدہ کے کاغذ سے رسول اللہ کا لفظ مٹانا گویا اپنی اصل حیثیت کو مجروح کرنا تھا مگر اس کے باوجود آپ نے رسول اللہ کا لفظ کاغذ سے مٹا دیا۔ ابوجندل کو زخمی حالت میں دشمنوں کی طرف واپس بھیجنا سخت جذباتی معاملہ تھا مگر اس کو بھی آپ نے برداشت کر لیا۔ حدیبیہ میں اصحاب کے پڑاؤ پر مکہ کے آدمیوں نے خشت باری کی مگر آپ نے اس کا انتقام نہیں لیا۔ اس طرح کے متعدد اشتعال انگیز واقعات پیش آئے۔ مگر آپ نے ان سب سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ نے کلی مصلحت کو جزئی مصالح کے اوپر غالب رکھا۔

حدیبیہ کے وقت جو حالات تھے وہ سب کے سب ٹکراؤ کی طرف لے جانے والے تھے۔ اور ظاہری احکام شریعت کے مطابق، اس وقت یہ ٹکراؤ عین جائز بھی تھا۔ مگر آپ نے اس قسم کے تمام حالات سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ نے قریبی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے دور کی پائدار مصلحتوں کو اہمیت دیتے ہوئے صلح کے معاہدہ پر دستخط کر دئے۔ اس کا نتیجہ، قرآن اور تاریخ کی شہادت کے مطابق، فتح مبین کی صورت میں برآمد ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ صلح حدیبیہ نے اسلام کی ابتدائی تاریخ میں کلی اجتہاد کی ایک نہایت ممتاز مثال قائم کی ہے۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس لئے ہوا کہ وہ اہل ایمان کے لئے ایک نمونہ ہو جائے اور ان کو ایک سیدھا راستہ دکھا دے (الفتح ۲۰) گویا حدیبیہ کا معاملہ قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے اجتہاد کلی کا ایک معیاری نمونہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں دوبارہ مسلمانوں کو اجتہاد کلی کی ضرورت ہے۔ یہ اجتہاد کلی ان کے لئے گویا ایک برتر حل (superior solution) ثابت ہوگا۔ وہ اسی طرح ان کے مستقبل کے لئے فیصلہ کن بن جائے گا جس طرح دور اول میں حدیبیہ کا معاملہ اسلام کی تاریخ کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوا تھا۔

پچھلی صدیوں میں برصغیر ہند میں، نیز پوری مسلم دنیا میں، مسلم رہنماؤں نے بار بار بڑے بڑے اقدامات کئے ہیں۔ ان اقدامات میں غیر معمولی جانی و مالی قربانیاں دی گئی ہیں۔ مگر یہ تمام اقدامات مکمل طور پر بے نتیجہ رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ یہ تمام اقدامات جزئی اجتہاد کی بنیاد پر کئے گئے۔ جب کہ حالات کا تقاضا تھا کہ کلی اجتہاد والی بصیرت کے تحت فیصلہ کیا جائے۔

جزئی اجتہاد یا جزئی استنباط کی بنیاد کسی ایک حکم شرعی پر قائم ہوتی ہے جب کہ کلی اجتہاد یا کلی استنباط مجموعی شرعی مصلحت کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر حضرت سلمان فارسی جب مکہ سے ہجرت کر رہے تھے تو ان کے پاس کچھ دینار موجود تھے۔ قریش کے کچھ نوجوانوں نے ان کا راستہ روکا اور کہا کہ ہم ان دیناروں کے ساتھ تمہیں مدینہ جانے نہیں دیں گے۔ اس وقت اگر حضرت سلمان فارسی اس حدیث کو یاد کرتے کہ مَن قُتِلَ دونَ مالہ فھو شھید اور اپنے مال کو بچانے کے لئے قریش کے نوجوانوں سے لڑ جاتے تو یہ جزئی استنباط ہوتا۔ مگر انھوں نے وسیع تر اسلامی مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے تمام دینار قریش کے نوجوانوں کے حوالے کر دئے۔ انھوں نے مال کو بچانے کی فکر نہیں کی، بلکہ اپنی جان کو بچا کر مکہ سے مدینہ چلے گئے۔ ان کی یہ روش کلی استنباط کی ایک مثال تھی۔

موجودہ زمانہ میں مسلم دنیا میں جو بڑے بڑے اقدامات کئے گئے، وہ سب کسی نہ کسی آیت یا حدیث کا حوالہ دے کر کئے گئے۔ مگر یہ سب جزئی استنباطات تھے، جب کہ اس زمانہ میں مجموعی اسلامی مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے کلی استنباط کی ضرورت تھی۔ اس کوتاہی کی بنا پر اس دور کا استنباط یا اجتہاد اجتہادی خطا کی مثال بن گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر نے مختلف طاقتوں سے ٹکراؤ کیا تو اس کے سامنے اسلام کا صرف یہ حکم تھا کہ اسلام دشمن طاقتوں کو زیر کرو۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ دہلوی نے مرہٹوں کے خلاف جہاد کی اسکیم بنائی۔ سید احمد شہید بریلوی نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ علماء دیوبند نے انگریزوں سے جہاد بالسیف کیا۔ اس طرح کے تمام واقعات اسلام کے حکم —— دشمنوں سے مقابلہ کرو —— سے مستنبط کئے گئے تھے۔

اسی طرح اقبال کا علیحدہ مسلم اسٹیٹ کا نظریہ اور تقسیم کے بعد اٹھنے والی مسلم پرسنل لا تحریک، بابری مسجد تحریک اس قسم کی تمام تحریکیں تحفظ شریعت کے حکم سے اخذ کی گئی تھیں۔ مگر اس زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کے لئے اس کلی اجتہاد کی ضرورت تھی جو مجموعی مصالح شرعی کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔ مگر تمام مسلم مصلحین صرف جزئی استنباط کی حد تک پہنچ سکے۔ شریعت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر کلی استنباط یا کلی اجتہاد کا ثبوت نہ دے سکے۔ اس ...

وہ کلی استنباط مطابق حال تھا اور نہ وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے کا ذریعہ بن سکا۔

بعض حالات میں جزئی اجتہاد بھی کافی ہو جاتا ہے، جیسا کہ بنو قریظہ کے واقعہ میں نظر آتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جب کہ ایسے کلی اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے جس میں مصالح کلی کی رعایت پائی جاتی ہو۔ موجودہ زمانہ میں اسی قسم کے کلی اجتہاد کی ضرورت تھی۔ مگر موجودہ زمانہ کے علماء اسلام اس قسم کے کلی اجتہاد تک نہ پہنچ سکے، اس لئے وہ ملت کے لئے ایسا اقدام بھی تجویز نہ کر سکے جس میں مصالح کلی کی رعایت پائی جاتی ہو۔

کلی استنباط کے لئے وہ مجتہدانہ بصیرت درکار ہوتی ہے جس کی توجہ جزئیات دین سے زیادہ اساسات دین پر ہو۔ جو احکام شریعت کے ساتھ تاریخ کی طاقتوں کو بھی جانتا ہو۔ جو الفاظ شریعت کے ساتھ اسرار شریعت کی گہرائیوں تک بھی پہنچ چکا ہو۔ جس کے ایمان نے اس کو وہ فراست ربانی عطا کی ہو جب کہ آدمی خدا کی روشنی سے دیکھنے لگتا ہے۔ جو علوم الٰہی کا عارف ہونے کے ساتھ بصیراً بزمانہ کے درجہ پر بھی فائز ہو۔

یہ وہ عالم شریعت ہے جس کی نگاہ وقتی مسائل سے گزر کر دور تر مسائل تک پہنچ گئی ہو۔ جو قریبی حالات سے زیادہ مستقبل کے حالات پر نظر رکھے۔ جو کسی اقدام کے مابعد نتائج کو بھی سمجھنے کی استعداد رکھتا ہو۔ جو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ جو مسائل و مشکلات کے درمیان مواقع اور امکانات کو دریافت کر سکے۔ جو خواہشات انسانی کے دائرہ سے نکل کر فیصلۂ خداوندی کے اشاروں کو پڑھنے والا بن گیا ہو۔ جو اس راز کو جانے کہ کبھی بولنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی نہ بولنا۔ کبھی کرنا ضروری ہوتا ہے اور کبھی نہ کرنا۔ جو ظاہری ہنگاموں کے درمیان چھپے ہوئے عوامل کو جانے، جو پسپائی کے واقعہ کو بھی اقدام کے روپ میں دیکھ سکے۔

دعوہ ایمپائر

اورنگ زیب عالمگیر (۱۷۰۷ - ۱۶۱۸) نے برصغیر ہند میں اسلام کا پولٹیکل ایمپائر بنانا چاہا۔ مگر طویل ترین زمانہ تک ہر قسم کی کوشش اور قربانی کے باوجود وہ یہاں مطلوب پولیٹکل ایمپائر بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد سے آج تک تقریباً تین سو سال سے تمام رہنماؤں کا سب سے زیادہ پسندیدہ خواب رہا ہے کہ کوئی اس مقصد کے لئے جہاد بالسیف

سراسر بے نتیجہ نہیں رہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمانوں کی
شناخت باقی رکھنا مشکل ہوتا۔

تک گیا اور کسی کے حالات نے اس کو جہاد بالقلم اور جہاد باللسان تک محدود کیا۔ تاہم پچھلے سو سالہ کوششیں بے حساب جانی اور مالی قربانیوں کے باوجود سراسر بے نتیجہ رہیں۔

اس کا سبب یہی تھا کہ ان تمام رہنماؤں کا ذہن جزئی دائرہ میں کام کرتا رہا۔ وہ جزئیات سے اٹھ کر کلیات کو اپنی گرفت میں نہ لا سکے۔

اس اجتہادی خطا کا اصل راز یہ ہے کہ مغربی قوموں کی طرف سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو چیلنج پیش آیا، اس میں عسر کے ساتھ یسر کا پہلو وافر مقدار میں موجود تھا۔ مگر ہمارے تمام رہنما عسر کے پہلو میں اتنا الجھے کہ وہ یسر کے پہلوؤں کو نہ دیکھ سکے۔

مغربی تہذیب کے ظہور کا ایک ابتدائی نتیجہ یہ تھا کہ اس نے ان قوموں کو سیاسی غلبہ عطا کر دیا۔ مگر اس تہذیب نے انسانی معاملات میں جو انقلاب برپا کیا تھا اس نے تاریخ میں پہلی بار یہ عظیم امکان کھول دیا تھا کہ پولٹیکل ایمپائر سے بھی زیادہ بڑی ایک چیز قائم کی جا سکے، اور وہ وہی چیز ہے جس کو ہم نے دعوہ ایمپائر کہا ہے۔

پولٹیکل ایمپائر میں طاقت کا انحصار تمام تر سیاسی قوت پر ہوتا ہے۔ جب کہ دعوہ ایمپائر میں طاقت کا انحصار تمام تر فکری اور نظریاتی قوت پر ہوتا ہے۔ سیاسی یا فوجی قوت کسی ایک قوم کی اجارہ داری نہیں۔ اس معاملہ میں تلک الایام نداولہا بین الناس کی سنت الٰہی کارفرما ہوتی ہے اور وہ کسی بھی قوم کے حصہ میں آسکتی ہے۔ مگر فکری اور نظریاتی قوت کے معاملہ میں اہل اسلام کو تنہا اجارہ داری حاصل ہے۔ کیوں کہ اسلام واحد مذہب ہے جو تاریخی طور پر معتبر مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسرے تمام مذاہب تبدیلیوں کے نتیجہ میں تاریخی اعتباریت کھو چکے ہیں۔ اس طرح دعوہ ایمپائر بنانے کی صلاحیت حقیقی معنوں میں اسلام کے سوا کسی اور کو حاصل نہیں۔

قدیم زمانہ کے حالات میں صرف پولٹیکل ایمپائر ہی اصل اہمیت رکھتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے عالمی سطح پر اپنا ایک پولٹیکل ایمپائر بنا لیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں سیاست اور حکومت کی حیثیت ثانوی ہو گئی۔ اب دوسری غیر سیاسی چیزوں نے اولین اہمیت اختیار کر لی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مصلحین اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان پر اپنا سر

یہ غلطی بے بنیاد ہے۔

ممکن ہوا ہے جب کہ ٹھیک اسی وقت ان کے لئے دوسرے مواقع کو استعمال کرکے دوبارہ زیادہ طاقت ور انداز میں دعوہ ایمپائر بنانے کا امکان پوری طرح کھلا ہوا تھا۔

قدیم زمانہ میں اقتصادیات کا انحصار تمام تر زمین پر ہوتا اور زمین بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی۔ اس لئے بادشاہ کے سوا کوئی اور شخص اقتصادی قوت کا مالک نہیں بن سکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں انڈسٹری کی ترقی نے زمین کو ثانوی حیثیت دیدی ہے اور صنعت و تجارت کو اقتصادی معاملہ میں اولین اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، انڈسٹری پوری طرح ایک آزاد شعبہ ہے۔ کوئی بھی شخص یا کوئی بھی گروہ انڈسٹری کے مواقع کو استعمال کرکے اعلیٰ ترین اقتصادی ذرائع کا مالک بن سکتا ہے۔

قدیم زمانہ میں الناس علیٰ دین ملوکہم کا اصول تھا کیوں کہ بادشاہ کے سوا کسی کے پاس یہ طاقت نہ تھی کہ وہ لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کر سکے۔ موجودہ زمانہ میں کمیونیکیشن کے جدید ذرائع نے اس صورتحال کو یکسر بدل دیا ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ جدید ذرائع مواصلات کو استعمال کرکے شاہی محل کے لوگوں کو بھی اپنا مخاطب بنا سکے۔ وہ دنیا بھر کے تمام کچے اور پکے مکانات میں بلا روک ٹوک داخل ہو جائے۔

قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ سرکاری مذہب کے سوا کسی اور مذہب کی آزادانہ تبلیغ کی اجازت نہ تھی۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اب یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اہل حق اپنے پیغام کو لے کر اٹھیں اور کسی بھی پابندی کے بغیر اس کو ایک ایک شخص تک پہنچا دیں۔ اور مذہبی معاملات پر آزادانہ بحث و مباحثہ کے ذریعہ دین حق کی صداقت کو ثابت اور مبرہن کر سکیں۔

اس طرح کی بہت سی دور رس تبدیلیاں موجودہ زمانہ میں ہوئی ہیں۔ انھوں نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ اہل اسلام ہر ملک میں اعلیٰ درجے کے مدرسے اور اسلامی مرکز بنائیں۔ وہ مسجدوں اور دینی اداروں کا نظام ہر جگہ قائم کریں۔ وہ دعوتی سرگرمیوں کو مؤثر ترین انداز میں جاری کر سکیں۔ وہ ہر قسم کے معاون اداروں کے ذریعہ اسلام کو ایک طاقت ور تحریک کی حیثیت دے دیں۔ وہ جدید ترین وسائل کو استعمال کرکے ہر ملک میں اپنا دعوہ ایمپائر کھڑا کر سکیں۔

اسلام کا اصل مقصد دل کی دنیا کو بدلنا ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کو بدلنا۔ اسلام کا اصل مقصد ابلاغ ہے، اسلام کا اصل مقصد اقتدار نہیں۔ اسلام کا نشانہ نظریاتی غلبہ ہے نہ کہ سیاسی غلبہ۔ اسلام کا اصل مقصود جنت ہے، اسلام کا اصل مقصود حکومت نہیں۔

قدیم زمانہ میں سیاست کا ادارہ ہی واحد طاقت ور ادارہ تھا۔ اس لئے اسلام کے غیر سیاسی مقصود کو حاصل کرنے کے لئے بھی سیاست سے تعرض پیش آیا۔ مگر موجودہ زمانہ میں یہ صورت حال یکسر بدل گئی ہے۔ اب اگر کسی مقام پر اہلِ اسلام کو حکومتی ادارہ میں غلبہ حاصل نہیں ہے تو اس پر انھیں کچھ بھی ملال کرنے کی ضرورت نہیں۔ جدید ذرائع کو استعمال کرکے وہ حکومت کے باہر بھی وہ سب کچھ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کر سکتے ہیں جن کی توقع پہلے صرف حکومتی ادارہ سے کی جاتی تھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلم مصلحین کا یہ حال ہوا کہ وہ قدیم امکانات کو جانتے تھے، مگر جدید امکانات سے عملاً وہ بے خبر رہے۔ اسی لئے اس راز کو سمجھنا ان کے لئے ممکن نہیں ہوا کہ حکومت سے باہر وہ حکومت سے بھی زیادہ طاقت ور ادارہ بنا سکتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ افکار کی اشاعت عالمی سطح پر بے روک ٹوک اور انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ جاری کی جا سکے۔ ایسی اسلامی یونیورسٹی بنائی جائے جو تمام دنیا کے لئے علوم الٰہی کا سرچشمہ بن جائے۔ ایسا ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن قائم کیا جائے جہاں سے بیک وقت تمام اہل عالم کو خطاب کیا جا سکتا ہو۔ ایسا اقتصادی ہاؤس بنایا جائے کہ حکومتوں کے تعاون سے بے پروا ہو کر تمام اسلامی سرگرمیوں کو خود اپنی بنیاد پر جاری کیا جا سکے۔

اسی کے ساتھ موجودہ زمانہ میں پہلی بار یہ ممکن ہوا کہ اسلامی اخلاقیات کا عمومی مظاہرہ کیا جا سکے۔ جدید طرز کے اسپتال، جدید طرز کے رفاہی ادارے، معذور افراد کے لئے جدید معیار کی سہولتیں، اور اس قسم کے دوسرے بہت سے کام حکومت کے اشتراک و تعاون کے بغیر اعلیٰ ترین سطح پر کئے جا سکتے تھے، جیسا کہ بعض قومیں انجام دے رہی ہیں۔

اسی قسم کے مختلف کاموں کے مجموعہ کو ہم نے دعوہ ایمپائر کہا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مصلحین اگر کلی اجتہاد کی صلاحیت کے حامل ہوتے تو وہ ان امکانات و مواقع کو دیکھتے۔ اس کے بعد

[illegible] کہ سیاست کی قربان گاہ پر قوم کو لے جاکر اس کی ہلاکت کا سامان کریں۔ بلکہ وہ لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ جدید امکانات کو استعمال کرکے دعوہ ایمپائر بناؤ اور پھر اسلام کو سارے عالم کی فکری قیادت کے مقام پر پہنچا دو۔

یہ دعوہ ایمپائر اصلاً غیر سیاسی دائرہ میں بنے گا۔ مگر جب وہ بن جائے گا تو وہ بالواسطہ طور پر سیاسی ادارہ کو بھی متاثر کرے گا، حتی کہ عین ممکن ہے کہ وہ وقت آئے جب کہ خود سیاسی ادارہ بھی اس دعوہ ایمپائر کا ایک ماتحت حصہ بن جائے۔

خلاصۂ کلام

جزئی اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ بروقت جو صورت حال (الوضع الراھن) سامنے ہے اس کے سلسلہ میں حکم شرعی کو معلوم کرکے اس پر عمل کیا جائے۔ کلی اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ بروقت قائم شدہ صورت حال کے بارے میں وہ موقف اختیار کیا جائے جس میں شریعت کی اصل روح کے ساتھ عمومی مصلحت کی رعایت ہو، اور جو بالآخر موجودہ صورت حال کے وقتی حل سے آگے بڑھ کر اسلام کے وسیع تر مقصد تک پہنچانے والا ثابت ہو۔ گویا مصلحتِ وقتی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے عمل کا رخ متعین کرنے کا نام جزئی اجتہاد ہے اور مصلحتِ عمومی کو ملحوظ رکھ کر عمل کا رخ متعین کرنے کا نام کلی اجتہاد۔

In emergency use hammer to break window.

ڈبہ کے دونوں طرف بہت بڑے شیشے لگے ہوئے تھے جس سے باہر کا منظر بالکل صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ پورے راستہ میں دونوں طرف دور تک پھیلا ہوا سبزہ تھا اور اس کے درمیان کہیں کہیں خوبصورت مکانات۔ میری سیٹ کے قریب ایک علحدہ اور کسی قدر کشادہ سیٹ تھی۔ یہ معذوروں کی رعایت سے بنائی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے اوپر لکھا ہوا تھا:

Please give up this seat if a disabled person needs it.

اسٹیشن پہ اترے تو وہ بالکل جدید طرز کے ہوائی اڈہ کی مانند بنا ہوا تھا۔ اگر آپ کو کسی تعاون کی ضرورت ہو تو فوراً آپ کو ریلوے کے ذمہ دار اس کے لئے تیار ملیں گے۔

میں نے سوچا کہ ہمارا لکھنے والا طبقہ برطانیہ کی جو تصویر پیش کرتا ہے وہ حقیقی برطانیہ سے کتنا زیادہ مختلف ہے۔ یہ طبقہ یہ کرتا ہے کہ اخباروں وغیرہ سے کچھ منفی پہلو لیتا ہے اور اس میں مبالغہ کے ذریعہ کچھ اور اضافہ کرکے اس کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے برطانیہ کی نہایت مکروہ تصویر لوگوں کے سامنے آتی ہے۔ فارسی شاعر نے کہا تھا کہ "عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو" مگر ہمارے لکھنے اور بولنے والے لوگ یا تو صرف عیب بیان کرنا جانتے ہیں یا صرف ہنر۔ منصفانہ کلام کی جیسے ان کے اندر صلاحیت ہی نہیں۔

برمنگھم ریلوے اسٹیشن پر جناب شمشاد حسین خاں صاحب موجود تھے۔ وہ نہایت سلجھے ہوئے آدمی ہیں اور اپنے بزنس کے ساتھ یہاں دعوت کے کام میں مشغول ہیں۔ یہاں میرا قیام انھیں کی رہائش گاہ پر تھا۔ انھوں نے بتایا کہ چوں کہ مغرب کا وقت قریب تھا۔ اس لئے میں نے گھر سے چلتے ہوئے گاڑی میں مصلّیٰ رکھ لیا اور ریلوے اسٹیشن پر نماز پڑھی۔ انھوں نے کہا کہ اسٹیشن پر نماز پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہ اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ آج ہم کو پوری آزادی حاصل ہے۔ ہم جہاں چاہیں نماز پڑھ سکتے ہیں جب کہ قدیم مکہ میں یہی کام عیاناً نہیں کیا جا سکتا تھا۔ راستہ میں انھوں نے ایک گفتگو کے دوران ایک جملہ کہا جو مجھے بہت پسند آیا۔ انھوں نے کہا: بندے کی عظمت بندگی میں ہے۔

۲۴ ستمبر کو مغرب بعد کا وقت تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے نکل کر میں جناب شمشاد صاحب کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہماری گاڑی برمنگھم کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ دونوں طرف پر رونق دکانیں

اور وہ تاریخ بہ طلسمہ دشمنوں کے ساتھ جنگ کار ہے تھے۔ مگر اس ظاہری جگمگاہٹ کے پیچھے یہاں کی جو مشکل اقتصادی حالت ہے وہ اطمینان بخش نہیں۔ صنعتی دور انسان کے لئے بہت سی خوبیاں لایا ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس نے ایسے مسائل بھی پیدا کر دئے ہیں جو اس سے پہلے کبھی موجود نہ تھے۔ لندن کے بعد برمنگھم یہاں کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔

یہاں میں نے ایک صاحب سے کہا کہ برطانیہ اس وقت ریسشن کے مرحلہ سے گزر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اتنا ہی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں ریسشن (recession) آیا۔ پھر سلم (Slump) آیا۔ اور اب ہم ڈپریشن (depression) کے دور سے گزر رہے ہیں۔ ان تین دوروں کو سادہ طور پر اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ ـــــ زیادہ خریداری، پھر کم خریداری، اور پھر بے خریداری۔

برمنگھم میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان ہیں۔ وہ یہاں کی آبادی میں تقریباً ۱۰ فیصد ہیں۔ یہاں کی چھوٹی بڑی مسجدوں کی تعداد ۹۰ تک پہنچتی ہے۔ ایک بار برمنگھم میں سفر کرتے ہوئے ہم ایک ایسے علاقہ سے گزرے جو مسلم علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایک دکان کے سامنے ایک اشتہار لگا ہوا تھا ـــ "جہاد کشمیر کانفرنس"۔ میں نے سوچا کہ جہاد کانفرنس کی ہر طرف دھوم ہے مگر کوئی نہیں جو حل کانفرنس کرنے کا اہتمام کرے۔ موجودہ زمانہ میں دنیا امن کانفرنس کر رہی ہے اور مسلمان جنگ کانفرنس۔

میں جہاں ٹھہرا ہوں وہ نہایت پرفضا علاقہ ہے۔ کھلے کھلے مکانات قرینہ کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے چاروں طرف خوبصورت لان اور وسیع پارک کے مناظر ہیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ اس علاقہ کا نام کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک گاؤں ہے، اور اس کا نام ارلس وڈ (Earls wood) ہے۔ انڈیا میں گاؤں پچھڑی ہوئی بستی کا نام ہے۔ مغربی ملکوں میں گاؤں سے مراد وہ خوبصورت بستیاں ہیں جو شہروں کے باہر ہیں۔ جہاں شہری ہنگاموں کے سوا تمام جدید ترین سہولت پوری طرح موجود ہو۔

برطانیہ کے وقت میں اور انڈیا کے وقت میں ساڑھے چار گھنٹہ کا فرق ہے۔ یہاں میں نے عشا کی نماز پڑھی تو خیال آیا کہ عین اسی وقت، اگر میں انڈیا پہنچ جاؤں تو وہاں کی مسجدوں میں عصر کی نماز کی تیاری ہو رہی ہوگی۔ یعنی جس وقت یہاں رات ہے عین اسی وقت وہاں دن ہے۔ اس فرق پر

ہم نے غور کیا تو ذہن میں آیا کہ شاید یہی وہ چیز ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے کہ : رب المشارق والمغارب (المعارج ۴۰)

قدیم زمانہ کا انسان صرف مقامی دائرہ میں سوچتا تھا۔ اس کو اس بات کی کوئی خبر نہ تھی کہ جس وقت وہ اپنے افق پر سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے اس وقت دوسرے مقامات پر دوسری آفاقی حالت ہوگی۔ یا جس وقت وہ اپنے افق پر سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے اس وقت دوسرے مقامات پر اس کے علاوہ دوسرا آفاقی منظر ہوگا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن کی یہ آیت قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا ثبوت ہے۔ کیوں کہ چودہ سو سال پہلے جب کہ انسان تعدد مشارق اور تعدد مغارب کی حقیقت سے بے خبر تھا، یہ صرف کسی برتر ہستی ہی کے لئے ممکن تھا کہ وہ اس کائناتی حقیقت کو جانے اور اس کے بارہ میں نہایت صحیح بیان دے سکے۔

جناب شمشاد صاحب نے بتایا کہ برمنگھم سے کچھ فاصلہ پر نیوریٹن (Nureaton) میں تقریباً ۱۵ سال پہلے گجراتیوں نے ایک مسجد بنائی۔ سب سے پہلا کام مسجد کی تعمیر کی اجازت لینا تھا۔ مقامی انگریزوں نے سخت اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں مسجد تعمیر ہوئی تو یہ لوگ شور وغل کریں گے۔ گندگی پھیلائیں گے اس کے بعد ہمیں اپنے گھروں کو چھوڑ دینا پڑے گا۔ تاہم ان کے اختلاف کے باوجود شہری کونسل (کارپوریشن) نے اس کی اجازت دے دی۔ اب یہاں کے مسلمان چندہ جمع کرنے کے لئے نکلے۔ لندن میں ان کی ملاقات ایک سعودی شیخ سے ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ مسجد کی تعمیر کے لئے کتنے خرچ کا اندازہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک ملین پونڈ۔ شیخ نے تنہا اپنی جیب سے ایک ملین پونڈ دے دیا۔

اس کے بعد انھوں نے ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی۔ انگریزوں کے اندیشے کے برعکس مسجد اس علاقہ میں خوبصورت تعمیر اور سکون اور صفائی کے ماحول کی مثال بن گئی۔ مسلمانوں کا خیال تھا کہ انگریز اپنے کہنے کے مطابق، مسجد کی تعمیر کے بعد اس علاقہ سے جانا شروع کر دیں گے اور ہم ان کے مکانوں کو خرید کر یہاں مسجد کے پاس آباد ہو جائیں گے۔ مگر کئی سال گزر گئے اور کوئی انگریز وہاں سے نہیں گیا۔ اس کے بعد ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس مسجد کے بننے کے بعد تو ہم اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرنے لگے ہیں۔ مسجد کے لوگ نہایت ڈسپلن کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہاں اچھے لوگوں کی آمد ورفت بڑھ گئی ہے اور بدکاری کا خطرہ ختم ہو گیا ہے جس کا اندیشہ ہم کو پہلے لگا رہتا تھا

کہ ہم اس ماحول کو چھوڑ کر کہیں اور بھاگیں۔

ایک دوسرے کرسچین کو میں نے کہا کہ آج ہمارے مسلم دانشوروں کا حال یہ ہے کہ وہ کہانی کے حصۂ اول کو سن کر کہنے لگتے ہیں کہ مغربی لوگ اسلام دشمن ہیں۔ وہ اسلام کے فروغ کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ عین اسی وقت کہانی کا نصف ثانی ان کے لئے زبردست مثبت سبق کے طور پر موجود ہوتا ہے۔

کل ہی بس میں جناب عبدالحمید صوفی (بریڈفورڈ) سے ملاقات ہوئی۔ وہ قدیم کتابیں جمع کرنے کے شوقین ہیں۔ انھوں نے ایک کتاب دکھائی :

Thomas Carlyle, lectures on Heroes,
Chapman and Hall, London 1888

اس کتاب کا ایک لکچر ہیرو بہ پیغمبر (The Hero As Prophet) ہے۔ یہ لکچر لندن میں ۸ مئی ۱۸۴۰ کو دیا گیا تھا۔ اس میں پیغمبر اسلام کو تمام پیغمبروں کا "ہیرو" بتایا گیا ہے۔

عبدالحمید صوفی کے پاس اس کتاب کا ۱۸۸۸ کا نسخہ ہے۔ انھوں نے یہ کتاب مجھے دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ساری دنیا ان کے قدموں میں تھی، جب یہ لوگ انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتے تھے۔ اس وقت کارلائل نے رسول اللہؐ کو پیغمبروں کا ہیرو بتایا۔

میں نے کہا کہ "۱۸۴۰" میں اتنا بڑا واقعہ لندن میں ہوا۔ مگر اس وقت کے مسلم لیڈروں میں سے کوئی نہیں جو اس کو جانے اور اس سے مسلمانوں کو آگاہ کرے۔ ہمارے رہنما انگریز کے نام سے "ہرڈ ڈائر" سے واقف تھے، وہ انگریز کے نام سے "کارلائل" سے واقف نہ ہو سکے۔

برمنگھم کے ابجو اسکول کے ہال میں ۲۴ ستمبر کو ایک تقریر تھی۔ اس میں تعلیم یافتہ حضرات جمع ہوئے۔ تقریر کا موضوع تھا: اسلام اور عصر حاضر۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں موضوع کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا گیا۔ آخر میں سوال و جواب ہوا۔ اس کے علاوہ مختلف مواقع پر مجلسیں ہوئیں ان میں اسلام اور دوسرے ملی موضوعات پر اظہار خیال کیا۔ اس طرح ۲۴ ستمبر کا تقریباً پورا دن ملاقات اور بات چیت میں گزر گیا۔

ایک اجتماع میں قاری صاحب نے قرآن کی وہ آیتیں تلاوت کیں جن میں لا ترفعوا اصواتکم

فوق صوت النبی (الحجرات ۲) ہے۔ میں نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ قاری صاحب نے جو آیت پڑھی، اس میں موجودہ زمانہ کے سب سے بڑے مسلم مسئلہ کا جواب ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی حالت جو ہو گئی ہے، جو بھی ہے جیسے ان کے سامنے کوئی لائحہ عمل نہیں، حالاں کہ قرآن ایک کتاب کی حیثیت سے محفوظ طور پر ان کے پاس موجود ہے۔

میں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ ایک نیا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں قرآن کے از سر نو انطباق (reapplication) کی ضرورت تھی۔ مگر مسلمان جدید حالات پر قرآن کے انطباق میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مثلاً لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی کا مطلب اسباب نزول کی روایات کے مطابق یہ ہے کہ مدینہ میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے زور زور سے بولتے تھے۔ وہ رسول کی آواز پر اپنی آواز کو بلند کرتے تھے۔ قرآن میں اس سے منع کیا گیا اور اس پر حبط اعمال کا اندیشہ بتایا گیا۔ اب اس کا از سر نو انطباق یہ ہے کہ اس کو موجودہ زمانہ میں لوگوں کے اس مزاج پر منطبق کیا جائے کہ ان کے سامنے قرآن و حدیث پیش کیا جائے تو وہ اس کے جواب میں اپنی ذاتی ریزننگ پیش کرنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ یہ بھی رسول کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنا ہے اور دوبارہ اس میں حبط اعمال کا اندیشہ ہے۔

اگر ہم ایسا کر سکیں کہ قرآن کی تعلیمات کو از سر نو جدید حالات پر منطبق کریں تو فوراً ہی قرآن ہمارے لئے ایک رہنما کتاب بن جائے گا۔ اس میں ہم اپنے آج کے لئے رہنمائی پانے لگیں گے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لئے بس ایک مقدس کتاب بن کر رہ گیا ہے، اور ظاہری احترام کے سوا اس کا کوئی اور حق ہم کو معلوم نہیں۔

۲۵ ستمبر کو جمعہ کا دن تھا۔ جمعہ کی نماز ہم نے برمنگھم کی جامع مسجد میں پڑھی۔ یہاں لوگوں کی فرمائش پر نماز سے پہلے آدھ گھنٹہ کی تقریر کی۔ تقریر کا موضوع "اسلامی عبادت" تھا۔ میں نے کہا کہ حدیث میں کہا گیا ہے کہ المساجد بیوت المتقین۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسجدیں تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہیں۔ اس سلسلہ میں نماز کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ نماز کس طرح آدمی کو متقیانہ زندگی کے لئے تیار کرتی ہے۔

نماز سے پہلے ماہنامہ صراط مستقیم کے مدیر محترم نے ایک انٹرویو لیا۔ سوالات زیادہ تر ہندستان

اور عام اسلام کے مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں الرسالہ کے نقطۂ نظر کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

ایک سوال یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ کو ہر ایک سے اختلاف ہے اور آپ دوسری جماعتوں سے کٹ کر اپنا ایک نیا دین پیش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ میں نے کہا کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اساسیات میں اختلاف، اور دوسرا فروع میں اختلاف۔ میرا اساسیات میں کسی سے کوئی اختلاف نہیں۔ مثلاً تمام لوگ رسول اللہؐ کو خاتم الرسل مانتے ہیں تو میں بھی رسول اللہؐ کو خاتم الرسل مانتا ہوں۔ میرا جو کچھ اختلاف ہے وہ فروعات میں ہے اور فروعات میں اختلاف صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء کے درمیان ہمیشہ رہا ہے۔ یہاں اصل مسئلہ اختلاف کا نہیں بلکہ غیر ضروری حساسیت کا ہے۔ لوگ غیر ضروری طور پر اختلاف کے معاملہ میں حساس ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر وہ فروع میں اختلاف کو وہ درجہ دینے لگتے ہیں جو اساسیات میں اختلاف کا درجہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی یہی غیر ضروری حساسیت ہے جس نے مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ نفس اختلاف نے۔

نماز کے بعد تعلیم یافتہ حضرات کا ایک حلقہ جمع ہو گیا اور دیر تک ان سے ملی اور اسلامی موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس میں کچھ کشمیری حضرات تھے۔ ایک کشمیری صاحب نے پوچھا کہ الرسالہ اگست ۱۹۹۲) میں کشمیر کے تعلق سے ایک پیغام شائع ہوا تھا۔ اس کا کیا ریسپانس آپ کو ملا۔ میں نے کہا کہ اس کی اشاعت کے بعد کشمیر کے جنگجو نوجوان گن لے لے کر الرسالہ کے تمام ڈسٹری بیوٹرس کے یہاں پہنچے اور کہا کہ یا تو الرسالہ کا ڈسٹری بیوشن بند کر دو یا ہماری گولی کھانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

مجھ کو جب اس کی اطلاع ملی تو مجھے غم کے بجائے تعجب ہوا۔ میں نے کہا کہ جو تحریک اتنی کمزور ہو کہ ایک ماہنامہ اس کے لئے خطرہ بن جائے وہ میرے نزدیک تحریک ہی نہیں۔ وہ بچوں کا کھیل ہے نہ کہ کوئی حقیقی تحریک۔ جنگجو حضرات کا یہ جنگجویانہ اقدام خود اپنے خلاف تھا نہ کہ ہمارے۔ یہ گفتگو ۲۴ ستمبر کو نماز جمعہ کے بعد برمنگھم کی جامع مسجد میں ہوئی۔

برمنگھم میں ایک نہایت خوبصورت مرکز ہے جس کا نام اسلامک پروپیگیشن سنٹر (IPC) ... بہت خوشی ہوئی۔ یہ مرکز کی عمارت بذات خود نظم اور باقاعدگی اور منصوبہ بندی

کا ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ یہاں گویا اسلامی دعوت کا کام منظم انداز میں کر رہا ہے۔ وہ گھر گھر (door to door) اسکیم کے تحت اسلام کا پیغام ہر ایک تک پہنچانا چاہتا ہے۔

۲۴ ستمبر کی دوپہر کو برمنگھم سے لندن کے لئے روانگی ہوئی۔ یہ سفر دوبارہ ٹرین کے ذریعہ ہوا۔ دو گھنٹے کے بعد ٹرین ٹھیک وقت پر لندن اوسٹن کے پلیٹ فارم پر آکر کھڑی ہوئی۔ ٹرین کے تمام دروازے اپنے آپ کھل گئے اور مسافر ایک کے بعد ایک باہر جانے لگے۔

آپ اس ٹرین (انٹرسٹی) کے ذریعہ لندن اسٹیشن پر پہنچیں اور آپ کو دوسرے مقام پر جانا ہے تو اسٹیشن سے ملحق انڈر گراؤنڈ ٹرین (ٹیوب) موجود ہوگی۔ آپ ایک بورڈ کے اندر پونڈ ڈالئے اور اپنے مقام کے نمبر کا بٹن دبا دیجئے۔ اس کے بعد آپ کا مطلوبہ ٹکٹ بھی نکل آئے گا اور فاضل رقم بھی۔ آپ آگے بڑھیں گے اور متحرک سیڑھیاں آپ کو نیچے پہنچا دیں گی۔ وہاں لکھا ہوا ہوگا کہ آپ کی مطلوبہ ٹرین منٹ میں آ رہی ہے۔ اگر ایک ٹرین چھوٹ جائے تو دو منٹ کے بعد دوسری ٹرین آپ کے سامنے کھڑی ہوگی۔

انڈر گراؤنڈ ٹرین پورے شہر کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس لئے برٹش ٹرین بنائی گئی ہے۔ وہ بھی اگر آپ کے لئے کافی نہ ہو تو اس سے اتر کر آپ فوراً اپنے مقام کے لئے بس پکڑ سکتے ہیں۔ اس پورے سفر کے دوران آپ کو بار بار ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ ایک بار دن بھر کا ٹکٹ حاصل کر لیجیے۔ اس کے بعد اسی ٹکٹ سے سارے دن ٹیوب، برٹش ریل، بس تینوں سے سفر کر سکتے ہیں۔

اس طرح کی مختلف چیزیں بتاتی ہیں کہ یہاں کا نظام پیشگی طور پر انسان کی ضرورتوں کا اندازہ کرتا ہے اور قبل اس کے کہ آپ اس سے کہیں، وہ آپ کی ہر ضرورت کا انتظام کرتا چلا جاتا ہے۔ میں نے سوچا کہ حدیث میں ہے کہ جنت میں تم صرف خواہش کروگے اور تمہاری مطلوبہ چیز فوراً تمہارے سامنے آجائے گی۔ مذکورہ نظام گویا جنت کی اس صفت کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔

مسز اسرہ خان (لندن) کئی سال سے الرسالہ پڑھ رہی ہیں اور اس کے مشن سے کافی متاثر ہیں۔ انھوں نے ٹیلیفون پر باصرار دعوت دی کہ ان کے یہاں ایک پروگرام رکھا جائے۔ اس کے مطابق ۲۶ ستمبر کی شام کو ان کے یہاں پہنچا۔ اجتماع کا انتظام انھوں نے ڈاکٹر ملیحہ سالم کے مکان (چیزل

عورت ایک ساتھ تھا۔ یہاں تعلیم یافتہ مرد اور عورت جمع تھے۔ اس موقع پر میری دو تقریریں ہوئیں۔ پہلی تقریر اقوال رسول کی روشنی میں۔ اور دوسری تقریر رسول اور اصحاب رسول کے واقعات کی روشنی میں۔ پہلی تقریر عشاء کی نماز سے پہلے ہوئی اور دوسری تقریر عشاء کی نماز کے بعد۔

مسٹر اسرو خان نے الرسالہ کے بارہ میں اپنا تاثر بتاتے ہوئے کہا کہ الرسالہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر مضمون آدمی کے اندر اسلامی فیلنگ کو جگاتا ہے۔ جب ہم اس کا کوئی صفحہ پڑھتے ہیں تو عین اسی وقت ہمارا تعلق خدا اور رسول سے جڑ جاتا ہے۔ الرسالہ وقت کے اسلوب میں اسلامی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان کے شوہر اردو نہیں جانتے۔ وہ صرف انگریزی سمجھ سکتے ہیں۔ وہ اپنے شوہر کو الرسالہ کی باتیں انگریزی زبان میں بتاتی ہیں۔

۲۶ ستمبر ۱۹۹۲ کو جب میں لندن میں تھا۔ مسٹر فاروق جنگ کے یہاں ٹیلیفون آیا۔ آجکل وہ اپنی فیملی کے ساتھ بون میں مقیم ہیں۔ انھوں نے جرمنی آنے کی دعوت دی۔ مگر لندن سے بون جانا میرے لئے مشکل تھا۔ اس لئے میں ان کی دعوت کو قبول نہ کرسکا۔

انھوں نے کہا کہ ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ بروسیلز تک پہنچ چکے ہیں۔ ورنہ ہم بروسیلز آکر آپ کو کار سے بون لے جاتے۔ کیوں کہ بروسیلز سے بون تک بذریعہ کار صرف دو گھنٹہ کا سفر ہے۔ اتفاق سے مجھے اس کا اندازہ نہ تھا۔ ورنہ میں پہلے سے اس کا پروگرام بناتا اور بروسیلز سے بون ضرور جاتا۔

بون (Bonn) جرمنی کی انتہائی قدیم بستی ہے۔ جس کی تاریخ پہلی صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ تاہم ماضی میں اسے زیادہ ترقی نہ مل سکی۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد اس کی ترقی شروع ہوئی اب یہ جرمنی کا سب سے زیادہ خوبصورت شہر سمجھا جاتا ہے۔

بون کی خوبصورتی کا زیادہ بڑا سبب یہ ہے کہ دریائے رینے (Rhine) کے کنارے اس شہر کو ارباب دولت نے اپنی رہائش کے لئے پسند کیا۔ دو سو سے زیادہ دولت مند (...) یہاں آکر آباد ہوگئے۔ تعلیم یافتہ اور خوشحال طبقہ جہاں آباد ہو وہ خوبصورت بستی بن جاتی ہے اور غریب طبقہ جہاں آباد ہو وہ بدہیئت بستی۔

بون سے بہت سی تاریخیں وابستہ ہیں۔ مثلاً مسیحیت کے دو مذہبی ادارے اینگلیکن چرچ

اور اولڈ چرچ کے درمیان زبردست اختلافات تھے جو تقریباً سو سال تک شدت کے ساتھ جاری رہے۔ آخر کار دونوں کے درمیان گفت و شنید سے ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کا اعلان بون میں کیا گیا۔ اس لئے اس کو بون اعلان (Declaration of Bonn) کہا جاتا ہے۔ یہ اعلان ۱۹۳۱ میں کیا گیا۔ اس کے تحت دونوں نے ایک دوسرے کی آزاد حیثیت کو تسلیم کر لیا۔

جب اختلافات نظری اور اعتقادی سطح پر ختم نہ ہو رہے ہوں تو بہترین دانش مندی یہ ہے کہ نظری سطح پر اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے عملی سطح پر اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔

جرمنی میں ٹرانزٹ پسنجر کی حیثیت سے کئی بار جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر کچھ دن قیام کرکے جرمنی کو باقاعدہ طور پر دیکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس دوران مطالعہ کے ذریعہ جو باتیں علم میں آئیں ان میں سے ایک قصہ یہ تھا۔

چند دن پہلے ۱۲ ستمبر ۱۹۹۲ کو ایک واقعہ فرینکفرٹ ایرپورٹ پر ہوا۔ اس واقعہ کو میں نے اخبار میں پڑھا۔ ایک ہندستانی خاتون مسز مان سنگھ نے ایک جرمن مسٹر سونال (Mr Sonal) سے شادی کی ہے۔ وہ میونخ سے فرینکفرٹ پہنچیں۔ یہاں سے ان کو دہلی کی فلائٹ لینا تھا۔ ایئرپورٹ پر انتظار کے دوران وہ ایک بک شاپ (Julius Valtermahm) میں داخل ہوئیں۔ یہاں وہ ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگیں۔ "سیلس وومن" جس کا نام ارسلا (Ursula) تھا، اس نے دیوار پر لگے ہوئے ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر لکھا تھا: پہلے خریدو، پھر پڑھو (Buy now, Read later)

بک شاپ میں کئی سفید فام عورتیں میگزین اٹھا اٹھا کر باقاعدہ طور پر پڑھ رہی تھیں۔ مسز مان سنگھ نے کہا کہ یہ عورتیں بھی تو پڑھ رہی ہیں۔ آپ ان کو کیوں نہیں منع کرتیں۔ اس پر دکان کی خاتون بگڑ گئیں۔ اس نے کہا کہ یہاں سے نکل جا، کالی عورت۔ یہ میری دکان ہے۔ میں جو چاہوں گی کروں گی:

Get out, you Black-head. This is my shop.
I will do what I like.

مسز مان سنگھ اس کے بعد ایرپورٹ کے مختلف دفتروں میں گئیں تاکہ اپنی شکایت درج کرائیں۔ مگر

ایئرپورٹ کے کسی افسر نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ نہ ان کی شکایت درج کی گئی اور نہ اس کا دفعیہ کیا گیا۔ ہر ایک نے مسز مان سنگھ کو بیرونی راستہ دکھایا۔ یہ اس کے باوجود ہوا کہ مسز مان سنگھ جرمن زبان جانتی تھیں اور اپنی شکایت کو بخوبی طور پر جرمن میں بتا سکتی تھیں۔

یہ رپورٹ خود مسز مان سنگھ نے چھاپا ہے۔ انھوں نے اس کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے کہ آخر کار میں ایئرپورٹ سے نکل کر ہوائی جہاز میں داخل ہوئی۔ میں کھڑکی کی طرف اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی آنسوؤں کے ساتھ جرمنی کو الوداع کہا جس سے مجھے محبت تھی مگر اب مجھے اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے دوبارہ بدھا اور گاندھی کی سرزمین کی طرف اپنا سفر شروع کر دیا:

I sat in my window seat, bade a teary goodby to the Germany I had loved but now feared and started my journey back towards the land of Buddha and Gandhi.

مسز مان سنگھ کا یہ تقابل درست نہیں۔ کیوں کہ جرمنی میں جو نسلی امتیاز رنگ کی بنا پر ہے وہی نسلی امتیاز انڈیا میں ذات کی بنا پر موجود ہے۔ اگر انڈیا میں بدھا اور گاندھی پیدا ہوئے تو اسی طرح جرمنی میں گوئٹے (Goethe) اور رلکے (Rilke) جیسے افراد پیدا ہوئے۔ دونوں جگہ دونوں قسم کے واقعات یکساں طور پر موجود ہیں۔

مسز مان سنگھ کی غلطی یہ ہے کہ وہ جرمنی کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے "ارسلا" کی مثال لے رہی ہیں اور انڈیا کے بارہ میں رائے قائم کرنے کے لئے "گاندھی" کی مثال۔ یہ جنرلائزیشن درست نہیں۔ بیشتر غلط رائیں اسی قسم کے غلط جنرلائزیشن سے بنتی ہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنے پسندیدہ ملک سے ایک اچھی مثال لے کر اس کو عمومی بنا دیتے ہیں۔ اور جو ملک انھیں ناپسند ہو اس کی ایک بری مثال لے کر اس کو عموم کا درجہ دیدیتے ہیں۔ ایسے لوگ اِس ملک کے بارہ میں بھی اندھیرے میں رہتے ہیں اور اُس ملک کے بارہ میں بھی۔

میں نے کچھ مسلمانوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اپنے وطن کو چھوڑ کر مغربی ملکوں میں رہنا کیوں پسند کیا۔ ہر ایک کا جواب تھا کہ یہاں کے سسٹم کی خوبی انھیں یہاں رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ بعض اخلاقی برائیوں سے قطع نظر، ان ملکوں کا سسٹم بڑی حد تک معیاری ہے۔

"نظامی" ذہن کے ایک مسلمان سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ لوگ اسلام کو بہتر دنیوی نظام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ اس میں آج کے انسان کے لیے زیادہ کشش نہیں کیونکہ اس قسم کا نظام تو آج بھی اس کو حاصل ہے۔ میں نے کہا کہ اسلامی قانون کے نفاذ کا تعلق اصلاً دنیوی آسودگی سے نہیں ہے بلکہ اخلاقی تحفظ سے ہے۔ دنیوی آسودگی زیادہ تر انتظام اعلم یاسو دنیا کے سے تعلق رکھتی ہے۔

ٹوکن میں ایک تعلیم یافتہ انگریز سے ملاقات ہوئی۔ وہ لندن کے مضافات میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں کیرولین مورہیڈ (Caroline Moorehead) کی کتاب برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell) تھی جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب برٹرینڈ رسل کا ایک تنقیدی مطالعہ ہے۔ مثلاً اس میں رسل کو غیر منطقی (Illogical) بتایا گیا ہے۔

مجھے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ ابتدائی تقریب کے بعد میں نے کہا کہ برٹرینڈ رسل کے بارہ میں مورہیڈ کی اس کتاب کو میں دیکھ چکا ہوں۔ گفتگو کے دوران اندازہ ہوا کہ وہ برٹرینڈ رسل کے خیالات سے متاثر ہیں۔ خاص طور پر خدا کے وجود کے بارہ میں ان کے خیالات تقریباً وہی ہیں جو برٹرینڈ رسل کے خیالات تھے۔

انگریز اس طرح کسی اجنبی سے بات کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن ایک مسافر کے لئے عام انگریز سے بات کرنے کا کوئی اور موقع پانا بھی مشکل ہے۔ اس لئے میں اپنے ایشیائی ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس قسم کی مداخلت کر لیتا ہوں۔

میں نے کہا کہ میں نے برٹرینڈ رسل کو کافی پڑھا ہے۔ رسل نے لکھا ہے کہ میں خدا کے وجود کو نہیں مانتا۔ اس کی دلیل رسل نے یہ دی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا تو فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا۔ مگر رسل کا یہ اعتراض سراسر غیر منطقی ہے۔

میں نے کہا کہ رسل بلاشبہہ ذہین تھا۔ مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس معاملہ میں اس کے لئے انتخاب باخدا کائنات اور بے خدا کائنات میں نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی انتخاب باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات کے درمیان ہے۔ چوں کہ ہم مجبور ہیں کہ کائنات کے وجود کو مانیں، اس لئے ہم اس پر بھی مجبور ہیں کہ خدا کے وجود کو تسلیم کریں۔

It is true that Bertrand Russell was a great mind. But he failed to realize that in this case, the option was not between the universe with God and the universe without God. Rather the real option was between the universe with God or no universe at all. As we are bound to acknowledge the existence of the universe, so are we bound to acknolwedge the existence of its Creator — God.

فلاسفۂ انگریز نے ابتداءً بالواسطہ انداز میں برٹرینڈ رسل کے الحادی نقطۂ نظر کی حمایت کی تھی۔ مگر میری اس بات کو سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا کہ آپ کی بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے، میں اس پر غور کروں گا۔

لندن میں میرا قیام پروفیسر انیس تاری کی رہائش گاہ پر تھا۔ یہاں ۲۶ ستمبر کو جناب جاوید حسن صاحب (Tel. 5581523) سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ میں ایک یہودی فرم میں کام کرتا ہوں۔ وہاں ایک کٹر قسم کا یہودی تھا۔ میں جب اس کے پاس سے گزرتا تو ہمیشہ اس کو گڈ مارننگ کہتا مگر وہ مجھ کو جواب نہ دیتا، بلکہ منھ پھیر لیتا۔ آخر کار ایک روز اس نے کہہ دیا کہ تم کیوں مجھ کو گڈ مارننگ کہتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں:

Why you say good morning to me.
You know, I hate you.

اس کے جواب میں جاوید صاحب نے کہا کہ آپ کا شکریہ۔ مگر میں تو آپ سے نفرت نہیں کرتا۔ (But I do not hate you) یہ جواب سن کر یہودی تعجب میں پڑ گیا۔ اس نے کہا میں تو سمجھتا تھا کہ سارے مسلمان یہودیوں سے نفرت کرتے ہیں اور تم بھی نفرت کرتے ہوگے، کیوں کہ میں ایک یہودی ہوں۔ اس دن کی گفتگو کے بعد وہ کافی نرم پڑ گیا۔ یہاں تک کہ چند دن کے بعد وہ نارمل ہو گیا۔ اس کا حال یہ ہو گیا کہ جاوید صاحب کو دیکھتا تو دور ہی سے ہیلو، ہیلو کرنے لگتا۔ لوگوں کو تعجب تھا کہ اتنا کٹر یہودی ایک مسلمان سے اتنا قریب کیسے ہو گیا۔ اس کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ: یک طرفہ حسن اخلاق سے۔

لندن میں ایک اسلامیہ اسکولس ٹرسٹ (Tel. 01-6076655) ہے۔ اس کی طرف سے اسلامک ٹیچنگ کورس کا ایک سٹ خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ یہاں اس کی

بکل ملائیں نے … اس میں مذہب کی بحث کے تحت لکھا گیا ہے :

The whole notion of 'religion' as understood by Muslims is not restricted to rituals and religious observances, but it is an all encompassing concept which includes the social, economic and political: thus it is a way of life.

برمنگھم کے ایک مسلمان سے یہاں کے مسلمانوں کے بارہ میں گفت گو ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ
یہاں کی مسلم کمیونٹی اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ بدنام کمیونٹی ہے۔ عام طور پر یہاں اس کی اچھی امیج
نہیں۔ ان کو میں نے کتاب کا مذکورہ مضمون دکھایا۔ میں نے کہا کہ مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارا مذہب صرف
کچھ عبادات اور مذہبی رسوم کا مذہب نہیں ہے بلکہ وہ مکمل ضابطہ حیات ہے جس میں زندگی کے تمام
شعبے شامل ہیں۔ مگر زندگی کے معاملات میں مسلمان ہی سب سے زیادہ ناقص ہیں اور جن لوگوں کو یہ
محدود مذہبی تصور کا الزام دیتے ہیں وہ زندگی کے معاملات میں آپ سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

پھر میں نے کہا کہ اسلام کی مذکورہ تعریف جو آجکل بہت زیادہ رائج ہے وہ بذات خود درست
نہیں۔ یہ تمام تر ردعمل کا نتیجہ ہے۔ موجودہ زمانہ میں سیاسی معاملات میں چرچ کے دخل کو ختم کرنے کے
کچھ لوگوں نے کہا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے۔ اس کے ردعمل میں مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ
کہنے لگا کہ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ حالاں کہ صحیح بات یہاں تیسری تھی۔ یعنی یہ کہ مذہب معرفت
خداوندی کا نام ہے اور انسان کو جب خالق و مالک اور محاسب و مجازی خدا کی معرفت ہو جائے تو اس
کے اندر ایک ذہنی انقلاب برپا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری معاملات میں اللہ کی پسند و ناپسند
کا لحاظ کرنے لگتا ہے۔

جن لوگوں نے کہا کہ مذہب ایک ذاتی معاملہ ہے، ان کی تعریف کم از کم محدود حد تک انسا
شخصیت کو چھوتی تھی۔ مگر جدید مسلم مفکرین کی تعریف میں انسانی شخصیت سرے سے گرفت سے باہر چلی گئی
اس نظریہ کو ماننے والوں کا سارا دھیان حکومتی ادارہ کی طرف چلا گیا۔ کیوں کہ ان کی تعریف کے مطابق
صرف حکومتی ادارہ تھا جس کو قبضہ میں لے کر زندگی کے تمام شعبوں کی تشکیل اپنی مرضی کے مطابق کی جا
تھی۔

ایک بوڑھے انگریز سے بات ہوئی۔ وہ انڈیا کے حالات سے واقف تھا۔ اس نے کہا کہ ا

سے بھی دلچسپی ہے۔ ایک بار میں نے انڈیا کی سیاحت بھی کی ہے۔ مگر میرا احساس یہ ہے کہ عقلی نقطۂ نظر اور علمی طرزفکر کے معاملہ میں ہندستانی ذہن یورپی ذہن سے بہت پیچھے ہے :

The Indian mind is far less rational and scientific than the European.

میں مذکورہ انگریز کی اس بات کو میں رد نہ کر سکا۔ کیوں کہ میرا اپنا خیال بھی ہندستانی ذہن کے بارہ میں یہی ہے۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ پورے برصغیر ہند کی اصل کمی یہی ہے۔ انڈیا کے لیڈروں نے اصل مسئلہ سیاسی آزادی کو سمجھا۔ پاکستانی لیڈروں نے مسلم پاکٹ بنانے کو اصل مسئلہ قرار دیا۔ بنگلہ دیش کے لیڈروں نے یہ سمجھا کہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ بنگلہ زبان اور بنگلہ تہذیب کو ایک آزاد علاقہ حاصل ہو جائے۔

مگر میرے نزدیک یہ سب کی سب سطحی سوچ تھی۔ یہ سب قیادت سازی کے نظریے ہیں، وہ قوم سازی کے نظریے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان خیالات کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکوں نے کچھ لیڈروں کے گنبد تو ضرور کھڑے کر دئے۔ مگر یہ تحریکیں قوم کا مستقبل تعمیر کرنے میں سراسر ناکام رہیں۔

لندن کی ایک مجلس میں بوسنیا میں ہونے والے مظالم کا ذکر ہوا۔ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے پرجوش طور پر کہا کہ عراق نے کویت کے خلاف ظلم کیا تو امریکی حکومت فی الفور پوری قوت کے ساتھ حرکت میں آگئی۔ بوسنیا میں سرب اور یوگوسلاوی حکومت نے وہاں کے مسلمانوں کے خلاف ظلم کی انتہا کر دی ہے۔ مگر امریکہ کی حکومت نے اس کے لئے کچھ نہیں کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بش انتظامیہ کے نزدیک صرف ان مسلمانوں کی اہمیت ہے جن کے پاس تیل ہو :

It would appear that only Muslims with oil count for the Bush administration.

میں نے کہا کہ اس معاملے میں خود مسلمان ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند کا مصداق ہیں۔ صدام حسین نے کویت کے خلاف جارحیت سے پہلے ایران کے خلاف جارحیت کی اور اور اس کو ۸ سال تک جاری رکھا، مگر ہمارے علماء اس جارحیت پر خاموش رہے۔ لیکن جب اسی صدام نے کویت (اور سعودی عرب) کے خلاف جارحیت کی تو تمام علماء چیخ اٹھے۔ کیوں کہ سعودی عرب اور کویت سے ان علماء کا مفاد وابستہ تھا۔ جب کہ ایران سے ان کا اس قسم کا مفاد وابستہ نہیں۔

ایک پاکستانی جریدہ "اخبار اردو" میں ڈاکٹر محمد اسلم [illegible] کا ایک مضمون چھپا ہے۔ وہ بریڈ فورڈ میں رہتے ہیں۔ وہ طبی پیشہ کے ساتھ شعر و ادب سے بھی لگاؤ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا تھا کہ "اس وقت برطانیہ میں جس قدر مشاعرے ہوتے ہیں، شاید پاکستان میں بھی نہیں ہوتے۔ لندن، برمنگھم، آکسفورڈ، مانچسٹر، بریڈ فورڈ، گلاسگو، اڈنبرا اور ناٹنگھم جیسے برطانی شہروں میں کئی کئی ادارے اور ادبی انجمنیں قائم ہیں۔ یہ کسی نہ کسی موضوع پر جلسے، مذاکرے اور مشاعرے منعقد کراتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ بیرون برطانیہ، بالخصوص پاکستان سے، بھارت اور بنگلہ کے شاعر اور ادیب اور اہل قلم تشریف لاتے رہتے ہیں۔ ان کے اعزاز میں مشاعرے یا ادبی تقاریب منعقد ہوتی ہیں۔"

ڈاکٹر اقبال ۱۹۰۵ میں یورپ گئے۔ وہاں وہ تعلیم کے سلسلہ میں انگلینڈ اور جرمنی میں ۱۹۰۸ تک رہے۔ اس قیام کے دوران انھیں احساس ہوا کہ یہ زمانہ شعر و شاعری کا نہیں ہے بلکہ سائنس کا ہے۔ انھوں نے شاعری کو چھوڑ دینے کا ارادہ کیا اور اپنے دوست سر عبد القادر (مدیر مخزن) کو ایک منظوم خط میں لکھا:

مدیر مخزن سے جا کے اقبال کوئی میرا پیام کہہ دے   کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

مگر اقبال کے دوستوں نے اصرار کرکے انھیں شعر گوئی کے مشغلہ پر باقی رکھا۔ عجیب بات ہے کہ تقریباً نوے سال بعد بھی مسلمان یورپ تک میں شعر و شاعری کے مشغلہ کو بدستور اختیار کئے ہوئے ہیں۔ شاید اس لئے کہ ان کے محبوب رہنما (اقبال) شاعری کو بے فائدہ سمجھنے کے باوجود اس کو چھوڑنے پر اپنے آپ کو راضی نہ کر سکے تھے۔

ایک برطانی تاجر سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا کہ برطانیہ میں (اور پوری مغربی دنیا میں) دکھائی دے رہا ہے کہ جاپان نے اقتصادی حملہ کر رکھا ہے۔ وہ آپ لوگوں کی سپر یمیسی کو چھین رہا ہے ۱۹ ویں صدی کو برٹش صدی کہا جاتا ہے۔ ۲۰ ویں صدی امریکی صدی تھی۔ مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۲۱ ویں صدی جاپانی صدی ہوگی۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ امریکہ میں جاپان کو دشمن نمبر ایک کہا جانے لگا ہے۔ جاپان کی پر کیپیٹا جی این پی امریکہ سے ۲۲ فیصد زیادہ ہے۔ اور اسی طرح برطانیہ سے بھی اس کا ٹریڈ سرپلس ۱۲۰ بلین سالانہ ہے۔ اس طرح کی کچھ باتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد میں نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں خود جاپان گیا ہوں۔ اور اس کو قریب

ضد پیدا ہوگیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا بنیادی سبب ایجوکیشن ہے۔

The educational achievements of Japanese workers at all levels are unmatched in the world.

ایک صاحب نے کہا کہ آپ کی تحریروں میں اختلاف رائے اور تنقید بہت ہوتی ہے۔ یہاں کے کچھ لوگ کہنے لگے ہیں کہ آپ کو تنقید کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بے بنیاد الزام ہے۔ آپ کسی بھی مہینہ کے الرسالہ کو اٹھا کر دیکھئے اور ہر مضمون کو پڑھ کر پتہ کیجئے کہ اس میں اختلاف رائے والا پہلو کتنا ہے۔ آپ پائیں گے کہ کسی پرچہ میں سرے سے ایسا کوئی مضمون نہ ہو گا اور کسی میں ہوگا بھی تو صرف ایک یا دو فیصد۔

پھر میں نے کہا کہ اصل مسئلہ اختلاف رائے نہیں ہے۔ اصل مسئلہ لوگوں کی غیر ضروری حساسیت ہے۔ صحابہ کے زمانہ سے لے کر ہر اگلے دور تک علماء کے درمیان اختلاف ہوتا تھا مگر کبھی کسی نے اختلاف کو برا نہیں بتایا۔ مثلاً امام محمد اور امام ابو یوسف دونوں امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے۔ دونوں نے امام ابو حنیفہ کی رایوں سے ۸۲ معاملہ میں اختلاف کیا ہے۔ مگر اس کو کبھی کسی نے برا نہیں مانا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف رائے یا علمی و فکری تبصرہ قوموں کی زندگی ہے۔ اس کو اسلام میں اتنا زیادہ جگہ دی گئی ہے کہ آدم کی پیدائش کی کہانی کا ایک جزء جو بائبل میں حذف ہو گیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں درج فرمایا۔ یہ خود اللہ تعالیٰ سے فرشتوں کا یہ کہنا تھا کہ اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفك الدماء (البقرة ۳۰)

ایک صاحب نے تنہائی میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ جب کمرہ کے اندر تنہا ملاقات ہوئی تو وہ اپنے گھریلو حالات بتاتے ہوئے رونے لگے۔ یہاں بہت سے لوگ ہیں جو بظاہر دیکھنے میں ٹھیک معلوم ہوں گے لیکن اگر تحقیق کیجئے تو معلوم ہوگا کہ لوگ سخت الجھنوں میں مبتلا ہیں۔ کہیں باپ اور بیٹے کے درمیان کشمکش، کہیں شوہر اور بیوی کے تعلقات میں بگاڑ، کہیں ساس اور بہو کے درمیان جھگڑا۔

اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے میری سمجھ میں آیا کہ مسلمانوں میں اتنی شدت کے ساتھ ان مسائل کے پیدا ہونے کا کم از کم ایک سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی جدید نسلوں کو دو سو برس سے صرف ایک ہی

تعلیم دی جا رہی ہے، اور وہ جہاد ہے۔ ہر لکھنے اور بولنے والا صرف جہاد کی گردان کرنے میں مشغول ہے۔ کوئی بھی نہیں جو صبر و اعراض اور مفاہمت کی قدروں کو جانے اور اس کو امت کے اندر پھیلانے کی کوشش کرے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے ـــ جہاد اور ٹکراؤ ہے۔ چنانچہ آدمی جب کسی مسئلہ سے دوچار ہوتا ہے، خواہ وہ گھر کے باہر ہو یا گھر کے اندر، تو فوراً جہادی تدبیریں اس کے ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ اس صورت کو بدلا جائے اور لوگوں کو صبر و اعراض اور حسن تدبیر کی قدروں سے آشنا کرایا جائے۔

برمنگھم میں علما کی ایک مجلس میں ایک بزرگ نے سوال کیا کہ اردو خواں طبقہ یا انگریزی خواں طبقہ میں تو آپ کا مشن پھیل رہا ہے۔ عرب دنیا میں اس کو کس حد تک قبولیت حاصل ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ پچھلے چند سالوں میں عرب نوجوانوں میں یہ مشن تیزی سے پھیلا ہے اور پھیلتا جا رہا ہے۔ اسی لئے میں یہاں سے قاہرہ جا رہا ہوں۔ کیوں کہ وہاں عرب نوجوان جمع ہوں گے۔ انھوں نے شدت سے اس کی خواہش ظاہر کی ہے۔

میں کہا کہ عرب نوجوانوں میں اس مشن کے پھیلنے کی خاص وجہ ہے۔ آپ لوگوں کو اگر عرب دنیا کے داخلی حالات کا علم ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام کی سیاسی تفسیر عرب دنیا میں تیزی سے پھیلی۔ اس کے نتیجہ میں عرب دنیا کے اسلام پسندوں اور وہاں کی حکومتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ کیوں کہ سیاسی اسلام کا نظریہ براہ راست طور پر موجودہ عرب حکمرانوں کے نظام سے ٹکراتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر عرب ملک میں " اسلام پسند " حضرات کی تعذیب شروع ہو گئی جو تا حال جاری ہے۔

اس صورت حال کے نتیجہ میں عرب نوجوانوں کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب رہ گیا تھا۔ یا تعذیب یا منافقت۔ اگر وہ اپنے نظریہ کے مطابق رہنا چاہیں تو حکمرانوں کے شدید عتاب کا شکار رہیں۔ اور اگر اپنے نظریہ کو اپنے اندر چھپائیں تو منافق بن کر زندگی گزاریں۔ اس کے بعد جب ان کا تعارف الرسالہ مشن سے ہوا تو ان پر منکشف ہوا کہ ہم کو نہ عذاب سہنے کی ضرورت ہے اور نہ منافق بننے کی۔ خیر الامور اوسطہا کے اصول کے مطابق یہاں ان کے لئے ایک تیسری صورت

موجود ہے جو زیادہ بہتر اور زیادہ صحیح ہے۔ چنانچہ وہ الرسالہ مشن کو دل وجان سے قبول کر رہے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان میں اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں، اس کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ یہ گفتگو رات کے وقت ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ دنیا میں اندھیرا چھا رہا ہے، اس کو دور کرنے کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ بظاہر اس وقت اندھیرا ہے، مگر دوسرا اس سے بڑا واقعہ یہ ہے کہ پورا کائناتی نظام اس اندھیرے کو ختم کرکے دوبارہ صبح طلوع کرنے کی طرف متحرک ہے۔ پھر آپ اندھیرے کے خلاف احتجاج کیوں کریں۔ آپ آنے والی صبح کو سوچ کر اللہ کا شکر کیوں نہ کریں۔

میں نے کہا کہ اس دین کے ساتھ اللہ نے محفوظیت (الحجر ۹) کا معاملہ کیا ہے۔ اس معاملہ کی نشانیاں آپ ساری تاریخ میں دیکھ سکتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا چاہا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ خود تاتاری دین کے خادم بن گئے۔ بیسویں صدی میں اتاترک اور عصمت انونو نے ترکی سے اسلام کو ختم کرنا چاہا۔ مگر دو نسلوں تک حکومت کی ساری طاقت ختم کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ عصمت انونو (۱۹۷۳-۱۸۸۴) نے انتقال کے وقت کہا کہ میں نے اپنی زندگی میں یہ عجیب چیز دیکھی کہ ہم نے ترکی میں سیکولرزم کا پودا بویا مگر جب پھل نکلا تو وہ اسلام تھا۔

یہی معاملہ ہندستان میں ہو رہا ہے۔ لوگوں کے بیان کے مطابق ۱۹۴۷ سے پہلے ہندوؤں نے انڈیا سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ مگر ساری کوششوں کے بعد یہ حال ہوا کہ ۱۹۴۷ میں غیر منقسم ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد چھ کروڑ تھی۔ آج اسی ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چوگنا ہو چکی ہے۔ میوات میں کچھ جاہل مسلمان تھے جو چوٹیاں رکھتے تھے اور ہندو رسوم مناتے تھے۔ ہندوؤں نے ان کو شدھی کرکے انھیں دوبارہ ہندو بنانے کی تحریک چلائی۔ اس کے جواب میں مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی دینی اصلاح کی کوشش شروع کی۔ آج یہ حال ہے کہ نہ صرف میواتیوں کی دینی اصلاح ہوئی بلکہ مولانا الیاس صاحب کی اٹھائی ہوئی تحریک ایک عالمی اصلاحی تحریک بن گئی۔ تقسیم کے بعد کچھ ہندوؤں نے اجودھیا کی بابری مسجد پر قبضہ کے سلسلہ

کوشش کی۔ اس کے بعد مسلمانوں میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ اجودھیا کی مسجد میں ہندوؤں کو داخلہ کا موقع اس لئے ملا کہ وہ غیر آباد تھی۔ کیوں کہ خانۂ خالی را دیو می گیرد۔ اس احساس نے دوسری مسجدوں کی آبادی کا ذہن پیدا کیا۔ آج ہندستان کی تین لاکھ سے زیادہ مسجدیں مزید بہت زیادہ آباد اور پر رونق ہو چکی ہیں۔

پھر جب حالت یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہر سازش برعکس طور پر خود اسلام اور مسلمانوں کی ترقی کا باعث ہوتی ہے تو ہم کو لوگوں کی سازش پر پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

چیرنل ہرسٹ کے پروگرام سے فارغ ہونے کے بعد نیو ہیم نارتھ (Newham North) کے لئے روانگی ہوئی۔ اس سفر کے درمیان لندن کا مشہور دریائے ٹیمز پڑتا ہے۔ اس دریا کے نیچے سے لمبی سرنگ بنا کر راستہ نکالا گیا ہے۔ اس کے اندر سے ہماری گاڑی گزری تو عجیب احساس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو کیسی کیسی قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ وہ نہ صرف دریا کے اوپر کشتی کے ذریعہ سفر کرتا ہے۔ بلکہ دریا کے نیچے سے سڑک نکال کر خشکی کا راستہ بنا سکتا ہے۔ اوپر دریا بہہ رہا ہے اور نیچے سے کاروں کے قافلے گزر رہے ہیں۔

۲۷ ستمبر کی صبح کو ہم گھر سے نکلے کہ نیو ہیم نارتھ (گرین اسٹریٹ) کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھیں۔ یہ صبح ۶ بجے کا وقت تھا۔ وہاں پہنچے تو اس کے دونوں دروازوں پر تالا لگا ہوا تھا۔ اوپر انگریزی میں لکھا ہوا بورڈ دکھائی دے رہا تھا : دی مسلم کمیونٹی سنٹر۔ کچھ دیر تک سڑک پر کھڑے ہو کر انتظار کیا کہ شاید کوئی صاحب آرہے ہوں اور مسجد کا دروازہ کھولیں۔ مگر کوئی صاحب نہیں آئے۔ چنانچہ واپس آکر اپنی قیام گاہ پر فجر کی نماز ادا کی۔

۲۷ ستمبر کو اتوار کا دن تھا۔ صبح ہوئی تو مجھے سو سال پہلے کی انگریزی کی کتاب یاد آئی جس کو میں نے تقریباً پچاس سال پہلے پڑھا تھا۔ یہ بچوں کی کتاب تھی۔ اس میں لندن کی صبح کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ الفاظ لکھے گئے تھے ــــــ لندن کے گھنٹے بجنے لگے :

The bells of London begun to ring.

میں نے سننے کی کوشش کی تو لندن کے گھنٹوں کی آواز مجھے سنائی نہ دی۔ البتہ اس کے بجائے سڑک سے گزرنے والی کاروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ لندن کے یہ گھنٹے

لندن کے بہت سے گھنٹے بجتے تھے۔ سو سال پہلے صبح کے وقت سب سے زیادہ عام آواز یہاں کے چرچ کے گھنٹوں کی آوازیں ہوتی تھیں۔ مگر صنعتی دور نے حالات میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں۔ اب عبادت خانوں کی اہمیت گھٹ گئی اور اس کے بجائے مشینوں کی اہمیت زیادہ ہو گئی۔

لندن میں چھوٹی بڑی تقریباً ۱۰۰ مسجدیں ہیں۔ میری قیامگاہ کے قریب ایک مسجد تھی۔ اس سے بالکل متصل ایک مکان تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ مکان ایک انگریز کا تھا۔ وہ مکان بیچنا چاہتا تھا۔ کئی انگریز اس کو خریدنے کے لئے آئے۔ انھیں میں سے ایک مسلمان بھی تھا جو مسجد کی توسیع کے لئے اس مکان کو خریدنا چاہتا تھا۔ انگریز نے اپنے ہم قوموں کو مکان نہیں دیا۔ اس نے اپنا مکان مسجد والوں کو دے دیا اور کہا کہ آپ لوگ اس کو مسجد میں شامل کر کے مسجد کی توسیع کریں۔ یہ میرے لئے زیادہ خوشی کی بات ہے کہ میرا مکان آئندہ ایک عبادت خانہ کا حصہ بن جائے۔ میں نے خود جا کر اس مسجد اور اس مکان کو دیکھا۔

لندن میں مجھے بون (جرمنی) سے مسٹر فاروق جنگ کا ٹیلی فون ملا۔ انھوں نے پہلے ہی سے اس سفر میں مجھے جرمنی آنے کی دعوت دی تھی۔ انھوں نے یہ انتظام کیا تھا کہ برسیلز سے بذریعہ کار مجھ کو بون لے جائیں۔ مگر بعض وجوہ سے میں ایسا نہ کر سکا۔

ذاتی طور پر میں جرمنی جانے کا خواہش مند تھا۔ خاص طور پر میں برلن وال کو دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اب ٹوٹ کر ختم ہو چکی ہے۔ برلن وال ایک سو میل لمبی تھی جو مشرقی برلن کو مغربی برلن سے جدا کرتی تھی۔ یہ سیمنٹ کنکریٹ سے سابق سوویت یونین کے زیر حکم بنائی گئی تھی۔ ونسٹن چرچل نے اس کو آہنی پردہ (Iron Curtain) کا نام دیا تھا دیا تھا۔ برلن وال اگست ۱۹۶۱ میں بنائی گئی تھی۔ اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ مشرقی جرمنی سے بھاگ کر مغربی جرمنی میں داخل ہونے والوں کو روکا جائے:

It was built in August 1961, mainly with the aim to contain the massive exodus of East Germans to the West.

مگر ۹ نومبر ۱۹۸۹ کی رات کو برلن وال ہمیشہ کے لئے توڑ دی گئی۔ حتی کہ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی کی تقسیم بھی ختم ہو گئی۔ دونوں مل کر ایک ملک بن گئے اور ایک حصہ کے لوگوں کے لئے دوسرے حصہ کی طرف جانے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی۔

خبر نامہ اسلامی مرکز ۱۰۱

۱ ایک کانفرنس کی دعوت کے تحت صدر اسلامی مرکز نے اگست ۱۹۹۴ میں برطانیہ کا سفر کیا۔ اس سلسلہ میں لندن، مانچسٹر، برمنگھم، کارڈف، برسٹل وغیرہ میں مختلف پروگرام ہوئے۔ اس کی روداد انشاءاللہ سفرنامہ کے تحت الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۲ مولانا بشیر احمد راشد الامینی (مہتمم مدرسہ معین الاسلام، نئی دہلی) الرسالہ کے بارہ میں اپنے تاثرات بتاتے ہوئے ایک مفصل خط میں لکھتے ہیں: الرسالہ ایک ماہنامہ نہیں بلکہ وہ ایک مشن ہے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں سے ایک دینی مشن زبانی چلایا تھا، اسی دینی مشن کو آپ نے قلم میں بدل دیا ہے۔

۳ پی ٹی آئی کی نمائندہ مسز الپنا نے ۲۳ اگست ۱۹۹۴ کو ٹیلیفون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر فیملی پلاننگ اور ستمبر میں قاہرہ میں ہونے کانفرنس سے تھا جو اقوام متحدہ کے زیر اہتمام پاپولیشن اینڈ ڈولپمنٹ کے موضوع پر ہو رہی ہے۔

۴ الرسالہ کا مشن خالص تعمیری مشن ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سے متاثر حضرات جگہ جگہ تعمیری اور تعلیمی منصوبوں میں سرگرم ہو رہے ہیں۔ انھیں میں سے ایک نیو مسلم ایجوکیشن سوسائٹی (سہارنپور) بھی ہے۔ یہ رجسٹرڈ ادارہ خصوصیت سے تعلیم کے میدان میں اپنی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس سلسلہ کا ایک اقدام نیشنل یونانی میڈیکل کالج کا قیام ہے۔

۵ جواہر بھون (نئی دہلی) میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی ایک میٹنگ ۲۴ اگست ۱۹۹۴ کو ہوئی۔ اس کا موضوع "قومی تعمیر اور اقلیتیں" تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور مذکورہ موضوع پر ایک تقریر کی۔

۶ ہندی ہفت روزہ پانچ جنیہ (نئی دہلی) کے نمائندہ مسٹر مہاراج کرشن بھرت نے ۲۵ اگست ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسٹر انور شیخ کی کتاب اٹرنیٹی (Eternity) سے تھا جو انھوں نے اسلام کے خلاف لکھی ہے۔ بتایا گیا کہ مصنف کا مطالعہ اسلام کے بارہ میں بہت کمزور ہے۔ انھوں نے بہت زیادہ غلطیاں کی ہیں۔

۷ بی بی سی کے نمائندہ مسٹر قربان علی نے ۲۶ اگست ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا ایک انٹرویو

دیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر قاہرہ میں ستمبر ۱۹۹۴ میں ہونے والی انٹرنیشنل کانفرنس سے تھا۔ یہ کانفرنس آبادی اور انسانی ترقی کے موضوع پر ہو رہی ہے۔ بتایا گیا کہ مالتھس کا نظریہ غلط ثابت ہو چکا ہے اور آبادی میں اضافہ کسی بھی درجہ میں انسانی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہے۔

۸ نیو انڈیا موومنٹ کے تحت ۲۸ اگست ۱۹۹۴ کو ایک میٹنگ نئی دہلی (ہیلی روڈ) میں ہوئی۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ہندستان کی تعمیر نو کے موضوع پر تقریر کی۔

۹ چنتک منڈل (نئی دہلی) کی ایک میٹنگ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کمیٹی روم میں ۲ ستمبر ۱۹۹۴ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کا موضوع تھا: ذات پات اور ملکی ترقی۔

۱۰ ادھیاتما سادھنا کیندر (مہرولی) میں تھنک ٹینک کا اجلاس اچاریہ تلسی کی صدارت میں ۳ ستمبر ۱۹۹۴ کو ہوا۔ اس میں تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوئے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع تھا: ملک میں نیشنل کیرکٹر کیسے پیدا کیا جائے۔ اس موضوع پر اسلام کی روشنی میں اظہار خیال کیا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ۱۹۴۷ کے بعد کیرکٹر بلڈنگ کا پراسس ٹوٹ گیا ہے۔ پہلے یہ کام مذہبی پیشوا کرتے تھے۔ اب مذہبی پیشوا ہندوؤں میں آشیرواد کے لئے اور مسلمانوں میں برکت کے لئے رہ گئے ہیں۔ اب وہ معلم اخلاق نہیں ہیں۔

۱ اٹلی کے شہر اسیسی میں ۱۱-۱۳ ستمبر ۱۹۹۴ کو ایک انٹرنیشنل کانفرنس ہوئی۔ اس کا موضوع عالمی امن کا مسئلہ تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفر نامہ کے ذیل میں الرسالہ میں شائع کر دی جائے گی۔

۱۲ رشی کیش کے انٹرنیشنل آشرم پرمارتھ نکیتن نے اسلامی مرکز سے کہا ہے کہ وہ اسلام پر تین سو صفحہ کی ایک (Islam in daily life) کے نام سے تیار کرکے دے جس کو وہ دس زبانوں میں چھاپ کر عالمی سطح پر پھیلائیں گے۔ انڈیا کے مشہور اشاعتی ادارہ بھارتیہ ودیا بھون نے بھی اسلامی مرکز سے اسلام پر ایک کتاب مانگی ہے جس کو وہ (Primer of Islam) کے نام

سے چھاپ کر شائع کریں گے۔ اسی طرح ناگپور کے ایک سماجی ادارہ انڈیا پیس سنٹر نے اسلامی مرکز سے کہا ہے کہ وہ اسلام پر ایک کتاب (Social teachings of Islam) کے نام سے تیار کر کے دے جس کو وہ اپنے اہتمام میں چھاپ کر اسکولوں اور لائبریریوں کو فراہم کریں گے۔

۱۳ ہندی اخبار راشٹریہ سہارا کے سب اڈیٹر مسٹر ستیش نرائن سنگھ نے ۵ ستمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر ہندستانی مسلمانوں کے مسائل سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ دنیا کا نظام عملی تقاضوں پر چلتا ہے۔ اس لئے آدمی کو ذاتی معاملہ میں آئیڈیلسٹ ہونا چاہئے مگر اجتماعی معاملات میں اس کو پریکٹیکل بن جانا چاہئے۔

۱۴ بی بی سی لندن کے نمائندہ مسٹر آصف جیلانی نے ۶ ستمبر ۱۹۹۴ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر بابری مسجد کی مسماری کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے حالات سے تھا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مسلمان جس طرح برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں اسی طرح ہندستان میں بھی رہنے لگیں تو ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

۱۵ ریاض کے عربی ماہنامہ المسلمون کے نمائندہ دکتور عبد اللہ العویسی اور استاذ عمار بکار نے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا تھا۔ یہ انٹرویو مکمل طور پر المسلمون کے شمارہ ۹ ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ (۲ مئی ۱۹۹۴ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس کے چند عنوانات یہ ہیں: لیس هناك صحوة اسلامية بل صحوة قومية۔ روح الاسلام تكمن في الاتحاد مع الاختلاف۔ الجمود الفكرى اخطر مراحل التخلف۔ واجهتنا المشاكل عند ما قصرنا في الدعوة۔

۱۶ ستمبر ۱۹۹۴ میں صدر اسلامی مرکز نے بمبئی کا سفر کیا۔ وہاں شہر کے مختلف علاقوں میں کئی دعوتی اور تربیتی میٹنگیں ہوئیں۔ اس کی روداد ان شاء اللہ سفرنامہ کے تحت شائع کر دی جائے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا اسلامی مرکز کا ترجمان

دسمبر ۱۹۹۴، شمارہ ۲۱۷

فہرست صفحہ

AL-RISALA (Urdu) Monthly
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, Tel. 4611128, 4697333
Fax: 91-11-4697333
Single Copy Rs. 7 ☐ Annual Subscription Rs. 70/$25 (Air-mail)
Printed by Nice Printing Press, Delhi

ایک دُعا

یہ دنیا حادثات کی دنیا ہے۔ یہاں یکساں حالات کا برقرار رہنا ممکن نہیں۔ یہاں عین فطرت کے قانون اور عین تخلیقی نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ بار بار حالات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ بار بار نقصان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں، یہ نقصان کبھی خوف کی صورت میں پیش آئے گا، کبھی بھوک کی صورت میں، اور کبھی مال اور جان اور فائدہ میں کمی کی صورت میں (البقرہ ۱۵۵)

ایسی حالت میں ایک انسان وہ ہے جو فریاد و ماتم کرنے لگتا ہے۔ وہ شکایت اور احتجاج کی نفسیات میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ مایوسی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ مگر یہ سچے انسانوں کا طریقہ نہیں۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جو سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

ایسے مواقع پر کسی انسان کے لیے صحیح اور سچا طریقہ صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ وہ سارے معاملہ کو مالکِ کائنات کے اوپر ڈال دے۔ وہ مصیبت کو صبر کا معاملہ بنائے نہ کہ بے صبری کا۔ وہ اس کو وقتی تاثر کے خانہ میں ڈالے نہ کہ مستقل تاثر کے خانہ میں۔

جن لوگوں کے اندر یہ ربانی شخصیت ہو۔ جو سچائی کے راستہ کو پائے ہوئے ہوں۔ ان پر جب ایسی کوئی آفت آتی ہے تو ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ خدایا، تو ہماری مصیبت میں ہم کو اجر دے۔ تو اس کے بعد ہمارے لیے خیر کی صورت پیدا فرما دے (إنا لله و إنا إليه راجعون۔ اللهم أجرنا في مصيبتنا واخلف لنا خيرا منها)

جو بندہ شخصی یا قومی مصیبت پیش آنے کے بعد یہ کہہ پڑے۔ اس کو فوراً ایک نیا سنبھالا مل جائے گا۔ جھٹکا لگنے کے بعد وہ دوبارہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ ناامیدی کے تجربہ سے دوچار ہونے کے بعد وہ جلد ہی امید کا نیا تحفہ اپنے لیے پا لے گا۔

ایسے لوگ ماضی کو کھو کر دوبارہ اپنے مستقبل کو پا لیتے ہیں، وہ محرومی میں بھی یافت کا سرمایہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جہاں بظاہر کہانی ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہو وہاں بھی وہ ایک نیا پیراگراف معلوم کر لیتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنی زندگی کی کہانی کو از سر نو شروع کر سکیں۔

جنت کے کنارے

عن ابی ھریرۃؓ قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: اذا مررتم بریاض الجنۃ فارتعوا۔ قیل یا رسول اللہ وما ریاض الجنۃ۔ قال المساجد (وحلق الذکر) قیل وما الرتع یا رسول اللہ۔ قال: سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر۔

(مشکاۃ المصابیح ۱/۲۲۶ - ۲/۵۰۳)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جب تم جنت کے باغوں سے گزرو تو اس سے چر لیا کرو۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، جنت کے باغ کیا ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مسجدیں اور ذکر کے حلقے۔ کہا گیا کہ اے خدا کے رسول، چرنا کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ اور الحمد للہ اور لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر۔

آدمی جب دنیا میں چلتا پھرتا ہے تو اس کے سامنے ایسے مواقع آتے ہیں جو اس کے خدائی احساسات کو جگاتے ہیں۔ کبھی مسجد اس کو خدا کی معبودیت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ کبھی ذکر خداوندی کی مجلسیں اس کو خدا کی صفات کی یاد دلاتی ہیں۔ کبھی کائنات کی نشانیاں اس کو خدا کے عظمت وجلال کی جھلک دکھاتی ہیں۔

اس قسم کے تجربات آدمی کو جنت کے باغوں میں سے کسی باغ کے کنارے پہنچا دیتے ہیں۔ وہ آدمی کے اندر ان احساسات کو پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جو اس کو جنت میں پہنچانے والے ہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ ان مواقع سے استفادہ کرے اور ان سے جنتی غذا لے کر اپنے آپ کو جنت میں بسنے کے قابل بنا لے۔

ان تجربات کے درمیان آدمی کے اوپر اتنا شدید تاثر طاری ہونا چاہیے کہ اس کی روح حقیقتِ اعلیٰ سے مربوط ہو جائے۔ اس کے ابلتے ہوئے احساسات ان الفاظ میں ڈھل جائیں کہ خدایا، تو پاک ہے۔ سارا شکر اور ساری تعریف تیرے لیے ہے۔ تو ہی معبود ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ ساری بڑائی صرف تیرے لیے ہے، تیرے سوا کسی کو بھی کوئی بڑائی حاصل نہیں۔

دنیا میں آدمی کو اس طرح رہنا ہے کہ وہ یہاں کے مناظر میں جنت کی جھلک دیکھنے لگے۔ اس کے بعد ہی وہ جنت کے باغوں میں چرنے کی سعادت حاصل کر سکتا ہے۔

نقطۂ انقلاب

عمر بن عبد العزیز تابعی بنو امیہ کے ایک خلیفہ تھے۔ ان کے عالم اور زاہد اور خلیفۂ راشد ہونے پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ صحابہ کے بعد ان کا مقام امت میں سب سے زیادہ بلند مانا جاتا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز اپنی ابتدائی زندگی میں ایک خوش باش اور خوش پوش انسان کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ وہ پر تکلف زندگی گزارتے تھے۔ آخر عمر میں وہ بالکل بدل گئے۔ اس تبدیلی کے لیے جو واقعہ نقطۂ آغاز ثابت ہوا وہ یہ تھا:

قال عبد اللہ بن کثیر قلتُ لعمر بن عبد العزیز ما کان بدءُ انابتک۔ قال اردت ضرب غلام لی فقال لی اذکر لیلۃً صبیحتھا یوم القیامۃ (البدایۃ والنھایۃ ۹/۱۹۵)

عبد اللہ بن کثیر کہتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبد العزیز سے پوچھا کہ آپ کی انابت کا آغاز کیسے ہوا۔ انھوں نے کہا کہ میں نے اپنے ایک غلام کو مارنا چاہا تو اس نے کہا کہ اس رات کو یاد کرو جس کی صبح قیامت کا دن ہے

جب آدمی کے اندر زندگی ہو، جب آدمی کے اندر قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہو تو ایک جملہ اس کو بدلنے کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب اس کی روح مردہ ہو جائے۔ جب اس کی قبول کرنے کی صلاحیت زندہ حالت میں باقی نہ رہے تو ہر دلیل اس کے لیے بے کار ہے۔ اس کے بعد کسی بھی قیمت پر وہ حق کو قبول کرنے والا نہیں، خواہ حق کو کتنا ہی زیادہ دلائل کے ساتھ اس کے سامنے بیان کر دیا گیا ہو۔

حضرت عمر بن عبد العزیز اپنے غلام کو مارنا چاہتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غلام سے ان کو کوئی سخت شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے باوجود غلام کی بات سنتے ان کو ہلا دیا۔ یہ کسی انسان کے لیے انتہائی عظمت کی بات ہے۔ ایک شخص جس سے تکلیف پہونچی ہو۔ جس نے سخت شکایت کا موقع دیا ہو، اس کی بات سے مثبت اثر لینے کے لیے بہت اونچی انسانیت درکار ہے۔ مگر اس دنیا میں وہی لوگ اونچی ایمانی ترقی کرتے ہیں جو اس قسم کی اونچی انسانیت کا ثبوت دے سکیں۔

مردہ انسان کے لیے شکایت کا واقعہ اختتام کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر زندہ انسان کے لیے شکایت کا واقعہ ایک نئے دور کا آغاز بن جاتا ہے۔

اختلاف کے باوجود

جس زمانے میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، قیصر روم (قسطنطنیہ) نے ارادہ کیا کہ وہ مسلم دنیا پر حملہ کر دے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اس وقت مسلمان باہمی لڑائی میں مبتلا ہیں۔ اگر اس وقت میں نے حملہ کر دیا تو میں شام ومصر وغیرہ علاقہ پر دوبارہ قبضہ کر سکتا ہوں۔ حضرت معاویہ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً قیصر روم کے نام ایک خط روانہ کیا۔ اس میں لکھا ہوا تھا:

اذا عقدت العزم علی ان تحقق ارادتك فانی اُقسم ان اتصالح مع صاحبی ثم لاسيّرن ضدك جيشاً ساكون ضمن اول كتيبة فيه وساجعلن من القسطنطينية شعلة نار (تاج العروس ٧/٢٠٨)

اگر تم نے یہ عزم کیا کہ تم اپنے ارادہ کو پورا کرو تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں علی سے صلح کر لوں گا۔ پھر میں تمہارے خلاف ایک لشکر روانہ کروں گا جس کے پہلے دستہ میں میں خود شامل ہوں گا اور پھر میں قسطنطنیہ کو آگ بنا دوں گا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت معاویہ کے اس خط کے بعد قیصر روم نے اپنا حوصلہ کھو دیا۔ اس نے فوجوں کی تیاری روک دی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اب مسلمانوں سے جنگ چھیڑنا اپنی مزید بربادی کو دعوت دینا ہے۔

یہ زندہ لوگوں کا طریقہ ہے۔ ان کے اندر آپس میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر جب معاملہ وسیع تر مفاد کا آجائے تو وہ اپنے اختلاف کو ختم کر کے ایک ہو جاتے ہیں۔ ان کے اختلاف کی ایک حد ہوتی ہے۔ حد کے آجانے کے بعد ان کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔

زندہ انسان دوستی کے باوجود کسی کی بے جا حمایت نہیں کرتا۔ وہ دشمنی کے باوجود کوئی چھوٹی حرکت نہیں کرتا۔ وہ انفرادی جھگڑے کے باوجود اجتماعی امور میں متحد ہو جاتا ہے۔ وہ شخصی کدورت کے باوجود اسلامی تعلق میں فرق نہیں آنے دیتا۔ زندہ انسان کسی سے نزاع پیش آنے کے باوجود اس کی خصوصیات کا اعتراف کرتا ہے۔ وہ رنجش پیدا ہونے کے باوجود امانتوں کو ادا کرتا ہے۔ زندہ انسان کسی حال میں پست حرکت نہیں کرتا، وہ کسی حال میں اپنی انسانیت کو نہیں کھوتا۔ زندہ انسان دشمن ہو سکتا ہے مگر وہ کمینہ نہیں ہو سکتا۔ زندہ انسان شاکی ہو سکتا ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس سے اس کو شکایت ہو اس کے خلاف وہ جھوٹا الزام لگانے لگے۔

تنقید کو سن کر

خلیفہ ہارون الرشید (۱۹۳ - ۱۷۰ھ) نے ایک بار اپنے وزیر سے کہا کہ مجھ کو کسی بزرگ کے پاس لے چلو۔ وہ خلیفہ کو الفضیل بن عیاض (۱۸۷-۱۰۵ھ) کے پاس لے گیا۔ اس سلسلہ میں لمبا قصہ کتابوں میں نقل ہوا ہے۔

خلیفہ کے ساتھ اس کے کئی درباری تھے۔ انھوں نے فضیل سے مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے بھی مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ جب فضیل کے ہاتھ میں رکھا تو انھوں نے کہا کہ کتنا زیادہ نرم ہے یہ ہاتھ، اگر کل کے دن وہ اللہ کے عذاب سے بھی بچ جائے (یالها من کف ما الینها، إن نجت غداً من عذابِ اللہ عزوجل)

اس کے بعد خلیفہ نے فضیل سے کہا کہ کچھ نصیحت کیجئے۔ انھوں نے تلخ نصیحت کے انداز میں کچھ کلمات کہے۔ خلیفہ نے کہا کہ اور کچھ فرمائیے۔ فضیل نے مزید کچھ کہا۔ اس طرح وہ سخت تنقیدی انداز میں دیر تک خلیفہ کو ڈرانے والی باتیں کہتے رہے۔ خلیفہ ان کی نصیحتوں کو سن کر رو پڑا۔ آخر میں اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ جب تم مجھ کو کسی آدمی کے پاس لے جاؤ تو اسی طرح کے آدمی کے پاس لے چلو۔ یہ مسلمانوں کے سردار ہیں (اذا دللتنی علی رجل فدلنی علی مثل هذا، هذا سیّدُ المسلمین)

آدمی کے اندر اگر صحیح مزاج ہو تو وہ نصیحت کو سن کر اس سے سبق لے گا، خواہ یہ نصیحت کتنے ہی سخت تنقیدی الفاظ میں کی گئی ہو۔ ایسا آدمی نصیحت کو اس کے معنوی اعتبار سے دیکھے گا نہ کہ اس کے لفظی اعتبار سے، وہ اس کو اصولی حیثیت سے لے گا نہ کہ ذاتی حیثیت سے۔

صحیح مزاج اگر بادشاہ کے اندر ہو تو وہ بھی تنقید کو سن کر اسے برداشت کرے گا۔ اور ایک معمولی آدمی بھی اگر صحیح مزاج نہ رکھتا ہو تو وہ تنقید کو سن کر بگڑ جائے گا۔ تنقید کسی آدمی کو پہچاننے کی سب سے زیادہ یقینی کسوٹی ہے۔ تنقید کو سن کر جو آدمی اپنے ذہنی توازن کو نہ کھوئے وہی اعلیٰ انسان ہے۔ اور جو شخص تنقید کو سن کر بگڑ جائے، اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ انسان والی خصوصیات رکھتا ہے۔

تنقید کسی آدمی کی انسانیت اور اس کے تقویٰ کی پہچان کراتی ہے۔

مومنانہ طریقہ

مولانا شبلی نعمانی (۱۹۱۴ - ۱۸۵۷) کی آخر زندگی میں یہ حادثہ پیش آیا کہ گھر میں بھری ہوئی بندوق چل گئی جس کی وجہ سے ان کا ایک پاؤں شدید طور پر زخمی ہوا اور بالآخر اس کو ڈاکٹروں نے کاٹ دیا۔ اس حادثہ پرست شاعروں نے طرح طرح کے مضامین باندھے۔ کسی نے کہا "ہمت کا قدم زمیں پہ گاڑ دیا" کسی نے کہا "سیرت نگار نبوی نے حوروں کی پابوسی کے لیے پہلے ہی سے قدم بھیج دیا" وغیرہ۔ مگر خود مولانا شبلی کے جذبات دوسرے تھے۔ انھوں نے اپنے اس حادثہ پر یہ شعر کہا :

شبلیؔ نامہ سیہ را بجزاے عملش پا بریدند وصدا خاست کہ سر می باید

یعنی شبلی کے سیاہ اعمال کی وجہ سے اس کا پاؤں کاٹ دیا گیا تو اوپر سے آواز آئی کہ پاؤں نہیں سر کی ضرورت ہے۔

یہی مومن کا طریقہ ہے۔ مومن کبھی دوسروں کی تعریف سے غلط فہمی میں نہیں پڑتا۔ عین اس وقت جب کہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اس کی اندرونی نفسیات اس کو اپنی بے حقیقتی یاد دلاتی ہے۔ جب اس کے نام پر استقبالیہ پیش کیا جاتا ہے تو وہ برعکس طور پر اپنے ذاتی احتساب میں مشغول ہو جاتا ہے۔

دوسروں کی تعریف سے اپنی شخصیت کے قد کو ناپنا انتہائی سطحیت کی بات ہے، اور مومن سب سے زیادہ اس سطحیت سے دور ہوتا ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے جانچے نہ کہ انسان کی نسبت سے۔ اور جو شخص اپنے آپ کو خدا کی نسبت سے جانچے وہ کبھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہو سکتا۔

تعریف مومن کی تواضع کو بڑھاتی ہے، اور جو غیر مومن ہو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ تعریف سے صرف اس کے جھوٹے پندار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے کو قابل تعریف سمجھنا، اپنے آپ کو خدا کا ہمسر بنانا ہے۔ اور خدا کا ہمسر بننا، بلاشبہ کسی انسان کا سب سے بڑا جرم ہے۔

مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہر موقع پر خدا یاد آتا ہے۔ مذمت کا پہلو ہو یا تعریف کا، ہمیشہ وہ خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جب کوئی شخص اس کی تعریف کرتا ہے تو وہ عین اپنے مزاج کی بنا پر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے جو تمام بڑوں سے زیادہ بڑا ہے۔ خدا کی عظمت کا احساس اس سے ذاتی عظمت کے احساس کو چھین لیتا ہے۔ تعریف اس کی تواضع کو بڑھانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

۹ الرسالہ دسمبر ۱۹۹۴

ماضی اور حال

مسیح الملک حکیم اجمل خاں (۱۸۶۴-۱۹۳۰) کو طب اور علاج میں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ لارڈ ہارڈنگ ۱۹۱۰ سے ۱۹۱۶ تک ہندستان کے وائسرائے تھے۔ حکیم اجمل خاں کی شہرت سے متاثر ہو کر وائسرائے نے اپنے پرائیویٹ سکریٹری کو ان کے پاس طبی مشورہ کے لیے بھیجا۔ وہ دہلی میں ان کے مطب میں آئے تو دیکھا کہ وسیع مطب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ سکریٹری پر اس کا بہت اثر ہوا۔ واپس جاکر اس نے وائسرائے سے اس کا ذکر کیا۔ وائسرائے نے کہا کہ وہ ہندستان کے مقناطیس ہیں:

He is the magnet of India.

حکیم اجمل خاں کی اسی عظمت و مقبولیت کا یہ نتیجہ تھا کہ جب وہ قومی سیاست میں داخل ہوئے تو اس کے اندر انھوں نے مرکزی مقام حاصل کر لیا۔ دہلی میں ان کے مکان (شریف منزل) میں وقت کی بڑی بڑی شخصیتیں جمع ہوتی تھیں۔ مثلاً پنڈت موتی لال نہرو، بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، سی آر داس، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی، ڈاکٹر محمد اقبال، وغیرہ۔ حکیم صاحب نے مسلم ملکوں کے علاوہ انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریلیا وغیرہ کے سفر بھی کیے۔

یہ اس زمانہ کی بات ہے جب کہ جدید میڈیکل سائنس ابھی اپنے عروج کو نہیں پہونچی تھی۔ اس زمانہ میں ابھی طب کی اہمیت پوری طرح باقی تھی۔ اس وقت مسلمان فن طب کے امام تھے۔ آج ان کی یہ حیثیت ختم ہو چکی ہے۔ روایتی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے آگے تھے، سائنسی طب کے زمانہ میں وہ دنیا سے پیچھے ہو گیے۔

سائنس اور سائنسی طب میں مسلمانوں کی اس پسماندگی کی ذمہ داری تمام تر مسلم رہناؤں پر ہے۔ علماء نے مذہبی بنیاد پر اور لیڈروں نے سیاسی بنیاد پر اور کچھ "مفکرین" نے نظریاتی بنیاد پر مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم میں کم از کم ایک سو سال دنیا سے پیچھے ہو گیے۔

علم کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کے بعد مشرک قیدیوں کے ذریعہ مسلمان بچوں کو تعلیم دلائی۔ حقیقت یہ ہے کہ علم ہر حال میں مطلوب ہے۔ کسی بھی عذر کی بنا پر علم سے روکنا ہرگز جائز نہیں۔

لکھنؤ کا سفر

لکھنؤ میں انسٹی ٹیوشن اسلامک ویلفیر سوسائٹی (الجمعیۃ الخیریہ لمساعدۃ الطلاب) کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے۔ اس کے صدر مولانا ظہیر احمد صدیقی ندوی ہیں۔ مولانا طارق انور خاں ندوی اس کے سکریٹری جنرل ہیں اور مولانا زبیر ملک فلاحی اس کے آرگنائزر ہیں۔ اس ادارہ نے ۲۹ فروری۔ یکم مارچ ۱۹۹۲ کو لکھنؤ میں ایک علمی سیمینار کیا۔ اس کا عنوان تھا: "مدارس اسلامیہ ہند کا ماضی، اور مستقبل کے امکانات ——— فراہمی قیادت کے پس منظر میں" اس کی دعوت پر لکھنؤ کا سفر ہوا۔

۲۸ فروری کو روانگی سے کچھ پہلے ایک مسلم صحافی میرے پاس آئے۔ وہ دہلی میں اوکھلا کے علاقہ میں رہتے ہیں۔ وہ مسلم مسائل پر مجھ سے انٹرویو لینا چاہتے تھے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو میں سفر پر جا رہا ہوں، اس لیے کوئی مفصل انٹرویو نہیں دے سکتا۔ انھوں نے مختصر پیغام پوچھا۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل صبر و اعراض ہے۔

انھوں نے کہا کہ آپ ہمیشہ صبر کی بات کرتے ہیں۔ آخر صبر کب تک کیا جائے۔ میں نے کہا کہ ابھی تو آپ حضرات نے صبر کا آغاز بھی نہیں کیا۔ پھر اس کی حد کا کیا سوال ہے۔ مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ پرسوں سے جامعہ ملیہ میں ہڑتال چل رہی ہے۔ تمام دفاتر بند ہیں۔ طلبہ تعلیم کو چھوڑ کر ادھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ طلبہ کی یونین کے ایک صاحب وائس چانسلر آفس میں گئے۔ وہاں انھوں نے اپنا خط ٹائپ کرانا چاہا۔ ٹائپسٹ نے کہا کہ ہمارا ٹائپ رائٹر خراب ہے۔ اس پر ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ یہاں تک کہ چار آدمی زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گئے اور جامعہ غیر معینہ مدت تک کے لیے بند ہو گئی (قومی آواز ۲۶ فروری ۱۹۹۲)

کیا یہی صبر ہے۔ صبر یہ تھا کہ ٹائپسٹ نے جب عذر کیا تو آپ اپنا خط لے کر بازار چلے جاتے اور وہاں ٹائپ کرا لیتے۔ ایک روپیہ کے کام کے لیے آپ حضرات لڑ گئے اور ملی ادارہ کو اتنا بڑا نقصان پہنچایا جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جو لوگ معمولی معمولی باتوں میں لڑ جائیں ان کا یہ کہنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ صبر کب تک کیا جائے۔ اور صبر کی حد کب آئے گی۔ جواب یہ ہے

رصبر شروع کرنے کے بعد صبر کی حد آتی ہے۔ جب صبر شروع ہی نہ کیا جائے تو اس کی حد کیسے آجائے گی۔
انھوں نے کہا کہ یہ تو چند لڑکوں کی بات تھی، وہ تمام لوگوں کی بات نہیں۔ میں نے کہا کہ شریعت کے اصول کے مطابق، وہ تمام لوگوں کی بات ہے۔ کیوں کہ دوسرے لوگوں نے اس کی مذمت نہیں کی۔ تمام لکھنے اور بولنے والے لوگ اس بارہ میں خاموش ہیں۔ اس طرح خاموش رہ کر وہ بالواسطہ طور پر ان بے صبر نوجوانوں کی حمایت کر رہے ہیں۔

۲۸ فروری کو ڈھائی بجے سہ پہر کا وقت ہے۔ میں پالم ایر پورٹ کی انتظار گاہ میں ایک سیٹ پر بیٹھا ہوں۔ چند آدمی سامنے کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بے فکری کے ساتھ سگریٹ کے دھوئیں اڑا رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یہ لوگ اتنے بے فکر کیوں ہیں۔ میرے دل نے کہا کہ ان کی بے فکری کی وجہ یہ ہے کہ انھیں حال کی خبر ہے، مگر انھیں مستقبل کی کوئی خبر نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگلے لمحہ وہ جس جہاز پر بیٹھنے والے ہیں وہ ان کو لے کر ان کی مطلوب منزل کی طرف پرواز کرنے والا ہے۔ اگر وہ جانیں کہ ان کا سفر انسانی منزل کی طرف نہیں بلکہ خدائی منزل کی طرف ہے۔ یہاں کا ہر سفر آخر کار آخرت کا سفر ہے۔ ہر سفر اپنے خاتمہ پر وہاں پہنچنے والا ہے جہاں آدمی کو خدا کے سامنے جواب دہی کے لیے کھڑا ہونا ہوگا۔ اگر ان کو اس کا احساس ہو تو سگریٹ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جائے اور ان کو محسوس ہو کہ آنے والا جہاز انڈین ایر لائنز کا جہاز نہیں ہے بلکہ خدائی ایر لائنز کا جہاز ہے۔ اس کو کوئی انڈین پائلٹ نہیں چلا رہا ہوگا، بلکہ وہ خدا کا جہاز ہے جس کے پائلٹ فرشتے ہوں گے اور وہ اس کو دنیا سے اٹھا کر آخرت میں پہنچا دے گا۔ اگر لوگوں کو اس حقیقتِ کبریٰ کا احساس ہو تو ان کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔

جہاز میں میری سیٹ کے قریب بہار گورنمنٹ کے دو افسر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا: "لگتا ہے کہ گورنر (بہار) بھی اسی سے جانے والے ہیں۔ کوئی جانے والا ہے ضرور۔ اسی لیے آگے کی تین سیٹ خالی کی ہوئی ہے"۔ میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا میں کسی کو آگے کی سیٹ اس لیے ملتی ہے کہ وہ "گورنر" ہے۔ آخرت میں آگے کی سیٹ اس شخص کو ملے گی جو اللہ کی خاطر دنیا میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے راضی ہو گیا۔

یہ جہاز (نمبر ۴۰۹) لکھنؤ، پٹنہ ہوتا ہوا کلکتہ جا رہا ہے۔ جہاز دہلی سے روانہ ہوا تو اعلانات

شروع ہوئے۔ اس میں سے ایک اعلان یہ تھا کہ داخلی پروازوں میں سگریٹ پینا منع ہے:

smoking is prohibited on domestic flights

یہ بظاہر ایک چھوٹی بات ہے۔ مگر یہ چھوٹی بات ایک بڑی بات کی علامت ہے۔ یہ دراصل ہندستانی تہذیب پر مغربی تہذیب کی برتری کا اعلان ہے۔ ہندستان داخلی پروازوں میں اپنی تہذیب کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر بین اقوامی پروازوں میں بیرونی مسافروں کے دباؤ کی وجہ سے ہندستان کے لیے ممکن نہیں رہتا کہ وہ اپنی تہذیبی قدروں کو برقرار رکھ سکے۔

اس دنیا کی ایک سنگین حقیقت یہ ہے کہ یہاں کسی اقدام کا نتیجہ اقدام کرنے والے کی نیت کے اعتبار سے نہیں نکلتا بلکہ خارجی حالات کے اعتبار سے نکلتا ہے۔ اس کی ایک عبرت انگیز مثال انڈین ایرلائنز کا معاملہ ہے۔

۱۹۹۰ میں انڈین ایرلائنز کو ۴۴ کروڑ روپیہ کا گھاٹا ہوا تھا۔ اس گھاٹے کو ختم کرنے کے لیے جہاز کے کرایہ میں اضافہ شروع کیا گیا۔ حتیٰ کہ مجموعی طور پر ۲۱۰ فی صد تک کرایہ کی شرح میں اضافہ کر دیا گیا۔ لیکن یہ اقدام الٹا نتیجہ پیدا کرنے والا (Counter-productive) ثابت ہوا۔ ۹۲-۱۹۹۱ کے مالی سال میں ایرلائنز کا گھاٹا مزید بڑھ کر ۲۰۰ کروڑ روپیہ تک پہنچ گیا (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ مارچ ۱۹۹۲)

اس الٹے نتیجہ کا سبب کیا تھا۔ اس کا سادہ سا سبب یہ تھا کہ کرایہ میں غیر معمولی اضافہ کے بعد ہوائی مسافروں کی تعداد کم ہو گئی۔

دہلی سے جہاز ساڑھے تین بجے روانہ ہوا۔ اور ٹھیک ۴۵ منٹ بعد وہ لکھنؤ کے ہوائی اڈہ پر اتر گیا۔ اس وقت میری عجیب کیفیت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ ۴۵ منٹ کا یہ سفر طے کرنے کے لیے جو بے شمار اسباب درکار ہیں ان کے مہیا ہونے میں ۴۵ بلین سال سے بھی زیادہ وقت لگا ہے۔ اس سلسلہ کی مختلف کائناتی معلومات میرے ذہن میں ایک چلتی ہوئی ریل کی طرح گھومنے لگیں۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا: اس حیرت انگیز کائنات کا ایک خدا ماننا محض بے عقلی کا عقیدہ نہیں۔ یہ ناقابل فہم کے مقابلہ میں قابل فہم کا انتخاب کرنا ہے۔ یہ سب سے زیادہ منطقی تصور ہے جو کوئی صاحب علم آدمی اس دنیا میں اختیار کر سکتا ہے۔

ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہو کر ہوٹل گلمرگ پہنچا۔ میرا قیام ہوٹل کے کمرہ نمبر ۱۰۱ میں تھا۔ شام

کو میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا کچھ لکھ پڑھ رہا تھا کہ اچانک اللہ اکبر، اللہ اکبر کی آوازیں فضا میں گونجنے لگیں۔ معلوم ہوا کہ لاؤڈ اسپیکر پر مختلف مسجدوں سے مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔ دہلی سے روانہ ہونے کے وقت ایک صاحب نے کہا تھا کہ آپ لکھنؤ جا رہے ہیں، وہاں تو آج کل بی جے پی (ہمارے ہندوؤں) کی حکومت ہے۔ فضا میں اذان کے الفاظ گونج رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ لوگ کتنا کم باتوں کو جانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر حکومت کی ایک حد ہوتی ہے، اپنی حد پر پہنچ کر ہر حکومت غیر مؤثر ہو جاتی ہے۔ اور جہاں کسی حکومت کی حد ختم ہوتی ہے، اس کے بعد اتنی ہی وسیع دنیا باقی رہتی ہے جتنا لکھنؤ کے گورنمنٹ ہاوس کے مقابلہ میں آفاق کی وسعتیں۔

۲۹ فروری کو فجر کی نماز لکھنؤ کی "مسجد نوازی" میں پڑھی۔ یہ مسجد مولانا محمد علی لین میں واقع ہے۔ ایک تنگ اور ناہموار گلی سے گزرتے ہوئے ہم مسجد کے دروازے پر پہنچے۔ چھوٹی مسجد میں تقریباً ڈیڑھ صف کی جماعت تھی۔ اس "لین" کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ انڈیا کی بہت سی سڑکوں پر آج بھی مولانا محمد علی کے نام کا بورڈ لگا ہے۔ تاہم ان سڑکوں کی سرگرمیوں پر ان کی کوئی چھاپ نہیں۔

ہوٹل گلمرگ کے اوپر وسیع چھت ہے۔ اس پر گھاس اگائی ہوئی ہے اور چاروں طرف گملے رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح یہاں مصنوعی طور پر قدرت کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اس چھت پر شامیانہ کے اندر سمینار کی کارروائیاں ہوئیں۔ ۲۹ فروری کو صبح و شام دو اجلاس ہوئے۔ اور یکم مارچ کو صبح اور شام دو اجلاس۔ زیر بحث موضوع پر شرکاء نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس کے بعد ہر مقالہ پر سوال و جواب ہوا۔ منتظمین کی خوش سلیقگی ہر جزء سے نمایاں تھی۔

مولانا محمد فاروق سلطان پوری بھی اس سمینار میں شریک تھے۔ وہ ایک روحانی مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سننا بہت روحانی سکون کا باعث ہوتا ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

گلوں میں بو نہ ملی سنگ میں شرر نہ ملا مرا مذاق جدا تھا کہ ہم سفر نہ ملا

ایک گفتگو کے درمیان مولانا فاروق صاحب نے کہا کہ ایک بھکاری بھیک مانگ رہا تھا۔ اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا۔ اتفاق سے اس راہ گیر کی جیب میں اس وقت پیسے موجود نہ تھے۔ اس کو بھکاری پر ترس آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بھکاری کو اپنے سینہ سے لگا لیا۔ بھکاری اس سے اتنا

زیادہ متاثر ہوا کہ اس کی زبان سے نکلا: بھگوان جتنا تو نے آج دلایا اتنا تو کبھی نہیں دلایا تھا۔
آدمی کے پاس اگر دوسروں کے لیے کوئی مادی چیز نہ ہو۔ مگر اس کے دل میں دوسروں کے لیے سچی محبت ہو، تو اس کی یہ محبت یقیناً فاتح عالم بن جائے گی۔
مولانا فاروق صاحب ہندی میں ایم اے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ لکھنؤ کے علاقہ میں بس سے سفر کر رہے تھے۔ بس میں ایک ہندو سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران دونوں کو ایک دوسرے سے دل چسپی ہو گئی۔ مولانا فاروق صاحب نے اس ہندو بھائی کا پتہ لکھ لیا اور کہا کہ میں کبھی آپ کے پاس آؤں گا۔
اس کے بعد ایک سفر کے دوران مولانا فاروق صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مذکورہ ہندو کے گاؤں میں گئے۔ رات ہو چکی تھی۔ پوچھتے ہوئے ہندو کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ہندو بھائی گھر پر موجود نہیں ہیں۔ وہ کہیں چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر کی حیص بیص کے بعد ایک اور ہندو نے آکر ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا کہ اب رات ہو گئی ہے اس لیے آپ یہیں ٹھہریے۔ انھوں نے پوچھا کہ کوئی مسلمان یا کوئی مسجد یہاں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں نہ کوئی مسلمان ہے اور نہ کوئی مسجد۔ ہندو نے گھر کے ایک حصہ میں سب لوگوں کو ٹھہرایا۔ انھیں کھانا کھلایا۔ اس کے بعد وہ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر سو گئے۔
صبح کو نماز فجر کے بعد وہ ہندو دوبارہ آیا۔ اس نے مولانا فاروق اور ان کے ساتھیوں کو دیہات کے طریقہ پر ناشتہ کرایا۔ جب وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے تو ہندو نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میرا اس خاندان سے تعلق نہیں ہے۔ البتہ میں ان کا پڑوسی ہوں۔ رات کو جب آپ لوگ یہاں آئے تو گھر کی عورتوں نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ کچھ مسلمان آئے ہیں۔ رات کی وجہ سے ان کو لوٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ ہم ان کو جانتے بھی نہیں کہ وہ کون ہیں، ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ مذکورہ ہندو نے گھر کی عورتوں سے کہا کہ ان لوگوں کو کھانا کھلا کر یہاں سُلا دو۔ کیوں کہ یہ ہمارا انسانی فریضہ بنتا ہے۔ البتہ جہاں تک ان کی طرف سے ڈر کا سوال ہے تو میں آج کی رات نہیں سوؤں گا۔ رات بھر پہرہ دوں گا۔ چنانچہ آج میں رات بھر لاٹھی لے کر پہرہ دیتا رہا ہوں۔
ان لوگوں نے ایک طرف نو وارد مسلمانوں کے ساتھ انسانی فرض ادا کیا۔ دوسری

طرف ان کے امکانی خطرہ سے بچنے کے لیے رات بھر اٹھی سے کر مبہوت رہتے رہے۔

۱۹۴۷ کے بعد پہلی اہم ترین مسلم کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ تقسیم کے بعد جو نئے حالات پیدا ہوئے اس میں مخصوص اسباب کے تحت ہندستان کے تمام مسلمان مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف دیکھنے لگے۔ فطری طور پر وہ مسلمانوں کے واحد قابل اعتماد لیڈر بن گئے۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں "ملک کے مختلف گوشوں سے خطوں اور تاروں کی مجھ پر بارش ہونے لگی۔ ہر طرف سے تقاضا ہونے لگا کہ موجودہ حالت میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا چاہیے"

چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی دعوت پر دسمبر ۱۹۴۷ کے آخر میں لکھنؤ میں مسلم کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس میں مولانا آزاد نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ ہمیں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کو کون سا رخ اختیار کرنا ہے، آج ہمارے لیے صحیح راستہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

"مسلمانوں کے موجودہ حالات اور ملک کے مستقبل کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ کوئی ضروری چیز نہیں ہو سکتی کہ جہاں تک ملک کی سیاسی زندگی کا تعلق ہے، فرقہ پرستی کو جو مذہب کے نام سے ابھاری گئی ہے، ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔ کسی ایک گوشہ کی فرقہ پرستی نہیں، کسی ایک جماعت کی فرقہ پرستی نہیں، سب کی فرقہ پرستی۔ (الجمعیۃ ویکلی ۲۴ مارچ ۱۹۹۳)

مولانا ابوالکلام آزاد نے مزید کہا کہ ہمیں فرقہ پرستی کے دروازہ کو بند کرنا پڑے گا، ورنہ ہماری موجودہ مشکلات ہرگز ختم ہونے والی نہیں۔ فرقہ پرستی کا خاتمہ کیے بغیر مسلمانوں کی فلاح کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔

میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ حالات میں یہ سب سے زیادہ اہم بات تھی جو ۴۵ سال پہلے لکھنؤ میں کہی گئی۔ مگر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ یہ مقصد ایک فی صد کے بقدر بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے مسلسل عمل کی ضرورت تھی۔ مولانا آزاد نے یہ کہا مگر کسی نامعلوم سبب سے انھوں نے اس کے لیے عملی جدوجہد نہیں کی۔ آزادی کے بعد مولانا آزاد گیارہ سال تک زندہ رہے۔ وہ اگر وزیر تعلیم بننے کے بجائے یہ کرتے کہ اخبار الہلال کو دوبارہ جاری کرتے اور اس کے ذریعہ یہ کوشش کرتے کہ لوگوں میں غیر فرقہ وارانہ سوچ پیدا کریں تو یقینی ہے کہ گیارہ سال میں وہ ایک

ذہنی انقلاب پیدا کر دیتے۔ مگر انھوں نے لوگوں میں ذہنی تبدیلی لانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ۱۹۴۷ کے بعد کے حالات نے مولانا آزاد کو اجارہ داری کی حد تک بہترین مواقع کار دے دیے تھے۔ مگر وہ ان کو استعمال نہ کر سکے اور لوگوں کی بگڑی ہوئی سوچ بدستور اسی طرح بگڑی ہوئی حالت میں پڑی رہی۔

جس "ندوہ ملیہ" میں شرکت کے لیے میرا لکھنؤ کا سفر ہوا تھا، وہ ۲۹ فروری۔یکم مارچ ۱۹۹۲ کو ہوئی۔ اس کا مرکزی موضوع تھا: مدارس اسلامیہ ہند کا ماضی، اور مستقبل کے امکانات، فراہمی قیادت کے پس منظر میں۔ علماء اور اساتذہ اور دانشوروں نے اس موضوع پر اپنے خیالات پیش کیے۔ شرکاء زیادہ تر اس مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے جو اپنے کو "انقلابی اسلام" کا علم بردار سمجھتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کے اظہار خیال پر زیادہ تر یہی نقطۂ نظر چھایا رہا۔ اصولی نقطۂ نظر کی ترجمانی کم ہوئی اور گروہی نقطۂ نظر کی ترجمانی زیادہ۔ تاہم منتظمین کی سوچ میں اعتدال اور آفاقیت نظر آئی۔

یکم مارچ کی شام کو (چوتھے سشن میں) میرا مقالہ تھا۔ اصل مقالہ بہت لمبا ہو گیا تھا، اس لیے میں نے ۴۰ منٹ کی تقریر میں اپنے خیالات کو پیش کیا۔ میں نے کہا کہ تحفظ ملت کے میدان میں علما نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ میں وسیع تر قیادت کے میدان میں وہ قائدانہ کردار ادا نہ کر سکے۔ پھر میں نے کہا کہ قائدانہ کردار سے مراد حقیقۃً داعیانہ کردار ہے۔ داعیانہ کردار کے سلسلہ میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ مواقع کو تلاش کر کے انھیں دعوتی مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔ موجودہ زمانہ میں دعوت کے بے پناہ مواقع پیدا ہو گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان کو معلوم کر کے انھیں استعمال کیا جائے۔

تقریر کے بعد حسب قاعدہ لوگوں نے سوالات کیے۔ مگر سوالات زیادہ تر جزئی نوعیت کے تھے۔ میں نے اپنے جواب میں ان کی وضاحت اصولی انداز میں کی۔ (میرا یہ مقالہ کسی قدر اضافہ کے ساتھ الرسالہ جولائی ۱۹۹۲ میں خصوصی نمبر کے طور پر شائع ہو چکا ہے)

میں نے اپنی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات کہی کہ اسلام کا سب سے زیادہ طاقتور پہلو اس کا دعوتی پہلو ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے مزید نہایت موافق امکانات پیدا ہو گئے ہیں جن کو استعمال کر کے نہایت کامیابی اور تیز رفتاری کے ساتھ اسلامی دعوت کا کام کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں اپنی بات کو واضح کرنے کے لیے میں نے کئی مثالیں دیں۔ مثلاً میں نے بتایا کہ بنارس ہندو یونی ورسٹی کے ایک ہندو طالب علم نے اپنی ریسرچ کے لیے یہ مضمون لیا کہ ہندو ازم میں خدا کا تصور (The concept of God in Hinduism)۔ اس ہندو طالب علم کے ہندو پروفیسر نے کہا کہ ہندوؤں میں تو ۳۳ کروڑ گاڈ ہیں اور گاڈ کے بچے بھی سب گاڈ ہیں۔ پھر تم کہاں تک ریسرچ کرو گے اور کب تمہارا مقالہ مکمل ہوگا۔ تم اگر خدا پر ریسرچ کرنا چاہتے ہو تو بہتر ہے کہ اسلام میں خدا کا تصور (The concept of God in Islam) کا مضمون لے لو۔ طالب علم نے ایسا ہی کیا اور ہندو یونی ورسٹی سے اس کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی مل گئی۔

اس طرح کی مثالیں میں نے دعوت اسلامی کے امکانات و مواقع بتانے کے لیے دی تھیں مگر ایک مسلمان بزرگ جو اسلامی دعوت کا مطلب اسلامی جہاد سمجھتے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ سب تو نکتے ہیں۔ اور پھر اس کے خلاف ایک پرجوش تقریر شروع کر دی۔

اس طرح کے تجربات مجھے بار بار ہوئے ہیں۔ ان سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا جو پڑھا لکھا طبقہ ہے اس کا ذہنی شاکلہ بگڑ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے اصل باتیں اس کو حقائق کے روپ میں نظر آتی ہیں اور جو حقیقی باتیں ہیں وہ اس کو اس طرح دکھائی دیتی ہیں گویا کہ وہ صرف نکتے ہوں، جن کو قابل لحاظ سمجھنے کی ضرورت نہیں۔

مسلم علماء اور دانشوروں کے متعلق میرا تجربہ ہے کہ ان کا فکر شخصیتوں کے گرد گھومتا ہے نہ کہ حقیقۃً قرآن و حدیث کے گرد۔ اس کا مظاہرہ اس سیمنار میں بھی ہوا۔ کئی لوگوں کو میں نے دیکھا کہ وہ اپنی تقریر یا اظہار خیال میں اقبال کے اشعار کا حوالہ اس طرح دیتے رہے جیسے کہ اس کی حیثیت بھی قرآن و حدیث کی طرح ایک معتبر ماخذ کی ہے اور کسی نقطۂ نظر کے حق میں اقبال کا تائیدی شعر مل جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ نقطۂ نظر صحیح اسلامی نقطۂ نظر ثابت ہو گیا۔ حالانکہ یہ ایک غیر علمی طریقہ ہے جو علمی مجلس کے لیے ہرگز موزوں نہیں۔ (اقبال کو قرآن اور احادیث کے معیار پر [illegible] اشعار [illegible] اسلامی نقطۂ نظر کیوں نہ ہوا)

میں نے اپنی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ قائدانہ کردار سے مراد داعیانہ کردار ہے۔ اس سلسلہ میں متعین تجویز کے طور پر میں نے کہا کہ آپ لوگوں کو دوبارہ اسی قسم کا ایک ادارہ قائم کرنا چاہیے جو اقبال نے لاہور میں قائم کیا تھا مگر وہ زندہ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا کہ ۱۹۷۱ میں میں لاہور گیا تھا۔

اسلامی شاعر تھے۔

وہاں میری ملاقات پروفیسر یوسف سلیم چشتی (۱۹۸۴-۱۸۸۹) سے ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال نے دعاۃ اور مبلغین کی تیاری کے لیے اشاعت اسلام کالج کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ یوسف سلیم چشتی کو اس کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔ اس میں چار سال کا کورس تھا جس میں مختلف زبانیں، تاریخ مذاہب اور تقابل ادیان وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ یہ ایک بے حد مفید کام تھا۔ مگر اقبال خود تو شعر گوئی میں مشغول رہے اور اس کام کو دوسروں کے ذمہ کر دیا۔ چنانچہ یہ ادارہ چار سال میں ٹوٹ گیا۔ اقبال اگر خود اپنے آپ کو اس میں وقف کرتے تو یہ ادارہ شاید ایک تاریخ ساز ادارہ ثابت ہوتا۔

جب میں نے یہ بات کہی تو اچانک لوگ بھڑک اٹھے۔ ساری گفتگو اس پر چل پڑی کہ اقبال جیسی عظیم شخصیت پر آپ نے تنقید کیوں کر دی۔ اصل بات (اشاعت اسلام کالج کا دوبارہ قیام) پس پشت چلا گیا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے وہ آیت یاد آئی جس میں ہدایت یافتہ اور صاحب عقل ہونے کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ آدمی بات کو غور سے سنے اور پھر کلام کے بہتر مفہوم کی پیروی کرے (الزمر ۱۸)

مسلم علماء اور دانشوروں کی مجالس میں میں نے بار بار یہ بات دیکھی ہے کہ ان میں یہ مزاج موجود نہیں۔ ان کو یہ مزاج نہ قرآن سے ملا اور نہ علم سے۔ تاہم منتظمین سمینار صحت مند نقطۂ نظر کے حامل نظر آئے۔

علماء اسلام کی قائدانہ سرگرمیاں بے نتیجہ کیوں ہو گئیں۔ اس کا جواب اس حدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے جو صحیح ابن حبان میں ابوذر رضی اللہ عنہ کے واسطے سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں مومنِ عاقل کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو جاننے والا ہو (ان یکون بصیرا بزمانہ)

اس معاملہ میں یہی اصل نکتہ کی بات ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ علماء کے قائدانہ عمل کے باوجود نتیجہ نہ ملنے کا واحد فیصلہ کن سبب یہ تھا کہ وہ اپنے زمانہ کے حالات سے بے خبر تھے۔ مجھے ان علماء کے اخلاص اور دیانت داری میں شبہ نہیں۔ مگر کسی کا اخلاص اس کے لیے سنت اللہ کا بدل نہیں بن سکتا۔ اخلاص کے باوجود ان کی جد و جہد میں زمانی بصیرت شامل نہ تھی۔ یہی وہ کمی ہے جس نے ان کی کوششوں کو آخری حد تک بے نتیجہ بنا دیا۔

انھوں نے بصیر زمانہ بنے بغیر قائد زمانہ بننے کی کوشش کی۔ زمانہ کی تبدیلی از سر نو تیاری کا تقاضا کر رہی تھی۔ مگر وہ تیاری کے بغیر اپنی موجودہ حالت کے ساتھ ہی، اقبال کے الفاظ میں، بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑے۔ یہ بلاشبہ ایک کوتاہی تھی۔ اور جو لوگ ایسی کوتاہی کریں

وہ موجودہ اسباب کی دنیا میں کبھی کسی حقیقی نتیجہ کو ظہور میں نہیں لا سکتے۔

اس سیشن کے صدر مولانا محمد فاروق خاں صاحب تھے۔ انھوں نے آخر میں مفصل تقریر کی۔ انھوں نے شرکاء کے اس غیر علمی انداز پر سخت تنقید کی کہ میری بات کو اپنے مفہوم میں لے کر میرے خلاف بے معنی تقریر کرتے رہے۔ ایک اور صاحب، جناب یمین الاسلام خاں انجینیر نے کہا: یہ لوگ تو آپ کے خلاف اس طرح بول رہے تھے جیسے کہ وہ پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھے ہوں۔

مولانا محمد فاروق خاں صاحب نے میرے نقطۂ نظر کی مکمل تائید کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں معترضین کا تفصیلی جواب دیا۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمارا یہ حال ہے کہ لوگوں کے اندر ہم ان دروازوں سے داخل ہونا چاہتے ہیں جہاں ان کی طرف سے پہرے دار بیٹھے ہوئے ہیں۔ مثلاً فخر کا دروازہ، مفاد کا دروازہ، قومی مفاد کا دروازہ، یہ سب دروازے بند ہیں۔ مگر دل کے دروازہ پر کوئی پہرے دار نہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہم بند دروازوں پر اپنا سر پٹک رہے ہیں۔ مگر کھلے دروازہ سے لوگوں کے اندر داخل ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

یہاں مدارس عربیہ سے تعلق رکھنے والے کئی اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ ان سے گفتگو کے بعد یہ ذہن تازہ ہو گیا کہ مدارس عربیہ کی بنیادی کمزوری ان کا محدود ذہن ہے۔ لکھنؤ کے ندوہ سمیت، تمام مدارس اسی محدود دائرہ میں سوچ پاتے ہیں۔ اسی لیے ایک ایک صدی گزر جانے پر بھی ان کے یہاں کوئی حقیقی ارتقاء نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں مجھے متعدد تجربے پیش آئے ہیں۔ الجمعیۃ ویکلی سے وابستگی کے زمانہ میں میں نے ندوہ کے ذمہ دار اعلیٰ کو ایک خط لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ چند مہینہ ندوہ میں قیام کر کے "قرآن اور فکر جدید" کے موضوع پر طلبہ کو تیار کروں۔ اس کی صورت میں نے یہ تجویز کی کہ مجھے ندوہ کے احاطہ میں صرف ایک کمرہ قیام کے لیے دے دیا جائے۔ اس کے بعد تمام اخراجات یا انتظام میرے ذمہ ہوگا۔ میں روزانہ مقرر وقت پر درس دوں گا۔ طلبہ کو آزادی ہوگی کہ جو چاہے شرکت کرے اور جو چاہے شرکت نہ کرے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ اس سلسلہ میں آپ کی ہر شرط کو میں بلا بحث ماننے کے لیے تیار ہوں۔ مگر ندوہ کے ذمہ دار اس پروگرام کو شروع کرنے کی اجازت نہ دے سکے۔

اسی طرح میں نے جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ کے ذمہ داروں کو بھی پیش کش کی اور ان سے بھی یہی کہا کہ میں قیام کے لیے ایک کمرہ کے سوا اور کسی قسم کی کوئی چیز آپ سے نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے ابتداءً پسندیدگی کا اظہار کیا۔ مگر اس کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ اسی طرح اور بھی بعض مدارس کو میں نے اسی قسم کی پیش کش کی مگر کسی کی طرف سے مثبت جواب نہیں ملا۔

مدارس کی تمام شرطوں کو میں یک طرفہ طور پر ماننے کے لیے آمادہ تھا، اس کے باوجود انھوں نے کیوں اس بے ضرر پروگرام کو منظور نہیں کیا، اس کی وجہ فکری جمود کے سوا اور کچھ نہیں۔ فکری جمود کے ساتھ کوئی ادارہ در و دیوار کے اعتبار سے تو ترقی کر سکتا ہے۔ مگر فکری جمود کے ساتھ علمی اور ذہنی ترقی کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

ایک موقع پر میں نے کہا کہ ہمارے علما اکثر وقتی مسائل میں الجھے رہتے ہیں۔ حالاں کہ اصل کام یہ ہے کہ تاریخی عوامل کو اپنے موافق بنایا جائے۔ مثلاً سید رشید رضا ۱۹۱۲ میں لکھنؤ آئے۔ پھر دیوبند جاکر دار العلوم میں انھوں نے تقریر کی۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ علما سیاسی مشاغل کو چھوڑ کر تبلیغ کریں۔ اگر وہ بھرپور طور پر اس میدان میں کام کریں تو اقلیت و اکثریت کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ مگر ہمارے علما نے اس دور رس تجویز کو نظر انداز کر دیا۔ وہ اقلیت و اکثریت کے مسئلہ کے حل کے لیے مدنی فارمولا اور آزاد فارمولا پیش کرتے رہے۔ جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مرکزی اسمبلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو برابری (parity) کا حق دے دیا جائے، حالاں کہ یہ سیلاب کے آگے تنکوں کا بند باندھنا تھا۔

ایک صاحب نے نہایت جوش کے ساتھ کہا کہ ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں انگریزوں نے برصغیر ہند میں ایسا تعلیمی نظام رائج کیا جس سے ہماری ذہنی غلامی برقرار رہے۔ میں نے کہا کہ یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ طرزِ فکر ہے اور اس طرزِ فکر نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔

اس دنیا میں ہر برائی میں کچھ اچھائی کا پہلو ضرور موجود رہتا ہے۔ انگریزوں کے رائج کردہ تعلیم کا معاملہ بھی یہی تھا۔ اس کا ایک پہلو وہ تھا جو آپ نے فرمایا۔ اسی کے ساتھ اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ بین اقوامی زبان (انگریزی) سکھاتے تھے اور نئے علوم کی تعلیم دیتے تھے اور موجودہ زمانہ میں ان

چیزوں کی بے حد اہمیت تھی۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو خذ ما صفا دع ما کدر کے اصول پر عمل کرنا چاہیے تھا۔ مگر انھوں نے انتہا پسندی کا طریقہ اختیار کیا جو بے حد نقصان دہ ثابت ہوا۔

ایک صاحب نے کہا کہ دینی درسگاہیں بنجر ہو چکی ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی تائید میں اقبال کا یہ شعر پڑھا :

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

میں نے کہا کہ مدارس کے نظام میں بلاشبہ اصلاح کی ضرورت ہے۔ مگر یہ کہنا صحیح نہیں کہ مدارس بالکل بے فائدہ یا بنجر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر ندوہ نے عربی زبان و ادب کا ذوق پیدا کیا۔ اس کی وجہ سے ہمارے درمیان ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جو عربی زبان میں لکھنے اور بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے ہندستانی مسلمانوں اور عرب ممالک کے درمیان ربط قائم ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہندستان اور ترکی کے درمیان جو دوری ہے وہی دوری ہندستان اور عرب کے درمیان پیدا ہو جاتی۔

اسی طرح دیوبند نے لاکھوں کی تعداد میں علماء پیدا کیے۔ یہی علماء ہیں جو امام، مدرس، مبلغ، واعظ، مصنف اور دوسری صورتوں میں مسلمانوں کو اسلام سے وابستہ رکھے ہوئے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں اور اسلام کے درمیان علمی واسطہ ہیں۔ اگر علماء کا یہ گروہ نہ ہوتا تو عام مسلمان اسی طرح اسلام سے ناآشنا ہو جاتے جس طرح مغربی ملکوں میں جزئی طور پر نظر آتے ہیں۔

مولانا سلطان احمد اصلاحی سے میں نے کہا کہ آپ کوئی ایسی بات بتائیں جو آپ کی ذاتی معرفت ہو، جس کو آپ نے خود دریافت کیا ہو۔ اس کی مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ حال میں میں نے دوسری بار حجۃ اللہ البالغہ پڑھی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میرا تاثر یہ تھا کہ "حجۃ اللہ البالغہ دین الٰہی کی عقلی تبیین نہیں ہے، بلکہ وہ دین الٰہی کی صرف تقلیدی تبیین ہے"۔ میں نے کہا کہ ڈھائی سو سال کے درمیان کسی بھی شخص نے یہ بات نہیں کہی۔ اسی طرح آپ کوئی ایسی نئی بات بتائیے جو آپ کی اپنی دریافت ہو۔ انھوں نے حسب ذیل سطریں ایک کاغذ پر بطور "حاصل حیات" لکھ کر دیا :

"جس کسی مسلمان کی زندگی میں کوئی لمحہ ایسا گزرے جس میں کہ اسے اپنے مولیٰ سے شکایت ہو اور اسے یہ احساس ستائے کہ وہ وہ نہیں ہے جو کہ اسے ہونا چاہیے تھا تو اسے اپنے

ویساں کی فکر کرنی چاہیے"۔

میں نے کہا کہ یہ تو اعادہ ہے، یہ آپ کی اپنی دریافت نہیں۔

ایک اور صاحب جو اصلاح ملت کے میدان میں کام کرنے کا شوق رکھتے تھے، ان کو میں نے یہ الفاظ لکھ کر دیے، قوم کی خدمت صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو قوم کی بے توجہی کے باوجود قوم کی خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

لکھنؤ میں سٹی ریلوے اسٹیشن کے پیچھے محلہ ڈیوڑھی آغا میر میں ایک قدیم درگاہ ہے۔ اس کا تعلق اٹھارویں صدی کے ایک صوفی اور عالم شاہ عبد الرحمٰن الموحد سے ہے۔ وہ بلوچستان کے قریب ایک قصبہ کوٹ مخدوم میں ۱۷۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ۲۰ سال کی عمر میں وہ علم ظاہر اور علم باطن کے حصول کے شوق میں گھر سے نکل گئے۔ اس دوران وہ لکھنؤ بھی آئے تھے۔ وہ ہندستان کے مختلف شہروں میں علماء وصوفیاء سے کسب فیض کرتے ہوئے سورت پہنچے۔ یہاں کشتی میں سوار ہو کر جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ۱۷۹۱ (رمضان ۱۲۰۵ھ) میں وہ مکہ پہنچے۔ حج وزیارت سے فارغ ہو کر ۱۷۹۵ میں ۲۸ سال کے بعد وہ وطن واپس ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا ہے (قومی آواز ۲۹ مئی ۱۹۹۲)

یہ دو سو سال پہلے کی بات ہے جب کہ کمیونی کیشن کے مشینی وسائل ظہور میں نہیں آئے تھے۔ اگست ۱۹۴۸ میں میں دوسری بار لکھنؤ آیا تھا۔ اس وقت میرا لڑکا شمس الاسلام اعظم گڑھ میں تھا۔ ۵ سال کی عمر میں، ۲۷ اگست ۱۹۴۸ کو اچانک اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ خبر اسی روز ٹیلی گرام کے ذریعہ مجھے لکھنؤ میں مل گئی۔ کتنا فرق ہے قدیم دور اور جدید دور میں۔

اس وقت میں چاہلنگ روڈ پر مشتاق احمد انصاری (ڈائرکٹر جمیل انڈسٹریز) کے مکان پر تھا۔ جب مجھ کو یہ خبر ملی تو خاموشی کے ساتھ میں لوگوں کے پاس سے اٹھا۔ غسل خانہ میں جا کر وضو کیا اور اس کے بعد لکڑی کے تخت پر دو رکعت نماز ادا کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

میں جب کہیں جاتا ہوں تو عام رواج کے تحت مسجد میں مجھ سے نماز پڑھانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہ صورت پیش آئی۔ مگر میں نے اپنی عادت کے مطابق امامت سے احتراز کیا۔ بعد کو ایک صاحب نے کہا کہ آپ کا طریقہ بزرگوں کے خلاف ہے۔ میں نے فلاں بزرگ کے ساتھ

سفر کیا ہے۔ وہ جہاں جاتے، ان سے امامت کے لیے کہا جاتا اور وہ شوق سے امامت کا فریضہ ادا کرتے۔

میں نے کہا کہ آپ ان بزرگوں کی پیروی کر رہے ہیں جن کے حق میں اللہ نے کوئی سلطان (آیت) نہیں اتاری۔ اور میں اس بزرگ کی پیروی کرتا ہوں جس کے حق میں اللہ کی سلطان موجود ہے۔ آپ کے مفروضہ بزرگوں کے حق میں قرآن میں کوئی آیت موجود نہیں۔ جبکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ حکم موجود ہے کہ وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔

میں نے کہا کہ میں سفر کے مقامات پر امامت سے اس لیے احتراز کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد (کتاب الصلاۃ، باب امامۃ الزائر) میں یہ روایت موجود ہے کہ : مَن زارَ قوماً فلا يَؤُمَّهم وليَؤُمَّهم رجلٌ منهم (جو شخص کسی قوم میں جائے تو وہ اس کی امامت نہ کرے۔ ان کا مقامی آدمی ان کی امامت کرے)

۲۹ فروری کی سہ پہر کو دار العلوم ندوۃ العلماء دیکھا۔ اس کی طرف چلتے ہوئے میں حضرت گنج کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچا تو مجھے ایک واقعہ یاد آگیا جو اسی سڑک پر گزرا تھا۔ یہاں سے میں پیدل گزر رہا تھا۔ ایک موڑ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک نوجوان اپنی بائیسکل تیزی سے دوڑاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ موڑ پر پہنچ کر وہ ایک راہ گیر سے ٹکرا گیا جو سڑک کے کنارے آگے کی طرف جا رہا تھا۔ راہ گیر گر پڑا اور بائیسکل بھی رک گئی۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی :

گھنٹی کیوں نہیں بجائی

گھنٹی نہ ہو تو

بریک کیوں نہیں لگایا

بریک نہ ہو تو

تمہارے پاس گھنٹی نہیں، تمہارے پاس بریک نہیں۔ پھر تم تیز کیوں دوڑاتے ہو

کیا تم سے پوچھ کر دوڑاؤں

ہم گاڑی سے گومتی کے نئے پل سے گزرتے ہوئے دوبارہ ایک واقعہ یاد آگیا جو اسی پل کے اوپر گزرا تھا۔ اس زمانہ میں یہاں ایک ڈاکٹر سمیع اللہ خاں تھے۔ انھوں نے فلاسفی میں ڈاکٹریٹ کیا تھا اور برٹرینڈ رسل سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ہم دونوں اس پل سے بات کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اچانک ڈاکٹر سمیع اللہ صاحب نے کہا کہ خدا کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائیٹریَن کیا ہے۔ میں نے کہا : وہی کرائیٹریَن جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے ہو۔ میرے اس جواب کے بعد ڈاکٹر سمیع اللہ صاحب خاموش ہو گئے۔ یہ شاید میری زندگی کی سب سے زیادہ کامیاب گفتگو ہے جو صرف ایک بار پیش آئی۔

دارالعلوم ندوہ پہنچے تو وہاں کا پورا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ میرے زمانہ قیام میں ندوہ ، عمارتی حیثیت سے ، ایک معمولی مدرسہ تھا۔ آج وہ عمارتوں کی کثرت سے ایک پوری یونیورسٹی معلوم ہوتا ہے۔ اس کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ ندوہ کے لوگ پُر جوش طور پر یہ تقریریں کر رہے ہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کا قومی وجود خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ فرقہ پرست طاقتیں ان کے تشخص کو مٹانے کی مسلسل کوشش کر رہی ہیں۔ مگر ندوہ نے ۱۹۴۷ کے بعد جس طرح غیر معمولی ترقی کی ہے ، اس کے لحاظ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اہل ندوہ کے پاس اس سے کہیں زیادہ بڑی ایک اور خبر ہے۔ مگر وہ اس کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں ظاہر نہیں کرتے۔ وہ مسلمانوں کو یہ قیمتی خبر دے سکتے ہیں کہ اس ملک میں دشمنوں کی سازشوں اور مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود یہ مواقع ہیں کہ ایک مدرسہ کو بہمال کے اندر یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچا دیا جائے اور کوئی دشمن اس کی ترقی کو روک نہ سکے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ایک تقریر ندوہ کے تعمیر حیات (۲۵ اپریل ۱۹۸۶) میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے کہا تھا کہ بڑے فخر کی بات ہے کہ تحفظ شریعت کی موجودہ تحریک کی قیادت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وہ لوگ کر رہے ہیں جنھوں نے دنیا بہت سے دوسرے ترقی پسند لوگوں اور پروگریسیو گروہ سے زیادہ دیکھی ہے۔ جنھوں نے مغربی تہذیب کا مطالعہ ان سے زیادہ گہری نظر اور وسیع نظر سے کیا ہے۔ وہ یورپ کی اور مشرق کی تاریخ پر ان سے زیادہ وسیع اور عمیق نظر رکھتے ہیں "

اس سلسلہ میں راقم الحروف نے یکم مئی ۱۹۸۶ کو ایک خط ایڈیٹر تعمیر حیات کے نام روانہ کیا

لکھا کہ مولانا علی میاں نے مغربی تہذیب اور مادی ترقی کے [illegible]
ن سے صرف ایک صاحب کا نام اور پتہ تحریر فرمائیں۔
ن کے جواب میں مجھے تعمیر حیات کے ایڈیٹر صاحب کا خط مورخہ ۲۹ شعبان ۱۴۰۶ھ ملا۔
لہ اس کے جواب میں میرا نام لکھ دیا اور تحریر فرمایا کہ "آپ خود جس طرح نئی تہذیب کے مسائل
تجزیہ کرتے ہیں، کیا وہ یورپ سے قریب رہنے والوں کے مقابلہ میں برتری کی دلیل
ہے"

یہ میرے سوال کا جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اس کے بعد میں نے براہ راست مولانا ابوالحسن علی ندوی
ا مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۸۶ روانہ کیا۔ اور لکھا کہ مجھے صرف ایک نام اور پتہ لکھ کر بھیج دیں۔ اس کے
یں ان کا خط مورخہ ۱۷ رمضان ۱۴۰۶ھ موصول ہوا۔ ان کے جواب کے الفاظ یہ تھے: "آپ نے
ہند نام پوچھے ہیں۔ میں دو ہی نام کافی سمجھتا ہوں۔ ایک مولانا وحید الدین خاں صاحب
ے یہ ناچیز"

میر انیس (۱۸۷۴-۱۸۰۱) اردو کے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی تعریف
ہوئے کہا تھا:

ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ رضواں بھی ہے جناں میں ثنا خوان لکھنؤ

ن نعمانی (۱۹۱۴-۱۸۵۷) بھی لکھنؤ کو بہت پسند کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ریاست
ئے۔ وہاں انھوں نے قدرتی مناظر کو دیکھا تو لکھنؤ کے تمدنی حسن پر جنجیرہ کا قدرتی حسن غالب
وں نے عطیہ فیضی کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

کہاں یہ لطف یہ منظر یہ سبزہ یہ بہارستاں عطیہ تم کو یادِ لکھنؤ ہو گی تو کیوں ہو گی

آج لکھنؤ کی حیثیت بڑے شہروں کے مقابلہ میں ایک "گاؤں" جیسی ہے۔ ۲۸ فروری کو
یٹ سے آتے ہوئے جب ہم شہر میں داخل ہوئے تو مولانا انیس الرحمٰن فلاحی نے بتایا کہ میں اس
پہلے بمبئی میں رہتا تھا۔ اب میں بمبئی چھوڑ کر لکھنؤ آگیا ہوں۔ چند مہینہ یہاں رہنے کے بعد
چھوٹی بچی زریں (۹ سال) نے کہا: ابا جان، دیہات میں ہم لوگ کئی مہینہ رہ چکے، اب آپ
چلئے۔

آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے مطابق، لکھنؤ میں ۹۰ پرانی عمارتیں (آثار قدیمہ) پائے
گئے ہیں۔ شہر کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے ان میں سے کئی عمارتیں دیکھیں۔ تاہم بیلی گارد میں
داخل ہو کر اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھنے کا موقع ملا۔
[illegible] ٹریٹی ۱۷۷۵ میں کیا گیا۔ اس کے بعد سے برٹش انڈیا کمپنی کا ایک نمائندہ لکھنؤ
میں اس مقام پر رہنے لگا جس کو آج بیلی گارد کہا جاتا ہے۔ مشہور بغاوت (غدر) کے زمانہ میں
۲ جون ۱۸۵۷ کو باغی فوجیوں نے بیلی گارد کو گھیر لیا۔ اس کے اندر اس وقت تقریباً تین ہزار
انگریز اور ان کے وفادار سپاہی جمع تھے۔ دو مہینے سے زیادہ مدت تک محاصرہ جاری رہا۔ اس
دوران باغی فوج مسلسل توپوں کے ذریعہ گولہ باری کرتی رہی۔ بیلی گارد کی عمارتوں پر گولے لگنے کے
نشانات آج بھی موجود ہیں۔ داغے ہوئے گولے بھی بعد کو جمع کرکے اس کے میوزیم میں رکھے گئے
ہیں۔ اس کے احاطہ کے اندر ایک مسجد تھی۔ اس کے اونچے مینار گولہ باری سے ہل گئے تھے۔ چنانچہ
بعد کو دونوں میناروں کو لوہے کے مضبوط شکنجے میں باندھا گیا جو آج تک اسی حالت میں موجود ہے۔
آخر کار سر کولن کیمپبل کانپور سے فوج لے کر آیا اور باغیوں سے لڑ کر ۲۵ ستمبر ۱۸۵۷ کو محاصرہ کا خاتمہ کیا
(مزید تفصیل: الرسالہ جولائی ۱۹۹۳، صفحہ ۲۱-۲۲)

یکم مارچ ۱۹۹۴ کو جناب نثر جلیل صاحب اور چند ساتھیوں کے ہمراہ میں نے اس مقام کو دیکھا۔
اس کو دیکھتے ہوئے جب میں اس کے تہ خانے کے اندر پہنچا اس وقت یہ راز دریافت ہوا کہ
طویل محاصرہ اور گولہ باری کے باوجود محصور افراد یہاں کس طرح زندہ بچے۔
بیلی گارد کے بیچ میں ایک قدیم عمارت ہے۔ اس عمارت کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ ہے
جو ۴۵ سیڑھیاں اتر کر ملتا ہے۔ محاصرہ کے دوران انگریز خاندانوں نے اسی تہ خانہ میں پناہ لی تھی۔
ان میں برٹش کمشنر سر ہنری لارنس بھی شامل تھے۔ یہ لوگ کئی مہینے تک اس میں محصور رہے۔ انگریز
جب لکھنؤ میں داخل ہوئے تو خطرہ کا پیشگی اندازہ کرکے یہ وسیع اور مضبوط تہ خانہ بنایا تھا۔ اس
تہ خانہ میں روشنی اور ہوا کا اتنا اچھا انتظام ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ معروف معنوں میں وہ کوئی تہ خا
ہے۔ یہی تہ خانہ طویل محاصرہ کے دوران انگریز خاندانوں کو بچانے کا سبب بنا۔
باغی فوجوں نے توپ خانہ اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ کئی مہینہ تک وہ اس پورے علاق

کو اپنے گھیرے میں لے کر اس کے اوپر گولہ باری کرتی رہیں۔ مگر اس عمارت کے پیچھے کوئی حصار بندی نہیں تھی اور نہ ان کو معلوم تھا کہ اندرونی طور پر انگریزوں نے کیا انتظامات کر رکھے ہیں۔ انگریز محصورین نے نیپال گرام پرکان پور کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے ربط قائم کیا۔ وہاں سے بڑی تعداد میں فوج آئی۔ اس نے باغیوں کو اپنے گھیرے میں لے کر ان پر فائرنگ شروع کر دی۔ اس طرح یہ محاصرہ ختم ہوا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں لکھنؤ کے تذکرہ کے تحت بتایا گیا ہے :

The best preserved monument is the Residency (1800), the scene of a heroic defence by British troops during the 1857 Indian Mutiny. (VI/374).

ریسیل گارد کی اس عمارت پر ایک کتبہ لگا ہوا ہے۔ اس میں اس وقت کے ہندستانی وائسرائے لارڈ کیننگ کی ڈائری کے یہ الفاظ درج ہیں :

"There does not stand recorded in the annals of war an achievement more truly heroic than the defence of the Residency at Lucknow". Lord Canning Viceroy & Governor General of India.

جناب نثر جلیل صاحب (۴۷ سال) لکھنؤ میں اڈیشنل ڈسٹرکٹ جج ہیں۔ انھوں نے بہت سے سبق آموز تجربات بتائے۔ وہ بہت ایمانداری کے ساتھ اپنا کام کرتے ہیں۔ انھوں ۱۹۷۹ کا ایک واقعہ بتایا۔ اس وقت وہ اعظم گڑھ میں منصف مجسٹریٹ تھے۔ ان کے وطن کے ایک آدمی کا کیس ان کی عدالت میں آیا۔ اس نے چاہا کہ تحفہ وغیرہ دے کر انھیں متاثر کرے اور اپنے حق میں فیصلہ حاصل کرے۔ وہ تحفے لے کر ان کے یہاں آیا۔ انھوں نے واپس کر دیا۔ مگر وہ نہیں مانا۔ اس نے کئی بار مختلف قسم کے تحفے پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہر بار منع کرتے رہے۔ انھوں نے اس آدمی سے کہا کہ کیس میں فیصلہ کا کوئی تعلق ان چیزوں سے نہیں ہے۔ قانون کا جو تقاضا ہوگا اس کے مطابق ہی تمہارے کیس کا فیصلہ کیا جائے گا۔

منع کرنے کے باوجود آدمی نہیں مانا اور بار بار انھیں متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک دن جب وہ تحفے لے کر آیا تو نثر جلیل صاحب کو غصہ آگیا۔ انھوں نے اس آدمی کو ایک کمرہ میں بند کرکے اسے مارا۔ نثر جلیل صاحب کی والدہ کو یہ قصہ معلوم ہوگیا۔ انھوں نے اس کی خبر ان کے والد مولانا عبد السمیع صاحب کو کر دی۔ موصوف یوپی اسمبلی کے ممبر تھے اور ۱۹۷۷ میں ۷۲ سال کی عمر

میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مولانا مرحوم نے اپنے صاحبزادہ نثر جلیل صاحب کو ایک خط لکھا۔ اس میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ درج تھا :

"تم اگر ایمان داری کرو تو تم کسی کے اوپر احسان نہیں کرتے ہو بلکہ صرف اپنی ملازمت کا تقاضہ پورا کرتے ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ بد اخلاقی سے بڑی گئی ایمان داری اپنا وقار کھودیتی ہے"

نثر جلیل صاحب نے کہا کہ والد صاحب کے اس خط کو پڑھ کر میں نے اپنے کو بونا محسوس کیا۔ اسی طرح شروع ملازمت میں نثر جلیل صاحب نے عدالت کے ماحول کے بارہ میں شکایت کی۔ مولانا عبد السمیع صاحب نے کہا : ایمان داری کا تعلق انسان کے ضمیر سے ہوتا ہے۔ دوسروں سے حاصل کردہ سرٹیفکٹ کی بنا پر کوئی شخص ایمان دار نہیں ہوسکتا۔ ہر انسان اس معاملہ میں اپنا جج آپ ہے۔ مولانا عبد السمیع ایک پختہ کانگرسی تھے۔

ایک صاحب نے کہا کہ انڈیا میں اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ جس طرح قدیم ہندستان میں یہاں خون کی ندیاں بہادی گئیں اسی طرح آج بھی یہ سازش کی جارہی ہے کہ دوبارہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائی جائیں۔ میں نے کہا کہ اگر فی الواقع ایسا ہے تو میں آپ کو اور مسلمانوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اتنی خطرناک سازش کے باوجود اب بھی آپ کے لیے ممکن ہے کہ اتر پردیش جیسی ریاست کی مین راج دھانی میں موجودہ سیمنار جیسا شاندار اسلامی اجتماع کرسکیں۔ ایسی حالت میں تو آپ کو پریشان ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔

ایک موقع پر اظہار خیال کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مجھے مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی کانفرنسوں میں شرکت کا بار بار اتفاق ہوا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ مقام عظمت سے بولتا ہے اور دوسرے لوگ مقام حقیقت سے۔ مسلمانوں میں تخیلاتی اپروچ ہے اور دوسروں میں حقیقت پسندانہ اپروچ۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان اس پیغمبر کو بھول چکے ہیں جس نے کہا تھا کہ یا عمر انا قلیل، اور اصبروا فانی لم اومر بالقتال۔ وہ صرف اس پیغمبر کو جانتے ہیں جس کی زبان سے یہ آیت جاری ہوئی کہ وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ۔ موجودہ مسلمانوں کو پیغمبر کی زندگی کا صرف نصف حصہ معلوم ہے۔ بقیہ نصف حصہ کی انھیں خبر نہیں۔

شہر کے درمیان چلتے ہوئے ایک بار لکھنؤ اسٹیشن سے گزرا۔ اس کا نقشہ اب بھی وہی تھا جس کو میں نے چالیس سال پہلے دیکھا تھا۔ مسافروں کی آمد و رفت کی سطح پر زندگی متحرک تھی، مگر رودیلہ کی سطح پر زندگی ٹھہری ہوئی نظر آئی۔

پہلی بار اس اسٹیشن پر غالباً میں ۱۹۴۱ میں اترا تھا۔ میرے عزیز اور بچپن کے ساتھی مسٹر عتیق احمد انصاری یہاں جاپلنگ روڈ پر اپنے والد مسٹر مشتاق احمد انصاری کے ساتھ رہتے تھے جو جیل انڈسٹریز میں ڈائرکٹر تھے۔ عتیق احمد صاحب سخت بیمار ہو گئے تھے۔ ان کو دیکھنے کے لیے میں اہل خاندان کے ساتھ لکھنؤ آیا تھا۔

لکھنؤ میں کچھ وقت مسٹر مسعود احمد کے مکان (گلستان طیبہ) پر گزرا۔ مسٹر مسعود کی والدہ انگریزی بالکل نہیں جانتی تھیں۔ مسٹر مسعود نے بی ایس سی تک کی تعلیم کالج میں حاصل کی۔ اب مسٹر مسعود کے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ ان کی لڑکی کو انگریزی ادب کا اتنا شوق ہے کہ وہ انگریزی زبان میں اشعار موزوں کرتی ہیں۔ ان کی ایک نظم (When Nobody Cares) یہ ہے:

With no one to care,
Life's full of despair,
Life seems like a burden
Which no one can share,
There's sadness all round,
In grief you are bound
Your e'er want to cry,
Oft longing to die.
God forgive me, you say,
That's not the right way.
Face up to the knocks and the challenges of life
For love, care and happiness
Never come without strife.

۱۹۴۷ تک یہ حال تھا کہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو نہایت برا سمجھتے تھے۔ آج یہ حال ہے کہ مسلمان انگریزی پڑھنے کو فخر سمجھتے ہیں۔ لیکن انگریزی زبان کو برا سمجھنا جتنا غلط تھا، اتنا ہی غلط یہ بھی ہے کہ اس پر فخر کیا جائے۔ اصل یہ ہے کہ زبان انسان کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت ہے۔ وہ نہ کوئی عیب کی چیز ہے اور نہ فخر و ناز کی کوئی چیز۔

لکھنؤ کی ایک مشہور شخصیت منشی نول کشور (۱۸۹۵ - ۱۸۳۶) ہیں۔ انھوں نے ۱۹ ویں صدی

ے نصف آخر میں اردو زبان و ادب کی جو خدمت کی اب بھی اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔
ون نے ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں مطبع نول کشور قائم کیا۔ سرمایہ کی کمی کی بنا پر اس وقت ان کا یہ حال
ا کہ صبح سویرے کاغذات طباعت کے بعد خود کاندھوں پر اٹھا کر دفتروں میں پہنچاتے
ے۔" (قومی آواز ۸ دسمبر ۱۹۹۱)

منشی نول کشور اسی زمانہ میں کلکتہ گئے۔ ان کو وائسرائے کے دربار میں مدعو کیا گیا تھا۔ انھوں
نے دیکھا کہ کاغذ سے لدا ہوا ایک جہاز یورپ سے آیا ہوا ہے مگر سامان کی ظاہری حالت اچھی نہ دیکھ کر
جر اس کی قیمت بہت کم لگا رہے ہیں، منشی نول کشور نے دام بڑھا کر اس کو خرید لیا۔ سامان جہاز
سے نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ اندر کے کاغذات نہایت اچھے ہیں۔ منشی صاحب نے کاغذ کی نصف
مقدار کلکتہ میں اچھے دام پر فروخت کر دی اور آدھی مقدار کو لکھنؤ لے آئے۔ اس سودے میں ان
کو اتنا زیادہ فائدہ ہوا کہ اس کی رقم سے انھوں نے لکھنؤ میں ایک بڑا مکان (کوٹھی غالب جنگ)
خریدی اور نیا پریس لگایا۔

اس دنیا میں خطرہ کے بغیر فائدہ نہیں (No risk no gain) کا اصول رائج ہے۔ یہاں وہی
لوگ بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں جو خطرہ مول لے کر اقدام کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

آپ منشی نول کشور کی تصویر دیکھیں تو وہ داڑھی اور پگڑی اور انگرکھا کے ساتھ اپنی صورت
کے اعتبار سے بالکل مسلمان نظر آئیں گے۔ اس زمانہ میں ہندوؤں کا کلچر عام طور پر وہی تھا جو مسلمانوں
کا کلچر تھا۔ زبان اور طرز رہائش کے اعتبار سے دونوں میں کوئی ظاہری فرق پایا نہیں جاتا تھا۔

ایک صاحب نے ہندستان ٹائمس (۸ دسمبر ۱۹۹۱) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو معلوم
ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ارادے کیا ہیں۔ پارٹی کے چیف مسٹر منوہر جوشی نے اپنے مذکورہ انٹرویو
میں کہا ہے کہ مسلمان ہندو ہیں:

Muslims are Hindus because they live in Hindustan.

میں نے کہا کہ ۱۹ ویں صدی کے آخر تک یہی صورت حال برعکس صورت میں قائم تھی۔ مسلم
سیاست کے دباؤ کے نتیجہ میں ہندو اپنی زبان اور کلچر کے اعتبار سے بظاہر مسلمان بنے ہوئے تھے۔ کیا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ہندو مسلمان ہو گئے۔ آپ جانتے ہیں کہ وہی ہندو آج خود مسلمانوں کے لیے

چیلنج بنے ہوئے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان ہندو ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی طرح کی چیزیں کسی قوم کے شخص کو نہیں بدلتیں۔ ہر ایک کی نظر خود اپنی اندرونی طاقت پر ہونی چاہیے نہ کہ خارجی نعروں پر۔

ایک ہندو دوران سے ملاقات ہوئی۔ وہ ۶۶ سال کی عمر کے تھے اور راجہ گونڈہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں پکا ہندو ہوں۔ مگر میں روزانہ رامائن اور بائبل اور قرآن کو پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا، مگر معاف کیجئے، آپ کے قرآن میں ترتیب نہیں ہے۔

میں نے کہا کہ بات یوں نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قرآن خدائی اسلوب میں ہے اور دوسری کتابیں انسانی اسلوب میں۔

انسانی اسلوب میں بیان واقعہ کا انداز ہوتا ہے۔ اس میں کوئی بات اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب کہ آدمی اول سے آخر تک اسے پڑھ ڈالے۔ مثلاً بائبل میں اگر آپ پیدائش یا خروج کا باب پڑھیں تو ۵۰ صفحہ ختم کرنے کے بعد بات مکمل ہوگی۔ آپ پچاس صفحہ پڑھنے کے بعد سمجھیں گے کہ اس میں کہنے والے نے کیا کہا ہے۔

مگر قرآن کا انداز واقعاتی نہیں بلکہ تذکیری ہے۔ قرآنی اسلوب کی حکمت یہ ہے کہ آپ چند سطریں یا ایک صفحہ بھی پڑھیں تو آپ کو نصیحت کی ایک بات مل جائے۔ چنانچہ آپ قرآن کا کوئی بھی صفحہ کھولیں۔ چند سطر پڑھتے ہی آپ کوئی نہ کوئی سبق یا نصیحت کی بات پالیں گے۔ قرآن کی بظاہر بے ترتیبی کثرتِ اسباق کی بنا پر ہے۔ آپ جب بھی کوئی ایسی کتاب لکھیں جس کا مقصد وہ ہو جو قرآن کا مقصد ہے تو اس کے اندر تعدد مضامین کی وہی کیفیت پیدا ہو جائے گی جس کو آپ بے ترتیبی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ مذکورہ ہندو سے ملاقات مسعود صاحب کی دکان پر ہوئی۔

اگست ۱۹۴۸ میں میں اعظم گڑھ میں تھا۔ میرے بڑے بھائی عبد العزیز خاں صاحب کو اپنڈکس کا شدید درد اٹھا۔ مقامی سرجن ڈاکٹر انیس کو بلایا گیا۔ انھوں نے دیکھنے کے بعد کہا کہ ان کو فوراً لکھنؤ لے جائیے اور وہاں آپریشن کروائیے۔ گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، اپنڈکس کا آپریشن تو موجودہ زمانہ میں کوئی میجر آپریشن نہیں سمجھا جاتا۔ پھر اس کے لیے آپ ہم کو لکھنؤ کیوں بھیج رہے

ہیں۔ [illegible] کے اسپتال میں اس کا آپریشن کیوں نہیں کر دیتے۔

انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس تربیت یافتہ ہینڈ نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپریشن ایک بے حد نازک کام ہے۔ اس کام کے لیے ایسے ساتھی کا ہونا ضروری ہے جو بتائے بغیر باتوں کو سمجھ لے۔ مثلاً ہم نے پیٹ کو چاک کرکے اپنڈکس کا آپریشن کر لیا۔ اب ضرورت ہے کہ پیٹ کے چاک کو دوبارہ سلا جائے۔ اس وقت اگر ہم کو باریک دھاگے کی ضرورت ہے۔ اور ہمارا ساتھی موٹا دھاگا سوئی میں ڈال کر ہمیں دینے لگے تو یہ مہلک ہوگا۔ اس وقت ہمارے لیے یہ موقع نہیں ہوتا کہ ہم بتائیں کہ ہمیں کس قسم کا دھاگا چاہیے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا: میرے ساتھی کو جاننا چاہیے کہ آئندہ میں کیا کرنے والا ہوں۔

[ڈاکٹر انیس کے یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایک سرجن کو جس قسم کے ہینڈ کی ضرورت ہوتی ہے اسی قسم کے ہینڈ کی ضرورت ایک رہنما کو بھی ہے۔ ایسے افراد نہ ہوں تو ایک رہنما بھی اسی طرح اپنا کام صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتا جس طرح ایک سرجن۔]

ڈاکٹر صاحب کے مشورہ کے مطابق، ہم فوری طور پر بذریعہ کار لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے اور رات بھر سفر کرکے صبح کے وقت لکھنؤ پہنچے۔ اس سفر میں میرے ساتھ مولانا اقبال احمد سہیل کے صاحبزادہ مسٹر یمین الاسلام خاں بھی تھے۔ لکھنؤ میں ہم لوگ ۶ جاپلنگ روڈ پر ٹھہرے۔ میڈیکل کالج کے اسپتال میں بھائی صاحب کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کے بعد کا وہ منظر اب تک مجھے یاد ہے جب کہ بھائی صاحب پانی کے لیے تڑپ رہے تھے اور ہم لوگ، ڈاکٹر کی ہدایت کی بنا پر، انھیں پانی کا گلاس دینے سے معذور تھے۔

جن دنوں بھائی صاحب لکھنؤ کے میڈیکل کالج اسپتال میں داخل تھے، مجھ کو روزانہ وہاں جانا ہوتا تھا۔ یہاں میڈیکل کالج سے ملا ہوا شاہ مینا (وفات ۸۷۰) کا مزار تھا۔ ایک روز میں مزار کے اندر گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ قبر کے چاروں طرف سجدہ کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ منظر میں نے پہلی بار دیکھا تھا، چنانچہ مجھے سخت جھٹکا لگا۔ میں وہاں سے چل کر اس کمرہ میں آیا جہاں گدے اور مسند کے اوپر کچھ موٹے موٹے افراد بیٹھے ہوئے تھے، وہ غالباً مجاور صاحبان تھے۔

میں ان کے سامنے ادب سے کھڑا ہو گیا اور نہایت نرمی سے کہا کہ یہاں میں نے دیکھا کہ لوگ قبر کو سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ تو اسلام میں حرام ہے۔ کیوں کہ سجدہ صرف ایک اللہ کے لیے ہے۔ ان میں سے ایک شخص بولا : ادھر کونے میں دیکھیے۔ میں نے دیکھا تو وہاں بانس کی کئی لاٹھیاں کھڑی کی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے کہا : آپ کا جواب اسی سے دیا جائے گا۔ اتنے میں ایک شخص نے مجھے پیچھے سے کھینچا۔ وہ غالباً یہاں کا چپراسی تھا۔ وہ مجھ کو کمرہ سے باہر لے گیا اور کہا: میاں صاحبزادے جاؤ، اپنا کام کرو۔ میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

لکھنؤ کے اجتماع میں مولانا عبد الغفار ندوی (۲، سال) سے بھی ملاقات ہوئی۔ ان سے مل کر کئی باتیں یاد آگئیں۔ ۱۹۴۸ میں غالباً دوسری بار میں لکھنؤ آیا تھا۔ اس وقت مولانا عبد الغفار صاحب سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ لکھنؤ میں جماعت اسلامی کے واحد رکن تھے اور جھاؤ لال کے پل پر ایک بوسیدہ کمرہ میں جماعتی پروگرام کے تحت ہفتہ وار اجتماع کیا کرتے تھے۔ ایک عرصہ تک وہ تنہا یہ اجتماع کرتے رہے۔ کیوں کہ ان کی اکیلی ذات کے سوا کوئی اس میں شرکت کرنے والا اس وقت یہاں موجود نہ تھا۔ آخر کار ایک قافلہ بنا۔ اب لکھنؤ میں پانچ مختلف مقامات پر جماعت اسلامی کے پانچ اجتماعات ہوتے ہیں۔ ان میں شرکا کی مجموعی تعداد تقریباً ڈیڑھ ہزار ہوتی ہے۔

مولانا عبد الغفار ندوی کے ایک ایسے اجتماع میں میں بھی شریک ہوا ہوں جس میں صرف ہم دو آدمی تھے۔ انھوں نے جماعت اسلامی کی کسی کتاب کا ایک حصہ پڑھا۔ عام طور پر وہ خود ہی پڑھتے تھے اور خود ہی سنتے تھے۔ مگر اس دن ایک سنانے والا تھا، اور ایک سننے والا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳-۱۹۷۹) ایک سے زیادہ بار لکھنؤ آئے تھے۔ ان کی پہلی آمد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابو الحسن علی ندوی لکھتے ہیں :

"مولانا مودودی جنوری ۱۹۴۱ میں لکھنؤ تشریف لائے۔ یہ زمانہ مسلمانوں میں بڑی بے چینی اور جوش و سرگرمی کا تھا۔ مولانا کے پرزور، فکر انگیز مضامین نے اسلامی حلقوں میں ایک جنبش اور حرکت پیدا کر دی تھی۔ نوجوان اسلام کی اُس ترجمانی کے دلدادہ تھے جو بلند سطح سے اور پر اعتماد لہجہ میں کی جائے اور مسلمانوں میں امنگ، حوصلہ اور اپنے ماضی اور تہذیب پر اعتماد پیدا

ے شہر کے مسلم نوجوان جوق درجوق آتے اور مولانا سے بڑے ذوق وعقیدت سے ملتے۔"

اس قسم کے الفاظ مزید اضافہ کے ساتھ علامہ اقبال کے بارہ میں لکھنے والوں نے لکھے ہیں۔ فی الواقع علامہ اقبال کی نظم اور مولانا مودودی کی نثر کی وہی حیثیت ہوتی جو بتائی جاتی ہے تو ج پاکستان میں اسلام کا چمنستان لہلہاتا ہوتا جہاں انھیں کام کرنے کا موقع ملا۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، ال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ جس چیز کو بلند مضامین سمجھا گیا تھا وہ صرف ند الفاظ تھے۔ اور بڑے بڑے الفاظ بول کر شخصی مقبولیت تو مل سکتی ہے، اس طرح کے لفظی ماہروں سے قوموں کی تعمیر نہیں ہوتی۔

یہاں سید مختار الحسن رفیق (۱۹ سال) سے ملاقات ہوئی۔ وہ جامعہ دارالسلام عمرآباد میں زیر تعلیم ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہاں تقریباً چالیس نومسلم طلبہ ہیں۔ ان کا دارالاقامہ الگ ہے۔ اور ان کے لیے دو سال کا مخصوص کورس بنایا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ نومسلم عام مسلم طالب علموں سے بہت ممتاز ہوتے ہیں۔ ان کے اندر صبر اور سنجیدگی کا مادہ ہوتا ہے۔ مثلاً مطبخ میں کھانا اگر کم پڑ جائے اور کچھ طلبہ کو بروقت کھانا نہ ملے تو عام مسلم طلبہ شور اور احتجاج کرنے لگتے ہیں۔ مگر نومسلم طلبہ بالکل خاموش رہتے ہیں اور کھانا نہ ملے تو چپ چاپ واپس چلے جاتے ہیں۔

انھوں نے بتایا کہ یہ نومسلم عام مسلم طلبہ سے زیادہ نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔ تقریباً سب کے سب تہجد کی نماز پڑھتے ہیں۔ وہ تعلیم میں زیادہ دھیان دیتے ہیں، کردار میں وہ دوسروں سے بلند ہوتے ہیں۔ نومسلم حضرات کا عام طور پر یہی حال ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نسلی مسلمانوں میں اخلاقی بلندی لانے کی ایک تدبیر یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ بڑی تعداد میں نومسلموں کو مسلمانوں کے سماج میں داخل کیا جائے۔ اس نئے خون کی آمد پرانے خون کے اندر نئی زندگی پیدا کرنے کا سبب بن جائے گی۔

لکھنؤ کے قومی آواز (۲۹ فروری ۱۹۹۲) میں مراسلات کے کالم میں ایک مراسلہ پڑھا جس کا عنوان تھا "قرآن اور سائنس"۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "قرآن شریف کا پڑھنا اور سننا عبادت ہے" انھوں نے لکھا تھا کہ حسن تلاوت یہ ہے "قرآن شریف پڑھ کر یا سن کر گداز قلب پیدا ہو اور آدمی کو رونا آئے۔ اللہ کی ہیبت طاری ہو۔ اس کی رحمت و مغفرت کی امید بڑھے۔ یہی قرآن شریف

پڑھنے کا حاصل ہے" ان کے نزدیک یہ مقصد اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ آدمی یہ احساس کرکے قرآن سے جڑے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ مجھ سے مخاطب ہے۔ مراسلہ نگار کا خیال تھا کہ قرآن مجید سے اگر سائنسی اور فلسفیانہ مسائل کا حل ڈھونڈا جانے لگے تو اس سے قرآن شریف پڑھنے کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔

یہ حضرات قرآن کو صرف تلاوت کی کتاب سمجھتے ہیں، وہ اس کو تدبر کی کتاب نہیں سمجھتے۔ حالانکہ قرآن کا اپنا بیان یہ ہے کہ قرآن کے تمام اعلیٰ فوائد اس پر تدبر و تفکر ہی کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں۔

مثلاً قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیے۔ اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ، مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔ اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں میں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔ اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف وہی لوگ ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے (فاطر ۲۷ - ۲۸)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خشیتِ الٰہی کا تعلق علوم فطرت میں واقفیت اور غور و فکر سے ہے۔ ایسی حالت میں جو لوگ تدبر کو غیر اہم اور تلاوت کو اہم بتائیں وہ یقیناً قرآن کے بارہ میں ایک نازیبا جسارت کر رہے ہیں۔

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ان کے درمیان ڈائیلاگ ختم ہوگیا ہے۔ لوگ صرف دو بات سننا چاہتے ہیں —— اپنی تائید یا اپنے دشمن کی تردید۔ کوئی بھی شخص اختلافی موضوع پر کھلے ذہن کے ساتھ تبادلۂ خیال کے لیے تیار نہیں۔

میں نے خود لکھنؤ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ۶۷ - ۱۹۶۶ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی "معاندانہ سیاست" کے زبردست حامی بنے ہوئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمیں اپوزیشن پارٹیوں سے مل کر کانگرس کو ہرانا چاہیے۔ اپنی نقصان رسانی کی صلاحیت کا استعمال کرکے ہم اپنا حق وصول کر سکتے ہیں۔ اپنی تقریروں میں وہ جوش کے ساتھ یہ شعر پڑھا کرتے تھے :

ملاقات پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹوں میں ہو تو ہوئے حریری

اس طریقہ کو مولانا علی میاں ملت کی عظیم دریافت کہتے تھے۔ بھوپال میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے پرجوش طور پر کہا کہ "ہم نے اپنے آپ کو پالیا ہے"۔ میں اس طرز فکر سے مطمئن نہ تھا۔ میں نے مولانا علی میاں سے خط وکتابت کی اور ان سے ملاقات کے لیے وقت مانگا۔ مگر انھوں نے وقت دینے سے انکار کیا۔ اس سلسلہ میں ان کا آخری خط یہ تھا :

"جواباً صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جو جملہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا اور جس کی تشریح آپ کرانا چاہتے ہیں، اس کو مجذوب کی بڑ سمجھ کر نظر انداز کر دیجئے۔ اس موضوع پر مزید خط وکتابت نہ کی جائے"۔ (۲۹ اپریل ۱۹۶۷)

مولانا علی میاں نے لکھا تھا کہ اس سلسلہ میں ان کے مخصوص رفقا، مولانا محمد منظور نعمانی اور ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی سے بات کر لی جائے۔ ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ کو لکھنؤ میں گوئن روڈ کی مسجد میں مولانا محمد منظور نعمانی سے ملاقات کی۔ کئی گھنٹہ کی گفتگو میں جب میں نے معاہداتی سیاست کے بارہ میں مولانا کی تمام دلیلوں کو منہدم کر دیا تو انھوں نے فرمایا : مگر اس میں منفی فائدہ تو ہے۔ منفی فائدہ سے ان کی مراد یہ تھی کہ کانگرس کو شکست دے کر ہم اپنی اس قوت کا مظاہرہ کریں گے کہ ہم سیاسی نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں۔ میں یہ کہہ کر وہاں سے چلا آیا کہ اس میں منفی فائدہ بھی نہیں، البتہ ہمارا اپنا نقصان ضرور ہے۔ اور وہ ہے ملک میں فرقہ وارانہ زہر کا اضافہ۔

ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی سے ۱۶ اپریل ۱۹۶۷ کو حضرت گنج میں ان کے مطب میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت وہ "کانگرس ہراؤ سیاست" کے چیمپین بنے ہوئے تھے۔ تقریباً پون گھنٹہ کی گفتگو میں میں نے ان کے تمام دلائل کو رد کر دیا۔ جب ان کے پاس اپنے حق میں کوئی دلیل باقی نہیں رہی تو آخر میں انھوں نے کہا : مگر اسٹیٹس کو میں چینج تو ہوگا۔ چونکہ وہ مزید گفتگو کے لیے آمادہ نہ تھے اس لیے میں غم ناک دل کے ساتھ واپس چلا آیا۔

میں اس معاملہ میں کتنا زیادہ غم ناک تھا۔ اس کو بتانے کے لیے میں صرف ایک حوالہ دوں گا۔ الجمعیۃ ویکلی (۲۰ اکتوبر ۱۹۶۷) میں ایک تفصیلی مضمون کے تحت میں نے لکھا تھا "مسلمانوں کی سیاست کا یہ موڑ ذاتی طور پر راقم الحروف کے لیے اس درجہ تشویش ناک تھا کہ اس کو سوچ کر اکثر میری، آنسو

کی بے پناہ اشتیاق ۔ مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب الکشن (اگست ۱۹۹۰) سے پہلے لکھنؤ کے ایک شاندار اجتماع میں اس قبیلۂ قیادت کے ایک نمایاں ترین بزرگ اپنی خطابت کے جوہر دکھا رہے تھے اور میرا حال یہ تھا کہ میں سامعین کے مجمع میں بیٹھا ہوا زار و قطار رو رہا تھا۔ انتہائی بے تابی کے عالم میں بار بار میری زبان سے یہ الفاظ نکل رہے تھے : خدایا ، جس ملت کے قائد ایسے نادان مقررین ہو جائیں اس ملت کا انجام کیا ہوگا۔' (الجمعیۃ ویکلی ، ۲۰ اکتوبر ۱۹۹۲ صفحہ ۱۹)

ایک ہندو بھائی سے ملاقات ہوئی۔ ان کا تعلق بھارتیہ جنتا پارٹی سے تھا۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۹۱ کے الکشن میں بھارتیہ جنتا پارٹی رام مندر کی تعمیر کا نعرہ لے کر چناؤ لڑی اور بھاری ووٹوں سے کامیاب ہوئی۔ اس طرح یوپی کے ووٹوں کی اکثریت نے اس کو حق دے دیا کہ وہ رام مندر بنائے تو اب جمہوری منطق کے مطابق بھارتیہ جنتا پارٹی کو رام مندر کی تعمیر کا حق ہونا چاہیے اور کسی کو اس میں رکاوٹ نہیں ڈالنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ آپ نے ادھوری بات کہی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا نعرہ تین چیزوں کے لیے تھا ـــــ روٹی ، انصاف اور رام مندر۔ کیا آپ کی پارٹی نے ریاست میں پہلا دونوں کام کر لیا ہے کہ اب وہ تیسرے کو کرنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں۔

۱۹۹۱ کے الکشن میں اگرچہ بی جے پی اس حد تک کامیاب ہوئی کہ اس نے یوپی میں ریاستی گورنمنٹ بنالی۔ مگر رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بی جے پی کے اندرونی حلقے اپنے مستقبل کے بارہ میں مایوسی میں مبتلا ہیں۔ بی جے پی کے ایک ممبر نے کہا : ہم دونوں بار اُچھل رہے (ٹائمس آف انڈیا ۱۰ فروری ۱۹۹۲)

شری لال کرشن ایڈوانی نے پہلی رتھ یاترا نکالی۔ اس کو سومناتھ سے روانہ ہو کر اجودھیا پہنچنا تھا۔ مگر وہ اجودھیا پہنچنے سے پہلے بہار میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد شری مرلی منوہر جوشی نے دوسری رتھ یاترا نکالی۔ اس کو کنیا کماری سے چل کر ۲۶ جنوری ۱۹۹۲ کو سرینگر پہنچنا تھا مگر جموں پہنچ کر وہ بھی منتشر ہو گئی۔

منفی بنیاد پر اٹھنے والی تحریکیں ہمیشہ ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں۔ ایسی کسی تحریک کے بارہ میں بہترین تدبیر یہ ہے کہ ردعمل کے بجائے انتظار کی پالیسی اختیار کی جائے۔ ردعمل کی پالیسی

ایسی تحریکوں کی عمر کو بڑھاتی ہے اور انتظار کی پالیسی اس کی عمر کو مزید کچھ اور کم کر دیتی ہے۔

ایک صاحب نے نصیحت کے لیے کہا۔ میں نے ان کی نوٹ بک پر یہ جملہ لکھ دیا :

قوم کی خدمت صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو
قوم کی بے توجہی کے باوجود قوم کی
خدمت کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

ایک اور صاحب کو یہ جملہ لکھ کر دیا :

ہر آدمی اپنی ذات کے معاملہ میں پریکٹیکل پسند ہے
اور دوسروں کے معاملہ میں آئیڈیل پسند۔

لکھنؤ کی یادوں میں سے ایک یاد مولانا عبد الباری ندوی (۱۹۷۶-۱۸۹۰) کی ہے۔ میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی۔ وہ بھی مجھ سے بہت زیادہ محبت فرماتے تھے۔ پہلی بار میں ان سے ۱۹۶۲ کے آغاز میں لکھنؤ میں ملا تھا۔ ان کو میں نے "تعبیر کی غلطی" کا پورا مسودہ دکھایا۔ پھر ان کی تصدیق اور اتفاق کے بعد اس کو اشاعت کے لیے دیا۔

اس کے بعد کئی بار ان سے میری خط و کتابت ہوئی۔ اپنے ایک خط میں انھوں نے میرے بارہ میں لکھا : "باقی میرے نزدیک تو آپ جدید طبقہ کی طرف مبعوث ہیں"۔ اپنے اسی حسن ظن کی بنا پر انھوں نے یہ پیش کش کی تھی کہ لکھنؤ (سیتا پور روڈ) میں اپنے وسیع مکان کو وہ "اسلامک ہوسٹل" کے نام پر وقف کر دیں اور مجھ کو اس کا نگراں بنا دیں۔ اس میں کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طلبہ کو ٹھہرا کر ان کی اسلامی تربیت کی جائے۔ تاہم بعض وجوہ سے میں اس کو قبول نہ کر سکا۔

انھوں نے اپنی کتاب (مذہب اور سائنس) کا مسودہ مجھے دیا تھا کہ میں اس کو ری رائٹ کر دوں۔ مگر میں یہ خدمت بھی انجام نہ دے سکا۔ بعد کو ۱۹۷۱ میں یہ کتاب مجلس تحقیقات و نشریات اسلام (لکھنؤ) سے اسی طرح شائع کی گئی ہے۔ یہ ایک مفید کتاب ہے۔ تاہم اپنی موجودہ صورت میں وہ ایک قسم کا مجموعہ اقتباسات ہے۔ اس میں وہ تجزیہ و تحلیل موجود نہیں جو اس موضوع سے تعلق رکھنے والی کتاب میں ہونا چاہیے۔

۱۹۶۶ کے آخر میں میں نے دو ہفتہ ان کے مکان پر قیام کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ان

کے وسیع مکان کے ایک بیرونی کمرہ میں ڈاکٹر فیاض الاسلام (علی گڑھ) اور مولانا عبد المجید ندوی ایم اے رہتے تھے۔ مولانا عبد المجید صاحب آخر عمر میں مدرستہ الاصلاح (سرائمیر) کے صدر مدرس تھے۔ ۲۴ مئی ۱۹۹۱ کو اعظم گڑھ کے قریب ایک سڑک کے حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔

اس قیام کے دوران ایک روز ایسا ہوا کہ مولانا عبد الباری مرحوم اپنی چارپائی پر بیٹھے تھے۔ میں نیچے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ گفتگو کے دوران مجھ پر خاص کیفیت طاری ہوئی۔ میں نے مولانا کے پیروں پر اپنا دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: مولانا آپ مجھے بیعت فرمالیں۔ مولانا نے فرمایا کہ تم تو پیدائشی صوفی ہو۔ پھر بھی میں تم کو اسی طرح اپنی بیعت میں لیتا ہوں جس طرح حضرت تھانوی نے مجھ کو اپنی بیعت میں لیا تھا۔ (واضح ہو کہ مولانا مرحوم حضرت تھانوی کے خلیفہ مجاز تھے) اس طرح گویا میں مولانا عبد الباری صاحب کے واسطے سے حلقۂ تھانوی میں شامل ہوں۔ مزید یہ کہ لوگ اپنے شیخ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت ہوتے ہیں۔ میں اپنے شیخ کا پاؤں پکڑ کر ان سے بیعت ہوا ہوں۔

راقم الحروف کے بارہ میں ایک صاحب نے بے بنیاد تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے ——

"ہمارے مولانا عبد الباری صاحب ندوی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ کبیر بننے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کسی کے سامنے صغیر بنا ہو، ورنہ وہ فتنہ بنتا ہے۔ وحید الدین خاں صاحب کی کمی یہی ہے کہ وہ صغیر بننے سے پہلے کبیر بن گئے۔ ان کی ادعائی تحریریں دن بہ دن جادۂ اعتدال سے ہٹتی جارہی ہیں۔" (ماہنامہ الرشاد مارچ۔ اپریل ۱۹۹۱، صفحہ ۹۰)

راقم الحروف کو دعوی تو درکنار، غلط فہمی کے درجہ میں بھی کبیر ہونے کا گمان نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو کبیر سمجھنا شرک کی نوعیت کا گناہ ہے۔ کیوں کہ کبیر صرف ایک ہے، اور وہ اللہ رب العالمین کی ذات ہے۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ جس مولانا عبد الباری ندوی کے حوالے سے مذکورہ بات کہی گئی ہے، اسی کے ساتھ میرا وہ واقعہ گزرا جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔

۱۹۶۷ میں میں نے الجمعیۃ ویکلی (دہلی) کی ادارت قبول کی۔ صرف میرے تعلق کی بنا پر مولانا عبد الباری صاحب مرحوم الجمعیۃ ویکلی دیکھنے لگے، جب کہ اس سے پہلے وہ اس کو نہیں پڑھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یاد ہے۔ الجمعیۃ ویکلی (۲ فروری ۱۹۶۸) میں میرا ایک مضمون چھپا۔ اس کا عنوان تھا: دیوار قہقہہ۔ اس مضمون سے پہلے اکتوبر ۱۹۶۶ میں میں نے اپنے لڑکے

ڈاکٹر ظفر الاسلام کو تعلیم کے لیے قاہرہ بھیجا تھا۔ مولانا کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ کیوں کہ وہ قاہرہ کو مقہورہ سمجھتے تھے۔ مذکورہ مضمون پڑھنے کے بعد مولانا نے مجھے لکھا : آپ نے اپنے بیٹے کو دیوار قہقہہ پسند واپس دی۔

شخصیتوں پر مضمون لکھنے کا مجھے ذوق نہیں۔ تاہم مولانا عبد الباری ندوی پر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو اسی زمانہ میں الجمعیۃ ویکلی کی دو قسطوں (۷ مارچ، ۱۴ مارچ ۱۹۶۹) میں چھپا تھا۔ اس کا عنوان تھا : "مسٹر مولوی"۔ مسٹر مولوی، مولانا مرحوم کا وہ نام ہے جو مسٹر بین (F.W. Bain) نے ان کو دیا تھا۔ مسٹر بین دکن کالج پونہ کے پرنسپل تھے۔ مولانا اس کالج میں ۱۹۱۴ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے آئے اور تقریباً چار سال یہاں رہے۔ الجمعیۃ کے مضمون کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :

"مسٹر بین، مولانا کے الفاظ میں، اپنی قسم کا انوکھا آدمی تھا۔ مولانا عبد الباری نے فرمایا کہ اس طرح کا آدمی میں نے اپنی زندگی میں دوسرا نہیں دیکھا۔ مسٹر بین انگلینڈ جانے لگے تو انھوں نے وداعی پارٹی میں بولتے ہوئے کہا کہ مسٹر مولوی کبھی میرے بنگلہ پر مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ انھوں نے کبھی میرے نام کرسمس کارڈ نہیں بھیجا۔ کبھی کوئی تحفہ مجھ کو پیش نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود میں ان سے بہت خوش ہوں، اور میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے۔ کیوں کہ وہ ہمیشہ اپنے کام کو بہترین طور پر انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں"۔

مسٹر بین نے پونہ سے واپس جاتے ہوئے مولانا عبد الباری صاحب کو بلایا۔ جب وہ مسٹر بین کے دفتر میں پہنچے تو اس نے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے کاغذوں کی ایک گڈی نکالی۔ اس نے کہا کہ مسٹر مولوی، یہ سب آپ کے خلاف شکایتوں کی چٹیں ہیں۔ مسٹر ہوم جی (آیندہ ہونے والے پرنسپل) مسلسل آپ کے خلاف شکایتیں لکھ لکھ کر بھیجتے رہے ہیں۔ صرف میں ان کے اور آپ کے درمیان روک بنا ہوا تھا۔ مگر اب میرے بعد آپ یہاں نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ مسٹر بین کے جاتے ہی مولانا عبد الباری صاحب کو دکن کالج سے ہٹا دیا گیا۔

مسٹر بین جیسے عالی ظرف افراد ہی کوئی بڑا ادارہ قائم کرتے ہیں۔ جن افراد کے اندر یہ عالی ظرفی نہ ہو وہ صرف سطحی لوگوں کی سرائے بنائیں گے نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی بڑا انسانی ادارہ۔

ایک اردو ہفت روزہ (۲۸ فروری ۱۹۹۲) میں دو صفحہ کا ایک مضمون پڑھا۔ اس کا عنوان تھا: روہنگیا مسلمانوں پر برمی فوج کے مظالم کی انتہا۔ یہ مضمون ایک برمی مسلمان کے قلم سے تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اراکان کے مسلمانوں کی آزادی کی تحریک کو برمی حکومت بے رحمانہ طور پر کچل رہی ہے اور اس کا سلسلہ ۱۹۴۲ سے جاری ہے۔ ۱۹۵۰ سے اراکان کے مسلمان اپنی آزادی کے لیے گوریلا تحریک چلا رہے ہیں۔ اس مدت میں دو لاکھ سے زیادہ مسلمان شہید ہو چکے ہیں اور تقریباً دو لاکھ مسلمان جان بچا کر بنگلہ دیش پہنچ گئے ہیں اور وہاں بدترین افلاس کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ریاض کے عربی ہفت روزہ الدعوۃ (۶ فروری ۱۹۹۲) میں ایک روہنگیا لیڈر کا انٹرویو چھپا ہے۔ اس کا عنوان ہے: الحکومۃ البورمیۃ اقرت مخططا لا بادتنا۔

اس کو پڑھ کر مجھے یاد آیا کہ ندوہ کے زمانہ قیام میں ایک روز ندوہ کے ایک سینئر استاد میرے کمرہ میں آئے اور رازداری کے ساتھ فرمایا کہ میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں ہندستان چھوڑ کر اراکان چلا جاؤں۔ برما کے اس سرحدی علاقہ میں بیشتر مسلمان آباد ہیں اور وہاں اسلامی حکومت قائم کرنے کے روشن امکانات ہیں۔ میں نے اس منصوبہ سے اختلاف کرتے ہوئے رفاقت سے معذوری ظاہر کی۔ اس پر وہ بگڑ گئے اور مجھ کو بزدل اور بے ہمت وغیرہ کا الزام لگانے لگے۔ مذکورہ استاد اراکان تو نہیں گئے۔ البتہ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ پاکستان چلے گئے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں میں یہ سیاست عام ہے کہ کسی ملک کے ایک حصہ میں اگر ان کی اکثریت ہے تو اس حصہ کو بقیہ ملک سے الگ کر کے وہاں وہ خود مختار مسلم حکومت یا آزاد اسلامی حکومت قائم کرنے کی تحریک چلانے لگتے ہیں۔ میرے نزدیک اس سیاست کا تعلق نہ اسلام سے ہے اور نہ عقل سے۔ اس احمقانہ سیاست کے نتیجہ میں ملک کی حکومت جب ان کے اوپر سختی کرتی ہے تو دوسرا کام انھیں یہ مل جاتا ہے کہ ملکی حکومت کے مظالم کے خلاف سطحی قسم کے بیانات اور مضامین چھاپتے رہیں۔ اس کا نام اگر اسلام ہو تو میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ غیر اسلام کس چیز کا نام ہوگا۔

لکھنؤ پچھلی کئی صدیوں تک مسلم حکمرانوں اور مسلم نوابوں کا مرکز رہا ہے۔ اس بنا پر وہاں مسلم عہد کی بہت سی تاریخی عمارتیں پائی جاتی ہیں۔ "چھتر منزل" سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ یہ محلات اُس زمانہ میں کتنی زیادہ لایعنی سرگرمیوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

مثال کے طور پر اس زمانہ میں مسلم نوابوں کے یہاں ایک مستقل عہدہ "داستان گو" کا ہوا کرتا تھا جو فرضی قسم کی افسانوی کہانیاں سنا کر نواب اور ان کے درباریوں کو محظوظ کرتا تھا، حکیم سید اصغر علی لکھنوی (م ۱۸۷۹) اسی قسم کے ایک داستان گو تھے۔ وہ واجد علی شاہ کے دربار سے وابستہ ہونے کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ "داستان گوئے سلطانی" لکھا کرتے تھے۔ وہ دیووں اور پریوں کی خیالی کہانیاں بیان کرنے کے ماہر تھے۔

ندوہ جاتے ہوئے میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے گزرا جو پہلے کیننگ کالج تھا۔ سر چارلس جان کیننگ ۱۸۵۶ میں گورنر جنرل کی حیثیت سے انڈیا آیا۔ اس نے یہاں کئی تعلیمی ادارے قائم کیے۔ اس میں سے ایک کیننگ کالج بھی تھا۔ میں نے سوچا کہ جس زمانہ میں دوسری قومیں علوم حقیقی میں مہارت پیدا کر رہی تھیں، مسلم امراء داستان سرائی کرنے والوں سے اپنی بزم سجا رہے تھے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا جو انجام ہوا اس کو انھیں اپنی غفلت کے خانہ میں درج کرنا چاہیے نہ کہ وہ اس کو دوسروں کی سازش کا نتیجہ بتا کر ان کے خلاف احتجاج کرنے لگیں۔

لکھنؤ کی تہذیب فنون لطیفہ اور شعر و شاعری کی تہذیب تھی۔ اس کو شاہ جان عالم اور نواب واجد علی جیسے لوگوں نے بنایا تھا۔ صنعتی انقلاب نے اس تہذیب کی بالادستی ختم کر دی۔ تاہم مزاج کے اعتبار سے وہ اب بھی پائی جاتی ہے۔ یہاں کے ایک شاعر ظریف لکھنوی (۱۹۳۷-۱۸۷۰) کا ایک شعر اپنے محبوب کے بارہ میں ہے:

کوئی ہے اطلاع اس وقت کر دے جا کے تھانہ میں — وہ میرے قتل پر کھینچے ہوئے تلوار بیٹھے ہیں

نہ کہیں محبوب ہے اور نہ کہیں محبوب کی تلوار۔ شاعر اپنے تخیل کی دنیا میں خیالی مضمون بندی کر رہا ہے۔ اس مضمون بندی کا نام شاعرانہ اسلوب ہے۔ یہ اسلوب اردو زبان میں اتنا چھایا ہوا ہے کہ ہمارے مسلم مفکرین بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ تقریباً تمام مصلحین و مفکرین اسلام کو موضوع بنا کر اسی قسم کی مضمون بندی کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں جس چیز کو اسلامی ادب کہا جاتا ہے کہ وہ اسی مضمون بندی کا دوسرا نام ہے۔

لکھنؤ کی یادوں میں سے ایک یاد م نسیم صاحب بھی ہیں۔ یہاں ان کی سگریٹ ایجنسی تھی۔ پھر بعض اسباب سے ایجنسی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ امریکہ چلے گئے۔ انھوں نے لکھنؤ سے

ایک ادبی ماہنامہ "نئی نسلیں" کے نام سے جاری کیا تھا۔ ۵۵-۱۹۵۴ میں اس میں میرے چند مضامین شائع ہوئے۔ ان کے عنوانات یہ ہیں :

زندگی میں شعر کا مقام

شاعری ـــــ اس کا فن اور کردار

شعر کی موجودہ ہیئت میں اصلاح کی ضرورت

شعر کی موجودہ ہیئت (اعتراضات کا جواب)

ارادہ ہے کہ ان مضامین کو، دوسرے اسی قسم کے مضامین کے ساتھ، "ادبیاتِ اسلام" کے نام سے ایک مجموعہ کی صورت میں شائع کر دیا جائے۔

م نسیم صاحب کے بارہ میں ایک مضمون اخبار قومی آواز (۸ دسمبر ۱۹۹۱) میں نظر سے گذرا۔ یہ ان کے دوست ڈاکٹر اسید عبدالباری کے قلم سے تھا۔ اس میں نہ کوئی واقعہ ہے اور نہ کوئی تجزیہ۔ پورا مضمون شعری اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر م نسیم صاحب بعض حالات کے نتیجہ میں لکھنؤ سے ایک امریکی شہر میں چلے گئے۔ اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

"زمانہ کی گردشوں نے انھیں اپنے محبوب شہر میں نہ رہنے دیا اور وہ اسلامی نشاۃ ثانیہ کی آرزو لیے ہوئے دیارِ فرنگ کی طرف چل دیے۔ ان کی شخصیت بکھر کر پورے کرۂ ارض پر پھیل گئی۔"

یہ شعری اسلوب موجودہ زمانہ میں تمام مسلم اہل قلم کے یہاں عام ہے۔ دورِ جدید کا تقریباً پورا اسلامی ادب اسی اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کوئی بھی مسلم مصنف نظر نہیں آتا جس نے اسلام کو وقت کے سائنٹفک اسلوب میں پیش کیا ہو۔ یہ شعری اسلوب جاگیرداری دور میں پیدا ہوا تھا۔ صحابہ کرام نے اسلام قبول کیا تو ان کے یہاں خود بخود جاہلی دور کے شاعرانہ اسلوب کا خاتمہ ہو گیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم مفکرین اور مصلحین کا حال یہ ہے کہ زمانہ کی انقلابی تبدیلیاں بھی انھیں اس پر مائل نہ کر سکیں کہ وہ زوال یافتہ دور کے شعری اسلوب کو ترک کر دیں۔

میں لکھنؤ میں تین سال رہا ہوں۔ اس کے علاوہ بار بار وہاں جانا ہوا ہے۔ اس لیے یہاں لکھنؤ کے جس حصہ سے بھی گزرا کچھ یادیں ذہن میں تازہ ہوگئیں۔ حضرت گنج کی طرف جانے والی سڑک پر ایک بہت بڑا مکان ہے۔ اس میں سید صدیق حسن، آئی سی ایس (وفات ستمبر ۱۹۹۳) رہا کرتے تھے۔ وہ ایک لائق افسر ہونے کے ساتھ نہایت شریف انسان تھے۔ ہندو اور مسلمان سب ان کی عزت کرتے تھے۔ ان کا ایک سبق آموز قصہ یہ ہے :

۱۹۳۳ کا واقعہ ہے۔ فتح گڑھ (اتر پردیش) کے علاقہ میں سکھوا نام کے ایک ڈاکو نے سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ پولیس کو خوف زدہ کرنے کے لیے پولیس کے افراد کو خاص طور پر وہ اپنی گولی کا نشانہ بناتا تھا۔ مگر اسی زمانہ میں ایک اعلیٰ انتظامی افسر اس کی دہشت گردی کی فہرست سے مستثنیٰ تھا۔ یہ سید صدیق حسن صاحب تھے۔ سکھوا ڈاکو نے گرفتاری کے بعد خود بتایا کہ وہ اکثر رات کے وقت صدیق حسن صاحب کے بنگلہ پر آتا تھا۔ مگر محض ان کی شرافت کا لحاظ کرتے ہوئے اس نے ان پر گولی نہیں چلائی۔

صدیق حسن صاحب اس زمانہ میں فتح گڑھ میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھے۔ سکھوا ڈاکو کی گرفتاری خود انھیں کی ایک مہم کے تحت عمل میں آئی۔ اور انھیں نے اس کے مقدمہ کی سماعت کر کے اس کو سزائے قید کا حکم سنایا۔

اس کے باوجود صدیق حسن صاحب کی وہ کیا خصوصیت تھی جس کی بنا پر سکھوا ڈاکو ان کی اتنی عزت کرتا تھا۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب وہ اس کو گرفتار کر کے اپنے بنگلہ پر لائے تو یہ سردی کا زمانہ تھا۔ سکھوا نے رات کے وقت ان سے کہا : جنٹ صاحب، آپ کا سکھوا سردی کھا رہا ہے۔ یہ سن کر صدیق حسن صاحب فوراً گھر کے اندر گئے۔ اپنی ایک نئی قمیص اور ایک موٹا کمبل لائے اور اس کو سکھوا ڈاکو کے حوالے کر دیا (الجمعیۃ ویکلی، امئی ۱۹۶۸)

۱۵ ستمبر ۱۹۶۳ کو میں ندوہ کے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی دعوت پر لکھنؤ پہنچا۔ یہاں ندوہ کی قدیم عمارت کے اوپر کے ایک کمرہ میں میرا قیام تھا۔ تقریباً تین سال تک یہاں میرا قیام رہا۔ اس زمانہ قیام کی بعض یادداشتیں یہاں قلم بند کی جاتی ہیں :

اسی زمانہ میں مولانا محمد تقی امینی (۱۹۹۱ — ۱۹۲۶) بھی یہاں مقیم تھے۔ ان کا کمرہ میرے کمرہ

سے قریب تھا۔ ان کے کمرے میں دو دروازے تھے۔ ایک روز انھوں نے پچھلے دروازہ کو اندر سے بولٹ کیا اور دوسرے دروازہ کو بند کر کے اس کا پیڈ لاک دبا دیا۔ بعد کو انھیں خیال آیا کہ تالے کی کنجی تو کمرے کے اندر رہ گئی۔ میرے لڑکے ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں آئے۔ انھوں نے ایک لمحہ تالہ والے دروازے کو دیکھا اور اس کے بعد جا کر دوسرے دروازے کو زور زور سے ہلانے لگے۔ بظاہر مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔ میں نے کہا کہ دروازہ تو سامنے کا بند ہوا ہے اور تم پچھلے دروازہ کے ساتھ زور آزمائی کر رہے ہو۔ وہ جواب دیے بغیر اس کو ہلاتے رہے۔ یہاں تک دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلنے کا سبب یہ تھا کہ اس کے اندر کا بولٹ ہل کر سیدھا ہوا اور پھر وہ کھسک کر پیچھے آگیا۔ اس طرح دروازہ کھل گیا۔ میں نے ظفر الاسلام خاں کو شاباشی دیتے ہوئے کہا کہ تم نے اپنے عمل سے زندگی کا ایک سبق دیا ہے۔ اس طرح تم نے مظاہرہ کی سطح پر بتایا ہے کہ دروازہ کہیں اور بند ہوتا ہے اور اس کو کھولنے کا راز کہیں اور موجود رہتا ہے۔

ابتدائی طور پر ندوہ کو ۱۸۹۲ میں مولانا محمد علی مونگیری نے قائم کیا تھا۔ تاہم جس شخص نے ندوہ کو ندوہ بنایا وہ مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اگرچہ ان کی زندگی ہی میں ندوہ میں ان کی اتنی مخالفت کی گئی کہ ان کو ندوہ چھوڑ دینا پڑا۔ شبلی کے اس فارسی شعر میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے :

از بہاں بزم کہ جز من دگرے راہ نداشت   یادم رفت کہ بہر دگراں جا باشد

کہا جاتا ہے کہ ندوہ کا مقصد یہ تھا کہ نئے حالات اور نئے زمانہ کے مطابق مسلم رہنما پیدا کیا جائے۔ مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے، اس پوری مدت میں ندوہ کوئی بھی ایسا رہنما پیدا نہ کر سکا۔ جدید دور کے رہبر پیدا کرنا تو بہت بڑی بات ہے، جدید تقاضوں کے مطابق کوئی ایک کتاب بھی اہل ندوہ تیار کر کے دنیا کو نہ دے۔ ان کی تمام مطبوعہ کتابیں تقلیدی نوعیت کی کتابیں ہیں نہ کہ جدید نوعیت کی۔ مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے ندوہ کے تعارف میں ایک مفصل مضمون قومی آواز ۱۹ جنوری ۱۹۹۲ میں شائع کیا تھا، اس کا ایک حصہ یہ تھا :

"مسلمانوں کا کوئی کام ایسا نہیں دیکھا گیا جس کی مخالفت خود مسلمانوں نے نہ کی ہو۔ ندوہ ابھی

ابتدائی دور میں ندوہ کی مخالفت کا بازار گرم ہوگیا۔ تمام علما کرام جن میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا محمد علی مونگیری، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید عبدالحئی جیسے آفتاب و ماہتاب پر کفر کا فتویٰ صادر ہوگیا۔ یہی نہیں بلکہ جو ان کو کافر نہ سمجھے وہ بھی کافر گردانا گیا۔ ندوہ کی مخالفت کے لیے چار رسالے جاری کیے گئے۔

مولانا عبداللہ عباس ندوی نے مزید لکھا ہے کہ ندوہ کے خلاف عوام میں خوب نفرت پھیلائی گئی۔ بڑے بڑے مدارس کے سفرا بمبئی اور کلکتہ جاتے تو لوگوں کو بتاتے کہ ندوہ ایک کالج ہے جہاں اتوار کو چھٹی ہوتی ہے اور انگریزی طرز رہائش ہے۔ اور یہاں کے پڑھے ہوئے لوگوں کو سوائے عربی اخبارات پڑھنے کے کچھ نہیں آتا۔ (قومی آواز ۱۹ جنوری ۱۹۹۲)

عجیب بات ہے کہ آج یہی اہل ندوہ الرسالہ کے دینی مشن کے خلاف خود بھی اسی قسم کا بے بنیاد طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ ۱۸۹۸ میں ندوہ قائم ہوا تو اس وقت کے قدامت پسندوں کو وہ "جدید" معلوم ہوا۔ اس کو دین سے انحراف سمجھ کر وہ اس کے مخالف بن گئے۔ آج اسی ندوہ کو الرسالہ مشن دوبارہ جدت اور انحراف کا کیس دکھائی دیتا ہے۔ حتیٰ کہ الرسالہ مشن کے رد میں اہل ندوہ کو دلائل نہیں ملے تو انھوں نے اس کے خلاف تنقیص، عیب جوئی اور الزام تراشی کی مہم شروع کر دی۔

قدامت پسند لوگ کسی نئی چیز کا استقبال ہمیشہ اسی طرح کیا کرتے ہیں۔ سو سال پہلے ندوہ "جدید" کے ہم معنی تھا، اس لیے قدامت پسند ذہن اس کے مخالف ہو گئے۔ اب خود ندوہ ایک قدیم ادارہ بن چکا ہے۔ اب خود وہ بھی وہی کر رہا ہے جو اس کے ساتھ سو سال پہلے کیا گیا تھا۔ موجودہ ندوہ صرف ان چیزوں کی اہمیت کو جانتا ہے جس پر سو سال کی مدت گزر چکی ہو۔ نیا فکر اور نیا اسلوب موجودہ ندوہ کے لیے اجنبی ہے۔ چنانچہ آج کے کسی جدید کا وہ خود بھی اسی طرح مخالف ہو جاتا ہے جس طرح سو سال پہلے اس کے جدید کی مخالفت کی گئی تھی۔

اس زمانہ میں افتخار اعظمی صاحب حضرت گنج پیلیس کے ایک مکان میں رہا کرتے تھے (۲ اپریل ۱۹۹۴ کو لندن میں ان کا انتقال ہوگیا) غالباً ۱۹۶۵ کی بات ہے، انھوں نے یہاں اپنے ایک ہندو دوست سے ملایا۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور مذہب میں یقین نہیں رکھتے تھے گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے کہا: محمد کو اگر تاریخ سے نکال لیا جائے تو تاریخ میں کیا کمی

ے قریب تھا۔ ان کے کمرے میں دو دروازے

ے بولٹ کیا اور دوسرے دروازہ کو بند کر کے

کرتالے کی کنجی تو کمرے کے اندر رہ گئی۔ میرے

لحہ تالے والے دروازے کو دیکھا اور اس کے بعد

گئے۔ بظاہر مجھے یہ بات عجیب معلوم ہوئی۔

پچھلے دروازہ کے ساتھ زور آزمائی کر رہے ہو۔

یہاں تک دروازہ کھل گیا۔

دروازہ کھلنے کا سبب یہ تھا کہ

کر پیچھے آگیا۔ اس طرح

تم نے اپنے

درواز

ندوہ

اتنی

حال کی

از

کے القوا

نشستیں

طے پایا کہ آیندہ

کی جائیں، اگر کسی فرقے کے نمایندوں

کہا جاتا ہے کہ

مگر جہاں تک

مضمون قومی آواز ۱۹ جون

مسلمانوں کا کوئی کام ایسا نہیں دیکھا گیا

ا[illegible] کا بازار گرم ہوا
مو[illegible] شبلی نعمانی اور
ہو[illegible] :
جاری کیے گئے

[illegible]	[illegible]	انسان اپنے آپ کو پہچان
[illegible]	[illegible]	[illegible] اسلام
[illegible]	[illegible] مسلم [illegible]	[illegible] چودھویں صدی میں
[illegible]	ہندی	[illegible]
[illegible]	[illegible] کی لاش	

رہ جائے گی میری زبان سے نکلا کر دہی کی جو محمدؐ سے پہلے تاریخ میں تھی۔

مذکورہ تعلیم یافتہ ہندو کے اس سوال نے میرے ذہن میں ایک مستقل ہیجان برپا کر دیا۔ اس کے بعد میں سیرت اور اسلام کا اسی خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے لگا۔ میرے اس مطالعہ کا نتیجہ دو کتابیں تھیں۔ پیغمبرِ انقلاب (۱۹۸۲) اور اسلام دورِ جدید کا خالق (۱۹۸۹) مذکورہ ہندو کا سوال بظاہر اشتعال انگیز تھا۔ اگر میں اس کو سن کر بگڑ جاتا تو میرے حصہ میں صرف یہ آتا کہ میں یہ کہتا پھروں کہ ہندو بہت متعصب ہوتے ہیں۔ ہندو اسلام دشمن ہیں، وغیرہ۔ مگر جب میں نے ان کے کلام کو مثبت ذہن کے ساتھ سنا تو وہ میرے لیے ایک طرف دو کتابوں کی تالیف کا سبب بن گیا اور دوسری طرف خود میری ذات کے لیے وہ اضافۂ ایمان کا ذریعہ ثابت ہوا۔

موجودہ صدی میں لکھنؤ مختلف پُرشور تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ مگر یہ تحریکیں حقائق سے زیادہ جذبات پر مبنی تھیں، چنانچہ تقریباً سب کی سب بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں۔ انھیں میں سے ایک وہ واقعہ ہے جس کو میثاق لکھنؤ (Lucknow Pact) کہا جاتا ہے۔

یہ واقعہ ۱۹۱۶ کا ہے۔ مسلم لیڈروں کو یہ خوف تھا کہ آزاد ہندستان میں ہندو اپنی عددی اکثریت کی بنا پر غالب حیثیت حاصل کر لیں گے۔ اس کے حل کے لیے، ۱۹۴۷ سے پہلے جو تدبیریں سوچی گئیں، ان میں سے ایک "میثاق لکھنؤ" تھا۔ لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے لیڈروں کی مشترک میٹنگ میں ایک سمجھوتہ ہوا۔ اس کی رو سے مسلمانوں کے مطالبہ کے مطابق، جداگانہ انتخاب کے اصول کو مان لیا گیا۔ اقلیت کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس کو اس کی آبادی سے کچھ زیادہ نشستیں دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اور اس کو ویٹج سسٹم (weightage system) کہا گیا۔ اس کے مطابق طے پایا کہ آیندہ جو قوانین صوبائی یا مرکزی اسمبلیوں میں پیش کیے جائیں یا جو اصلاحات ملک میں نافذ کی جائیں، اگر کسی فرقہ کے نمایندوں کی تین چوتھائی تعداد ان کے خلاف ہو تو وہ قوانین پاس نہیں کیے جائیں گے اور نہ ایسی اصلاحات کو قبول کیا جائے گا۔ مسلم لیگ کے لیڈروں کو شکایت ہے کہ کانگریس بعد کو اس معاہدہ سے پھر گئی اور اس طرح اس نے ملک کی تقسیم کے اسباب پیدا کیے۔

مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس لفظی معاہدہ کو کانگرس یا ہندو نے نہیں بلکہ حقائق کے زور نے ختم کیا۔ اسی قسم کا ایک لفظی معاہدہ وہ تھا جو خود پاکستان میں محمد ایوب خاں اور حسین سہروردی نے

ل کر لیا گیا تھا۔ اس کے مطابق، مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) اور مغربی پاکستان کے درمیان برابری (parity) کا اصول مقرر کیا گیا تھا۔ یعنی مشرقی پاکستان کی آبادی اگرچہ پاکستان کی مجموعی آبادی کا ۵۵ فی صد ہے، مگر اسمبلی میں دونوں حصوں کی نشستیں ۵۰۔۵۰ فی صد رہیں گی۔ یہ فیصلہ بھی "میثاق لکھنؤ" کی طرح غیر حقیقی تھا۔ چنانچہ ۱۹۷۱ کے طوفان میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اگر میں یہ کہوں کہ میرے نئے تحریری دور کا باضابطہ آغاز لکھنؤ سے ہوا تو یہ غلط نہ ہوگا۔ مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد میں زیادہ تر ادبی مضامین لکھا کرتا تھا۔ کئی سال کے لمبے دور کے بعد مجھے خیال ہوا کہ جدید فکری چیلنج کو مجھے اپنا موضوع بنانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں میں نے جو مطالعہ شروع کیا اس کا پہلا نتیجہ وہ مضمون تھا جو "نئے عہد کے دروازہ پر" کے نام سے پمفلٹ کی صورت میں چھپ چکا ہے۔ اس مقالہ کو ابتداءً میں نے ۲۸ فروری ۱۹۵۵ کو لکھنؤ کے ایک اجتماع میں پیش کیا تھا جو امین آباد میں جماعت اسلامی ہند کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس مقالہ کو پیشگی طور پر غالباً ایک ہزار کی تعداد میں چھپوا لیا گیا تھا۔ جب میں اس کو پڑھ چکا تو اسٹیج کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ یہ مقالہ یہاں اسٹال پر برائے فروخت موجود ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اس اعلان کو سن کر لوگ اسٹال پر ٹوٹ پڑے۔ مقالہ ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوا اور اسی وقت اس کی ساری کاپیاں ختم ہو گئیں۔

۲ مارچ ۱۹۹۲ کو لکھنؤ سے واپسی تھی۔ پہلے ہم لوگ الجمعیۃ الخیریہ لمساعدۃ الطلاب (اسٹوڈنٹس اسلامک ویلفیر سوسائٹی) کا دفتر (راجہ جی پورم) دیکھنے کے لیے گئے۔ یہاں کچھ تعلیم یافتہ افراد جمع ہو گئے تھے۔ ان سے دینی اور ملی موضوع پر گفتگو ہوئی۔ تنظیم کے صدر نے اس کے مقاصد اور پروگرام کی مختصر تشریح کی۔ یہ ایک خوبصورت دفتر ہے جو خوبصورت ماحول میں بنایا گیا ہے۔

یہاں سے فراغت کے بعد ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوا۔ روانگی میں کسی قدر تاخیر ہو گئی۔ درمیان میں ریلوے کراسنگ پر مزید تاخیر ہوئی۔ ایرپورٹ پہنچا تو کاونٹر پر یہ جواب ملا کہ وقت ختم ہو گیا۔ ہم مسافروں کی فہرست تیار کر کے بھیج چکے ہیں اور اب بورڈنگ کارڈ دینے سے معذور ہیں۔ اس کے بعد ہمارے ایک ساتھی جناب نثر جلیل صاحب اندر گئے اور افسر سے کہا۔ اس نے فوراً وائرلیس کے ذریعہ جہاز سے رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے جواب

ملاکر بیج دیجیے۔ چنانچہ انھوں نے مجھ کو بورڈنگ دے دیا اور میں ...
کے اندر داخل ہو گیا۔ فلائٹ نمبر ۸۱۶ کے ذریعہ دہلی پہنچا۔

بظاہر خواہ کتنا ہی مایوسی کی صورت حال ہو۔ آدمی کو اپنی امید ختم نہیں کرنا چاہیے اا
کوشش کو جاری رکھنا چاہیے۔ عین ممکن ہے کہ مایوسی کی آخری حد پر پہنچ کر بھی آدمی
لیے امید کا وسیع دروازہ کھل جائے۔

جہاز کے اندر اعلانات شروع ہوئے: ایک اعلان ہوا تو اس کے الفاظ مجھے اس
سنائی دیے:

Captain Islam is in command.

ایک لمحہ کے لیے احساس ہوا کہ "اسلام" نے اچانک ظاہر ہو کر دوبارہ وقت کی زمام کار سنبھ
ہے۔ مگر جب دوبارہ اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ اناؤنسر نے کیپٹن اسلام نہیں کہا تھا کہ بلکہ
او سوال کہا تھا۔ میں نے سوچا کہ "مسٹر اسلام" کو کمانڈنگ حیثیت میں لانا کوئی اعلان کا معا
نہیں، یہ تاریخی عوامل میں انقلابی تبدیلیاں لانے کا معاملہ ہے۔ جب تک تاریخ میں تبد
پیدا نہ ہو اس وقت تک قیادت میں تبدیلی پیدا ہونے کا بھی کوئی امکان نہیں۔

دہلی پہنچ کر شہر کے لیے روانہ ہوا۔ ایک مقام پر لال بتی کی بنا پر گاڑی رکی۔ د
سڑک کے کنارے لکھا ہوا تھا ——— اسٹاپ لائن کو پار نہ کیجیے:

do not cross stop line.

یہ صرف سڑک کا اصول نہیں بلکہ پوری زندگی کا اصول ہے۔ زندگی کے سفر میں جب گ
"اسٹاپ لائن" ہوتی ہے، اس اسٹاپ لائن پر رکنا ضروری ہے۔ جو آدمی ایسا نہ کر
اس کا انجام تباہی کے سوا اور کچھ نہیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

اُردو		مطالعۂ سیرت	9/-	حیات طیبہ			
تذکیر القرآن جلد اول	200/-	ڈائری جلد اول	-	باغ جنت			
تذکیر القرآن جلد دوم	200/-	کتاب زندگی	40/-	نار جہنم			
اللہ اکبر	45/-	انوار حکمت	-	خلیج ڈائری			
پیغمبر انقلاب	40/-	اقوال حکمت	20/-	رہنمائے حیات			
مذہب اور جدید چیلنج	45/-	تعمیر کی طرف	8/-	مضامین اسلام			
عظمت قرآن	30/-	تبلیغی تحریک	20/-	تعدد ازواج			
عظمت اسلام	50/-	تجدید دین	20/-	ہندستانی مسلمان			
عظمت صحابہ	7/-	عقلیات اسلام	30/-	روشن مستقبل			
دین کامل	50/-	مذہب اور سائنس	-	صوم رمضان			
الاسلام	40/-	قرآن کا مطلوب انسان	8/-	علم کلام			
ظہور اسلام	40/-	دین کیا ہے	8/-	اسلام کا تعارف			
اسلامی زندگی	25/-	اسلام دین فطرت	7/-	علماء اور دور جدید			
احیاء اسلام	20/-	تعمیر ملت	6/-	سیرت رسولؐ			
راز حیات	50/-	تاریخ کا سبق	7/-	ہندستان آزادی کے بعد			
صراط مستقیم	40/-	فسادات کا مسئلہ	5/-	مارکسزم تاریخ جس کو	8/-	[illegible]	
خاتون اسلام	50/-	انسان اپنے آپ کو پہچان	5/-	رد کر چکی ہے		حقیقت نماز	
سوشلزم اور اسلام	40/	تعارف اسلام	5/-	سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	7/-	حقیقت روزہ	25/-
اسلام اور عصر حاضر	30/-	اسلام پندرھویں صدی میں	5/-	الاسلام یتحدی	85/-	حقیقت زکوٰۃ	25/-
الربانیہ	40/-	راہیں بند نہیں	7/-	**ھندی**	-	حقیقت حج	25/-
کاروان ملت	45/-	ایمانی طاقت	7/-	سچائی کی تلاش	8/-	سنت رسولؐ	25/-
حقیقت حج	30/-	اتحاد ملت	7/-	انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-	میدان عمل	25/-
اسلامی تعلیمات	25/-	سبق آموز واقعات	7/-	پیغمبر اسلام	4/-	پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	25/-	زلزلۂ قیامت	10/-	سچائی کی کھوج	-	اسلامی دعوت کے	25/-
حدیث رسولؐ	25/-	حقیقت کی تلاش	7/-	آخری سفر	8/-	جدید امکانات	
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)	85/-	پیغمبر اسلام	5/-	اسلام کا پریچے	8/-	اسلامی اخلاق	25/-
سفرنامہ (ملکی اسفار)		آخری سفر	7/-	پیغمبر اسلام کے جیون ساتھی	8/-	اتحاد ملت	25/-
میوات کا سفر	35/-	اسلامی دعوت	7/-	راستے بند نہیں	7/-	تعمیر ملت	25/-
قیادت نامہ	20/	خدا اور انسان	7/-	جنت کا باغ	8/-	نصیحت لقمان	25/-
راہ عمل	25/-	حل یہاں ہے	10/-	بہو پتنی واد اور اسلام	3/-	**ویڈیو کیسٹ**	
تعبیر کی غلطی	60/-	سچا راستہ	5/-	اتہاس کا سبق	9/-	حقیقت روزہ	150/-
دین کی سیاسی تعبیر	20/-	دینی تعلیم	7/-	اسلام ایک سوابھاوک مذہب			

AL-RISAL BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi 110 013, Tel 4611128, Fax 4697333